

پاک فوج سے فرار ہونے والے
اولین بنگالی افسر
میجر شریف الحق دالیم کے
چونکا دینے والے انکشافات

عبدالملک مجاہد
دارالسلام پبلشرز کے بانی
ایک کیلی گرافر کی حیرت افزا داستان

Rs:90

اردو ڈائجسٹ

f /urdudigest.pk

پاک سوسائٹی
ڈاکٹر کا

19 ارب ڈالر کا مالک اور
amazon کا چیف ایگزیکٹو
JEFF BEZOS
نمبر 1 کیسے بنا؟



www.paksociety.com

اللہ کا قرآن

نیک لوگوں کی موت

اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مر سکتا۔ وقت مقرر لکھا ہوا ہے۔ جو شخص دنیا میں بدلہ چاہے گا اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں ثواب کا طالب ہو اس کو وہاں عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو صلہ دیں گے۔ (آل عمران: ۱۴۵)

بد اعمال لوگوں کی موت

پھر کیسا حال ہوگا جب فرشتے ان کی جان نکالیں گے اور ان کے منہ اور پیٹھ پر مارتے جاتے ہوں گے O یہ اس لیے کہ وہ اس راہ چلے جس سے اللہ ناخوش ہے اور اس کی رضا کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا O (محمد: ۲۷-۲۸-۲۹)

رسول کا فرمان

جنت میں بغیر حساب کتاب داخل ہونے والے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا ”میرے سامنے امتیں پیش کی گئیں۔ مجھے بتایا گیا آپ کی امت میں ۷۰ ہزار ایسے ہیں جو بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ (صحیح بخاری کتاب ۷۶- باب ۴۲: مسلم کتاب الایمان- باب ۹۲)

بیعت میں اقرار۔ اطاعت الہی۔ دوسروں کی بھلائی چاہنا

حضرت جریر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی ”احکام الہی کو سنوں گا اور اطاعت کروں گا اور ہر مسلمان کی بھلائی چاہوں گا۔“ تو آپ ﷺ نے مجھے تلقین فرمائی تھی کہ کہو ”جس قدر میری بساط میں ہوگا۔“ (صحیح بخاری کتاب ۹۳- باب ۴۳: مسلم کتاب الایمان- باب ۲۱)



پاک فوج سے فرار ہونے والے اولین بنگالی افسر
اور بنگلہ دیش میں بہادری اور شجاعت کا
سب سے اعلیٰ اعزاز ”بیراٹم“ پانے والے

ميجر شريف الحق داليم

کا کسی پاکستانی ایڈیٹر کو دیا گیا پہلا چشم کشا انٹرویو

49

مشرقی پاکستان سے بلوچستان تک

248

(سید عاصم محمود)

شکست آرزو (پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین)

26

چنانچہ لوگوں کو تازہ اور صحیح معلومات درکار ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر برے واقعہ کے دوران اور بعد وہ اپنے لیڈرز اپنے ساتھ کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیڈر کو مستقبل کے لیڈرز بھی تیار کرنے ہوتے ہیں تاکہ آنے والے دنوں میں وہ نئی ٹیکنالوجی کے استعمال، بہتر انداز اور ٹیم ورک کے ذریعے ملک کو ترقی دلا سکیں۔ نوجوانوں کو مستقبل کے لیے تیار کرنا بہت اہم ہے۔ ہم لیڈر شپ کو ایک ذمے داری سمجھتے ہیں۔ ایک اچھا لیڈر ایک اچھا سامع ہونے کے ساتھ ساتھ کامیابی کی لگن اور اپنے لوگوں کا خیال رکھنے کے ہنر میں طاق ہوتا ہے۔ ایک لیڈر میں تبدیلی لانے کی جرات اور تبدیلی کا استعارہ ہونا چاہیے۔ کسی بھی صحیح جگہ پر بروقت پہنچ جانا قطعاً کامیابی کی گارنٹی نہیں ہوتا۔ مشاہدہ کرنا، سننا، لائحہ عمل بدلنا، بہتر وسائل اکٹھے کرنا، اپنے آپ کو اور لوگوں کو تیار کرنا تاکہ شکست یا نقصان کا رسک کم ہو سکے آپ کی ذمے داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ رہبری یا رہنمائی ایک کل وقتی ذمے داری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اچھے وقتوں میں ”لیڈری“ کریں لیکن پھر آسانی سے غائب ہو جائیں۔ رہنمائی حاصل کرنا بہت اہم ہے جس طرح ہر کامیاب کھلاڑی کو ایک کوچ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح لیڈر بننے کے لیے بھی ایک رہنما اور گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو ہر چیز کا اچھی طرح علم نہیں ہوتا لہذا علم اور آگاہی حاصل کرتے رہنا ہوتا ہے۔

آخری بات..... اب لیڈر شپ کسی ایک فرد کی بس کی بات نہیں رہی۔ گروپ لیڈر شپ یا ٹیم لیڈر شپ ہی گیم چیمپئن بن کر سامنے آتی ہے۔ مختلف صلاحیتوں، کلچر اور عمر کے لوگوں پر مشتمل گروپ آج کے پیچیدہ مسائل کے حل پیش کر کے ملک کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہم صرف سیاسی محاذ پر ہی لیڈر کے متلاشی



طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

منیجنگ ایڈیٹر نوٹ

لیڈر کی تلاش

پوری قوم خصوصاً نوجوان نسل آج کل ایک لیڈر کی تلاش میں ہے۔ کوئی نواز شریف کو نجات دہندہ سمجھتا ہے تو کسی کو عمران خان کی شکل میں سچا نظر آتا ہے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد ابھی تک گوگو کی کیفیت میں ہے۔ یہ وقت ”بھوموں“ کے لیے نہیں ہے بلکہ آج پوری دنیا میں لیڈرز کی صلاحیتوں کو جانچا جا رہا ہے اور آنے والے دنوں میں مزید سختی سے ٹیسٹ کیا جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ آج Stakes چاہے وہ فنانشل ہوں یا معاشرتی کبھی بھی اتنے بلند نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ لیڈر کیسا ہونا چاہیے اور اس میں کون کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں؟

دنیا بھر کے کامیاب لیڈرز ایک موثر لیڈر کی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کریڈیٹلٹی لیڈر شپ کے لیے ناگزیر ہے اور یہ حاصل ہوتی ہے لیڈر کی اپنی مثال سے اور جس میں لیڈر اپنے رول کے بارے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی اختیار کرتا ہے۔ ایک لیڈر کے ارد گرد کے لوگ بھی اچھے لیڈر ہونے چاہئیں۔ لیڈر کا ایک اچھا مقرر ہونا بہت ضروری ہے۔ اس میں لوگوں کو اپنی بات پر قائل کرنے کا ملکہ ہونا چاہیے۔ لیڈر کو نہ صرف اپنے لوگوں سے ابلاغ کا ہنر آنا چاہیے بلکہ بیرونی دنیا کے سامنے اپنے ایجنڈے اور ویژن کو ان کے اسٹائل میں غیر مبہم انداز میں پیش کرنا بھی آنا چاہیے۔ لیڈر کا لچک دار ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ آج کل حالات تیزی سے بدل رہے ہوتے ہیں لہذا آپ کو تیار رہنا ہوتا ہے نئی صورت حال کا سامنا کرنے، نئے مواقع اور بدلتی ہوئی ترجیحات کا۔ تاہم نئے فیصلے کرتے ہوئے تبدیلیاں لانا اور وہ بھی مختصر وقت میں ایک مشکل چیلنج ہوتا ہے۔ اسی لیے تبدیلی کو پہلے سے جاننا اور تیزی سے اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا کامیابی کا اہم جزو ہے۔ اگر آپ کے ارد گرد ایک خوف زدہ لیکن باشعور ورک فورس اکٹھی ہو چکی ہے تو جان لیجیے آپ کے لیے ایک بڑا چیلنج تیار ہے۔ اس طرح کی پوزیشن میں تبدیلی بہت دشوار ہوتی ہے۔ کرائسز کی صورت حال میں عام طور پر ہر طرح کی افواہیں اور اندازے تیزی سے گردش کرتے ہیں

اردو ڈائجسٹ
www.urdu-digest.pk
دسمبر ۲۰۱۲ء محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
جلد نمبر ۵۲ شمارہ ۱۲

صدر مجلس
شہیرا علی
منیجنگ ایڈیٹر
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
طاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر
اختر عباس
مجلس تحریر
حافظ افروغ حسن، سید عاصم محمود، صغیرہ بانو شیریں
نویدا اسلام صدیقی، سہلی اعوان، اظہر بن مظہر
مہتمم طباعت
فاروق اعجاز قریشی
ڈیزائنر عبدالوہاب
سب ایڈیٹر ویب
عاطف مرزا

مارکیٹنگ/اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

قانونی کٹر مارکیٹنگ
ذکی اعجاز قریشی
0300-8460093
مینجر ایڈیٹر قانونی
احمد فیاض
0322-7474010
لاہور
ندیم حامد
0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ
احسان اللہ بٹ
0300-9620294

سالانہ خریداری
خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے
subscription@urdu-digest.com
فون: +92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ کم قیمت سے حاصل کیجیے
پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
330 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت: 90 روپے
طابع ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پبشرز 24 سرکل روڈ
سے چھپوا کر 19-21 ایکڑ سکیم من آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

سرورق پر

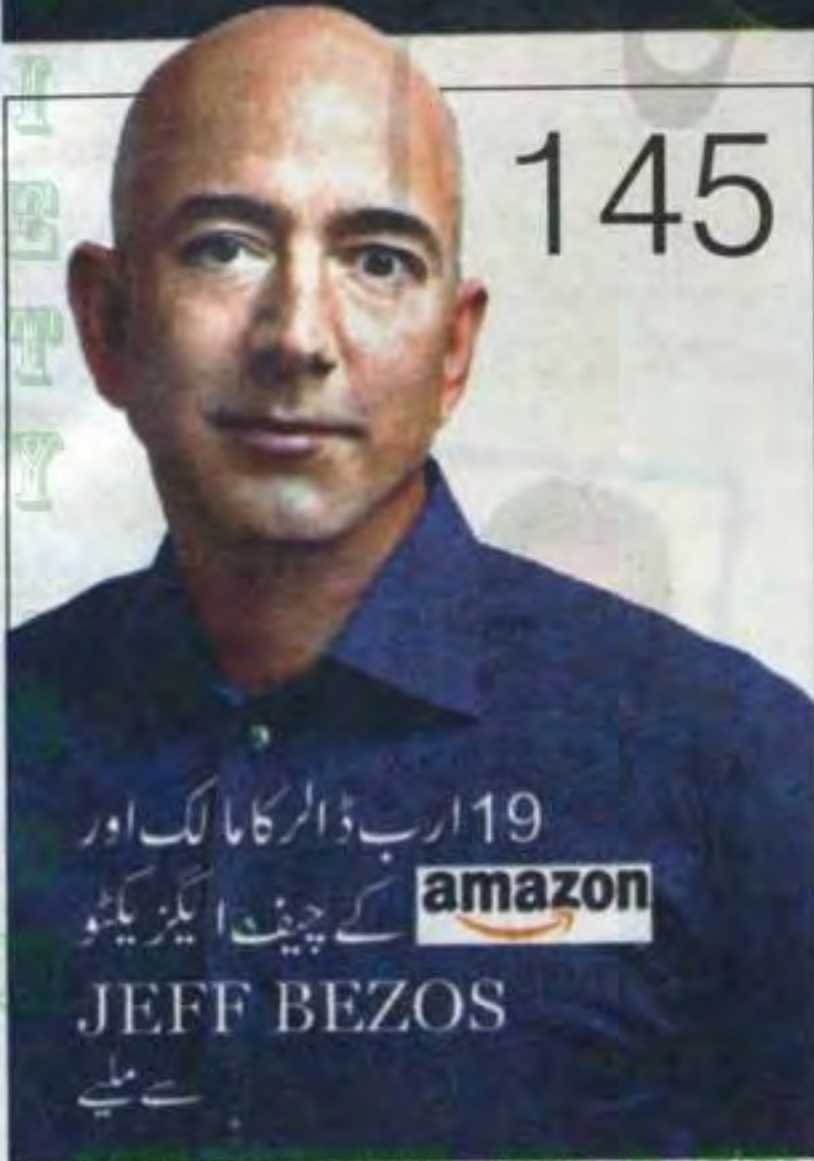


انرجی ڈرائنگ

وقت کی پیامبر

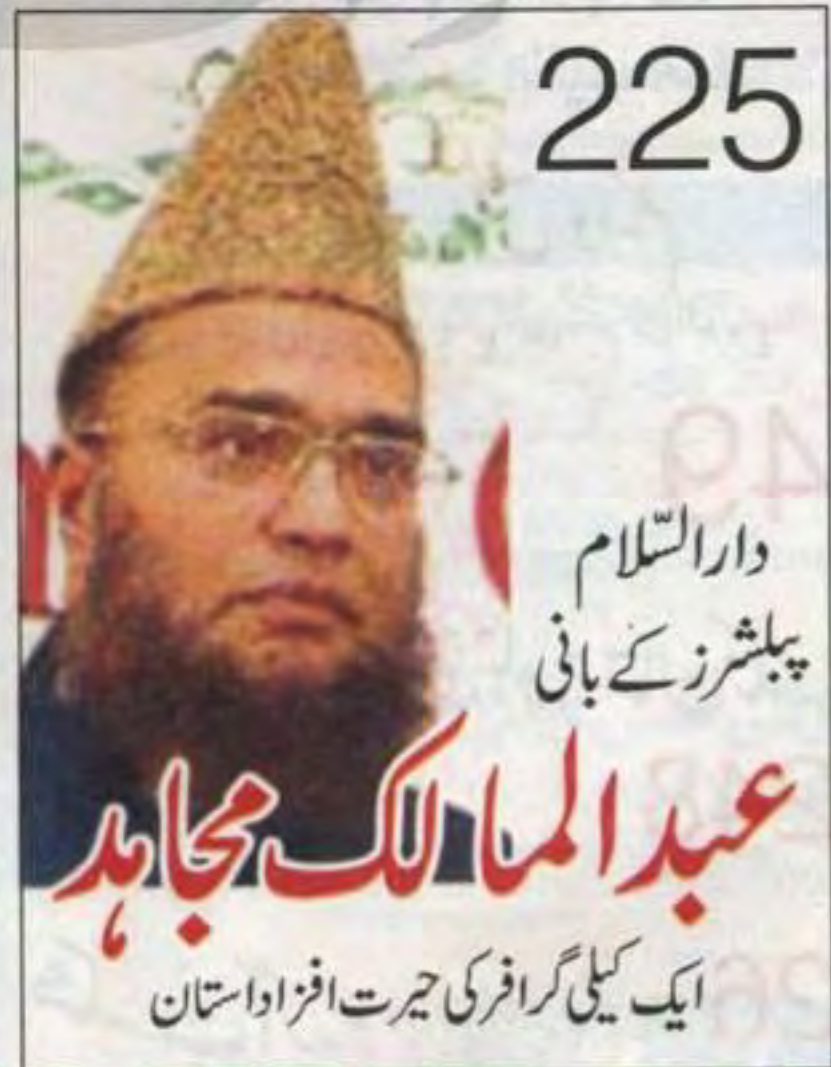
65

ہمارے ہاں انرجی ڈرائنگ
کی خرید و فروخت میں
سات سو گنا اضافہ کیا رہا ہے گا؟



145

19 ارب ڈالر کا مالک اور
amazon کے چیف ایگزیکٹو
JEFF BEZOS



225

دارالسلام
پبلشرز کے بانی

عبدالملک مجاہد

ایک کیلی گرافر کی حیرت افزا داستان

اسلامی گوشہ

33 قربانی حسین کی

38 سناٹے دل پر چھائی ادا سی کی وجہ

42 نئی حضرت عباس کا قصہ دل پذیر

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی

ماہ نور فیصل

جمیل یوسف

حسین احمد شیرازی

عاصم محمود

رفیدہ کلیم فاروقی

تحریم حنا صدیقی

جاوید چودھری

قیصر جاوید

انعام الحق مرزا

ارشاد لاشاری

خدیجہ نین تارا

ڈاکٹر منصور احمد باوجودہ

رخسانہ بشیر

ڈاکٹر اصغر علی

عاطف مرزا

سلیم کوثر

غلام سجاد

صفیرہ بانو شیریں

محمد خلیل چودھری

نویہ اسلام صدیقی

وصی شاہ

نوشین ناز

آپکے مشورے شکایات

ادارہ

اختر عباس

کچھ اپنی زبان میں

ہم کہاں کھڑے ہیں

یاران وطن دیار غیر میں

باتیں حقیقت جانندھری کی

بابونگری کاروباری بابو (طنز مزاح)

۲۰۱۲ء کی طبی ایجادات

باتیں دانش کی

ہم کسی سے کم نہیں

کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت

کیا صرف پیسا کماتا کامیابی ہے

رشین ثانی کی کہانی

نتھے بنے امریکی جاسوس

پریشانی کیسے ختم ہوتی ہے

عمر میری بھی مگر (طنز مزاح)

شکر گزار بنیے

کمر درد سے کیسے بچیں

۲۰۵۰ء کیسا ہوگا

حوالہ میری پسند کا (پسندیدہ شاعر اور کلام)

۱۰ موجودوں کی دوران ایجاد موت

مشورہ حاضر ہے

ماہ رواں کی شخصیات

کتابوں کی کہکشاں

موضوع سخن (اسی لیے گردنیں کٹ رہی ہیں)

وزن کم کریں صحت نہیں (مقبول کالم)

چمن خیال

قصہ گوئز

درد دل پہ دستک (مستقل کالم)

14
17
81
85
91
113
121
123
135
139
150
153
157
210
214
220
235
241
245
257
260
265
271
273
277
282
284

قائد اعظم کی خوبیاں

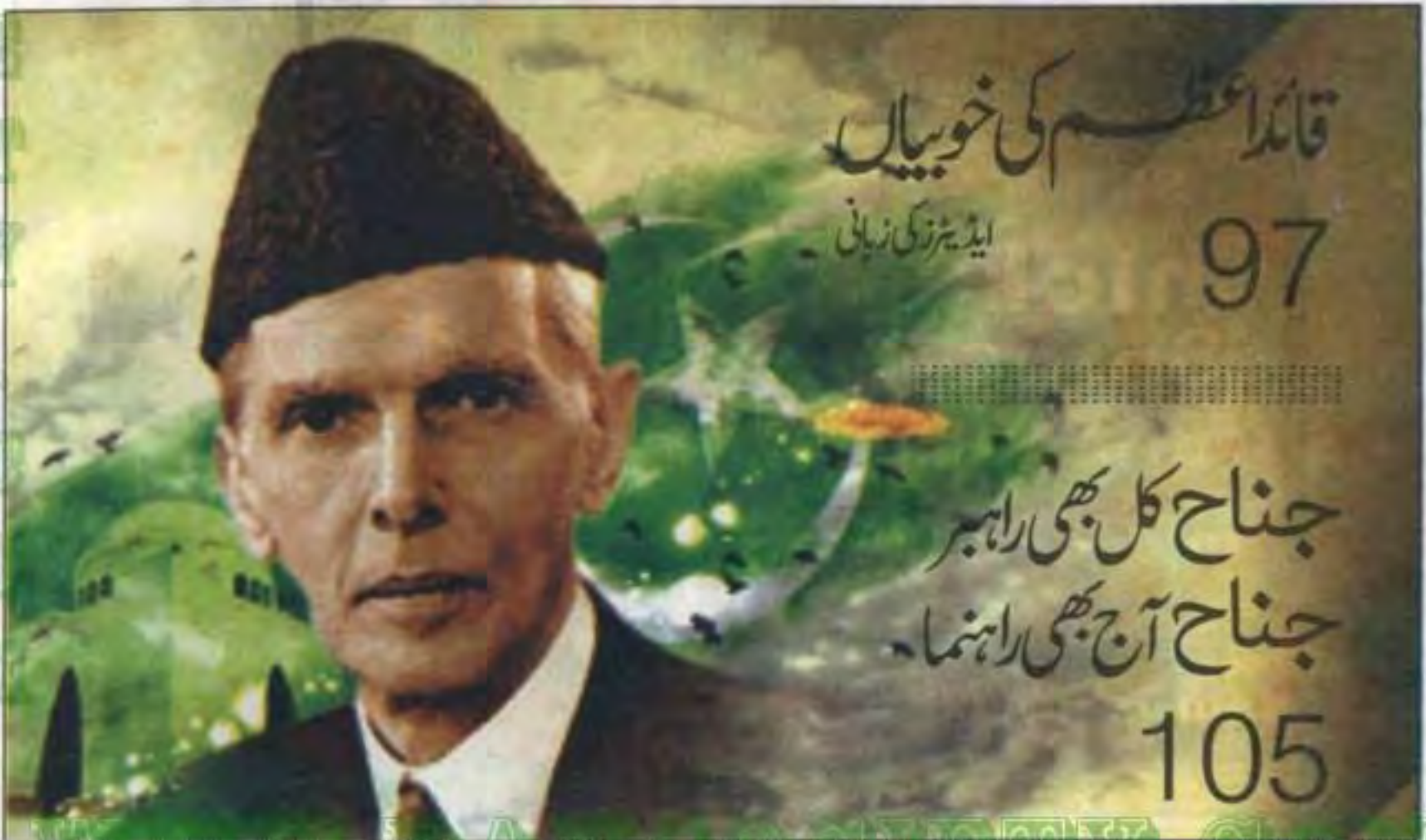
ایڈیٹرز کی زبان

97

جناح کل بھی راہبر

جناح آج بھی راہنما

105



فہرست

سانحہ مشرقی پاکستان کی تحقیقات کے لیے قائم

حمود الرحمن کمیشن



253

رپورٹ 29 سال تک کیوں منظر عام پر نہ آ سکی؟

کہانیاں

دام دام (امریکی کہانی)	171
نظامو (سندھی کہانی)	179
اللہ کے بھید وہی جانے	183
پہلا گواہ	187
روز	193
بکرے کی ران	201
شناخت	207
ازائیل آسندے	
علی بابا	
نوید اسلام صدیقی	
توقیر عائشہ	
حسن رزاقی	
انجم فاروق ساحلی	
غلام سکینہ شیخ	



161



عوام پر حرف زنی

ہمیں

آئے دن اس ایک جملے سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہمارے عوام ہی بہت ساری خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ وہ کام چور، خائن اور گھٹیا کردار کے حامل ہیں۔ دودھ بیچنے والا پانی ملاتا اور عام دکاندار پھلوں اور سبزیوں کی دگنی اور تین گنی قیمت وصول کرتا ہے۔ عام شہری قطار بنانے اور قطار میں کھڑا رہنے کا عادی نہیں۔ جھوٹ بولنا اور دوسروں کو دھوکا دینا اس کی سرشت کا حصہ بن چکے۔ ٹریفک کے قوانین توڑنے میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر ووٹر دیانت دار اور قانون کے پابند امیدواروں کے مقابلے میں بدکرداروں، بد معاشوں، ملکی وسائل لوٹنے والوں کو ترجیح دیتے اور اس گروہ کو اپنے اوپر مسلط کر دینے کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ بے ایمانی اور قانون شکنی عام آدمی کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ برائیوں کی طرف مائل اور نیکیوں سے بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر ڈسپلن اور وقت کی پابندی ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اسے معاشرتی ذمے داریوں کا ذرا پاس نہیں۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت اسلام کی حقیقی روح سے نابلد اور اپنے شہری فرائض سے بالعموم بے بہرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ بڑی تیزی سے روبہ زوال ہے اور قومی شیرازہ بکھرتا جا رہا ہے۔

بادی النظر میں یہ تمام باتیں درست معلوم ہوتی ہیں لیکن گہرائی کے ساتھ ان کا تجزیہ کرنے سے اصل حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ عوام کی کردار سازی ان کی قیادت اور قومی ادارے کرتے اور اس کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ نے دیانت، امانت اور صداقت کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ وہ اپنی سیرت و کردار میں قرآن حکیم کی زندہ و جاوید تعبیر تھے۔ آج کے ترقی یافتہ جمہوری معاشروں میں حکمران اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کرتے اور خود قطار میں کھڑے ہو کر مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہاں ارباب اقتدار اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون ہے اور احتساب کا نظام سب کے لیے یکساں ہے۔ وہاں ریاست کی پوری مشینری دیانت داری، صاف گوئی اور فرض شناسی کو فروغ دیتی اور ہر قسم کی ملاوٹ کے تصور کی جڑ کاٹی رہتی ہے۔ وہاں اخلاقی تربیت کا یہ ثمرہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ جھوٹ بولنے کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا جبکہ ہمارے ہاں جھوٹ، فریب، دغا بازی اور ہر نوع کی خرابی کے منبع ہیں۔

عوام کو تربیت کا سچا شعور دینے کے لیے فکری، عملی، سیاسی اور تہذیبی قیادت کی صحت مندانہ خطوط پر نشوونما

حد درجہ ضروری ہے۔

الطاف حسن قسری

ہم کہاں کھڑے ہیں



الطاف حسن قریشی کے قتل سے

قومی شیرازہ بندی کے طاقتور عناصر

ایک تاریخی تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قتل سے

تاریخ

کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں کی یک جہتی میں مختلف عوامل کارفرما رہے۔
عمرانیات کے جدید مفکر علامہ ابن خلدون کے مطابق ”عصبیت“ قوموں اور
تہذیبوں کے عروج و زوال میں بنیادی کردار ادا کرتی آئی ہے۔ اٹھارویں اور
انیسویں صدی میں تصورات کی بنیاد پر عظیم انقلابات بھی آئے اور قومی ریاست
(Nation State) کے نظریے کو بہت فروغ حاصل ہوا اور قومی ریاستیں قائم ہوتی گئیں جن میں کلچر،
عقیدہ اور جغرافیائی وحدت بنیادی حیثیت کے حامل تھے۔ بیسویں صدی میں پاکستان مسلم قومیت کی بنیاد پر

وجود میں آیا۔ برصغیر ہند جس پر مسلمانوں نے ۸۰۰ سال سے زائد عرصہ حکومت کی تھی، وہ برطانوی استعمار کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۹۰ برس تک غلامی کا طوق پہنے رکھا۔ برہمن قیادت نے انہیں سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق سے محروم کرنے اور ان سے ۸۰۰ سالہ غلامی کا بدلہ چکانے کے لیے انگریزوں سے ساز باز کر لی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے اس دور ابتلا میں جلیل القدر مصلح، علماء، محقق اور علامہ اقبال اور قائد اعظم جیسے نابغہ روزگار مفکر اور مدبر پیدا ہوئے جنہوں نے مسلم سوسائٹی میں عظمت رفتہ کی بازیابی کی جوت جگائی اور آئینی جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کی منزل سے ہمکنار کیا۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں علمائے حق، مجاہدین، سیاسی زعماء اور بے باک صحافی پیش پیش رہے جنہوں نے برطانوی استعمار کی ہیبت اور ہندوؤں کی عیاری کے بت پاش پاش کر دیے تھے۔ ریشمی رومال، ہجرت اور خلافت کی تحریکوں، احرار اور خاکسار کی تنظیموں اور جماعت اسلامی کی فکری کاوشوں نے مسلمانوں کا دینی اور سیاسی شعور بلند کرنے میں زبردست حصہ لیا۔ اسی ابھرتے شعور کو آل انڈیا مسلم لیگ نے آگے چل کر تحریک پاکستان کے قالب میں ڈھال دیا۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر کے مسلمان ایک ناقابل تسخیر سیاسی قوت بن گئے تھے اور انگریزوں اور ہندوؤں کو ان کے علیحدہ وطن کا قومی مطالبہ تسلیم کرنا پڑا تھا۔ آئینی جدوجہد کے ذریعے پاکستان کا حصول اس عظیم سیاسی جماعت کا ایک درخشندہ اور لافانی کارنامہ تھا، لیکن تحریک سے ایک مستحکم سیاسی جماعت کی طرف سفر کے دوران کچھ ایسے مشکل مقام آئے جن سے پاکستان کا سیاسی وجود خطرات سے دوچار ہوتا گیا اور مشرقی پاکستان دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہم سے جدا ہو گیا۔ یہ بیسویں صدی کا بدترین سیاسی سانحہ اور ہماری قیادتوں کی غفلت، خود غرضی اور کوتاہ بینی کے لیے شدید ترین تازیانہ تھا۔

☆☆☆

اس بدترین تاریخی حادثے کے اسباب میں جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تہذیبی عوامل کے علاوہ سیاسی جماعتوں کا کردار سب سے اہم رہا جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کو ایک ساتھ رکھنے میں ناکام رہی تھیں۔ وہ مسلم لیگ جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا تھا، وہ حصول آزادی کے چند ہی سال بعد دھڑوں میں بٹ گئی۔ ری پبلکن پارٹی نے راتوں رات اسی کے بطن سے جنم لیا تھا۔ مشرقی بنگال میں ۱۹۵۴ء کے انتخابات مسلم لیگ کی عبرت ناک شکست پر منبج ہوئے۔ اس شکست سے ہمارے قومی وجود کو اس اعتبار سے بڑا دھچکا لگا کہ وہ مسلم لیگ جس کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ہی میں رکھی گئی تھی اور سب سے بڑے مسلم اکثریتی صوبے کے وزیر اعظم فضل الحق نے منٹو پارک لاہور میں ۱۹۴۰ء کے تاریخ ساز اجلاس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی قرارداد پیش کی تھی، اسی صوبے میں مسلم لیگ آزادی کے ابتدائی ۷ برسوں ہی میں عوام کی حمایت اور اقتدار سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کا بڑا

سبب اس کے حکمرانوں کا غیر جمہوری طرز حکمرانی تھا۔ وزیر اعلیٰ نور الامین ایک طالب علم کے ہاتھوں اس لیے شکست کھا گئے کہ وہ عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتے اور عوام کے بنیادی مسائل سے آنکھیں چراتے تھے۔ وہ ۱۰ نشستوں پر ضمنی انتخابات جیلے بہانوں سے ٹالتے اور مخالفین کو طاقت سے دبانے کی پالیسی پر گامزن رہے۔ اس روش کے خلاف ۱۹۵۴ء میں سیاسی بغاوت ہوئی جس نے ملکی شیرازہ نکھیرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

۱۹۵۴ء کے بطن سے جنم لینے والے واقعات نے سیاسی جماعتوں کی قوت اور ان کے باہمی رشتوں پر کاری ضرب لگائی اور خوفناک فتنوں کو ہوا دی۔ یہی وہ سال تھا جب محلاتی سازشوں کے ذریعے چشم زدن میں ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی اور اقتدار کا ایک ڈراؤنا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ وہ عناصر حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہو گئے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر کے اس امر کی سرٹوڑ کوشش کی تھی کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل نہ ہونے پائے۔ اسی سال اسمبلیشنٹ کو پہلی دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینے، ایمر جنسی نافذ کرنے اور ٹیلنٹڈ (Talented) کابینہ بنانے کا موقع ملا جس میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں وزیر دفاع، سیکرٹری داخلہ اسکندر مرزا وزیر داخلہ اور پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی وزیر خزانہ کے طور پر شامل کیے گئے۔ یوں بیوروکریٹس کو سیاستدانوں پر حاوی ہونے کا راستہ مل گیا۔ دستور ساز اسمبلی توڑ دینے کے بعد گورنر جنرل ملک غلام محمد یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ چند من پسند افراد کا کنونشن بلا کر اپنی مرضی کا دستور منظور کرا لیا جائے اور وہ اقتدار پر قابض رہیں۔ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس جناب محمد منیر نے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دے دیا جس نے مارشل لاء کا راستہ ہموار کیا، تاہم دستور کی تدوین کے لیے نئی دستور ساز اسمبلی کے باقاعدہ انتخاب کا حکم صادر کیا۔ اسی سال مغربی پاکستان کو ون یونٹ میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا جس کے نتیجے میں قربتوں کے بجائے نفرتیں پروان چڑھیں، عوام کے مسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا اور چھوٹے صوبوں میں علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔

☆☆☆

آمرانہ مزاج رکھنے والے منصوبہ سازوں کی اولین خواہش یہ تھی کہ سیاسی لیڈروں کی زیادہ سے زیادہ جگہ ہنسائی کر کے انہیں بے وقار اور ناتواں بنا دیا جائے، مگر وہ اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں بند رکھے ہوئے تھے کہ ملک گیر اور منظم سیاسی جماعتیں ہی معاشرے کو متحد، ریاست کو مستحکم اور عوام کو اعلیٰ مقاصد کی نگہبانی کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اقتدار کے پجاری سیاسی جماعتوں کے اندر شگاف ڈالتے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ اس طرح ایک مختصر سا ٹولہ سیاہ و سپید کا مالک بن بیٹھا جس نے قوم کے اتحاد پر منفی اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خاں سیاست میں

انہیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے والی سیاسی قیادت اور سیاسی جماعت معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس مرحلے میں یہ احساس بھی اُجاگر ہونے لگا تھا کہ تنہا فوج پاکستان کو متحد نہ رکھ سکے گی۔

☆☆☆

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ حقیقت آخر کار کھل کر سامنے آ گئی جو دو عشروں سے پرورش پا رہی تھی۔ انتخابی نتائج سے معلوم ہوا کہ پاکستان کے دونوں بازو سیاسی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے چھ نکات کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی دو کے سوا تمام نشستیں جیت لی تھیں اور جنرل یحییٰ خاں کے ایل ایف او کی رو سے مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو چکی تھی اور شیخ مجیب الرحمن اکثریتی جماعت کے پارلیمانی لیڈر بن گئے تھے۔ المیہ یہ تھا کہ اُس کی جماعت نے مغربی پاکستان سے ایک بھی نشست حاصل نہیں کی تھی اور یوں مکمل طور پر سیاسی تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ اس واضح تقسیم سے وفاق پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا، کیونکہ دستور کی تدوین کا نہایت کٹھن مرحلہ ابھی باقی تھا۔ مستقبل پر نگاہ رکھنے والی بعض سیاسی شخصیتیں کنفیڈریشن کے فارمولے پر کام کر رہی تھیں، لیکن کوتاہ نظر عسکری اور سیاسی قیادت نے مذاکرات کا عمل ٹینکوں تلے روند ڈالا اور مشرقی پاکستان میں بڑی خونریزی ہوئی۔ بھارت کو مکتی باہنی کی شکل میں فوجی مداخلت کا موقع مل گیا تاہم سخت مزاحمت کے بعد لیفٹیننٹ جنرل یحییٰ خاں نے بغاوت پر قابو پا لیا اور ایک حد تک امن و امان قائم ہو گیا۔ متحدہ پاکستان سے محبت کرنے والی چند با اثر سیاسی شخصیتیں درپردہ اس منصوبے پر کام کر رہی تھیں کہ بھارت میں قیام پذیر عوامی لیگ کی قیادت اور پاکستان کے حکمرانوں کے مابین مذاکرات کے ذریعے مستقبل کا نقشہ طے ہو جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا ایک علامتی فریم ورک تیار کر لیا جائے۔ ان دنوں شیخ مجیب الرحمن میاںوالی جیل میں تھے اور عالمی شہرت کے قانون دان جناب اے کے بروہی اُن کا دفاع کر رہے تھے۔ انھوں نے راقم الحروف پر یہ راز افشا کیا کہ نامہ و پیام جاری ہے اور اچھی پیش رفت کی اُمید پیدا ہو رہی ہے، مگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں کی جولائی ۱۹۷۱ء کی تقریر خرمین اُمید پر برق بن کے گری۔ فوجی قیادت نے مغربی پاکستان میں طبل جنگ بجا دیا تھا، کیونکہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر گولہ باری شروع کر دی تھی اور مشرقی پاکستان میں پاکستان کی بقا کا آخری معرکہ برپا تھا۔

یہ خانہ جنگی بنیادی طور پر اس تنازع پر شروع ہوئی تھی کہ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی ہے، اس لیے قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر شیخ مجیب الرحمن کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ پہلے جنرل یحییٰ خاں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے اور جب مشرقی پاکستان میں بے چینی بڑھنے لگی، تو اجلاس کی تاریخ دینے کے بعد وہ منسوخ کر دی گئی۔ اس پر مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں عوام کر فیو توڑ کر سڑکوں پر نکل آئے اور سول نافرمانی نے پورے صوبے کو اپنی پلیٹ میں

کرپشن پھیلانے اور قد آور سیاسی راہنماؤں کو بدنام کرنے میں بہت سرگرم رہے۔ انھوں نے ایبڈو کے ذریعے تمام قومی قائدین کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اُن کی جگہ بے اصول اور جاہ پرست لیڈر گملوں میں تیار کیے۔ حسین شہید سہروردی ایک ایسے بلند قامت لیڈر تھے جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے ساتھ مضبوط سیاسی رشتوں میں استوار رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر صدر ایوب خاں انھیں اپنا سیاسی حریف سمجھ بیٹھے۔ پہلے اُن پر ایبڈو کا وار کیا اور بعد میں بعض مستند شواہد کے مطابق انہیں زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ وہ تو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر جو پاکستان وہ چھوڑ کر گئے، اس میں سیاسی رشتے بہت کمزور ہوتے گئے۔ وہ عوامی لیگ کے صدر اور شیخ مجیب الرحمن سیکرٹری جنرل تھے، جبکہ مغربی پاکستان سے نوابزادہ نصر اللہ خاں اور اُن کے ساتھی اُس سے وابستہ تھے۔ شیخ مجیب الرحمن جب عظیم قومی لیڈر سہروردی کے بعد اس جماعت کے صدر بنے تو اُن کے رویوں اور فیصلوں سے بددل ہو کر نوابزادہ نصر اللہ خاں عوامی لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور یوں اُس کا اثر و رسوخ مغربی پاکستان میں حد درجہ محدود ہو گیا۔ دوسری جماعت جس میں دونوں بازوؤں کے معروف لیڈر شامل تھے، اُس کا نام نیشنل عوامی پارٹی تھا جس کے سربراہ مولانا عبدالحمید بھاشانی تھے۔ آگے چل کر اس میں بھی شکاف پڑا اور جناب عبدالولی خاں نے اپنا گروپ علیحدہ بنا لیا۔ اس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان میں کوئی ایسی ملک گیر جماعت موجود نہ رہی جو دونوں طرف کے عوام میں گہری جڑیں رکھتی ہو۔

دونوں بازوؤں کے مابین سیاسی رشتے جوں جوں کمزور پڑتے گئے، توں توں اُن کے درمیان فاصلے بڑھتے اور علیحدگی پسندی کے رجحانات پرورش پاتے رہے۔ عوام آمرانہ صدراتی نظام سے تنگ آئے ہوئے تھے، چنانچہ جب ایوب خانی حکومت نے ”عشرہ ترقی“ منایا تو عوام نے بغاوت کر دی اور مطلق العنان حکمران کو معاملات طے کرنے کے لیے فروری ۱۹۶۹ء میں گول میز کانفرنس بلانا پڑی۔ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو نے کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا۔ مغربی پاکستان سے زیادہ تر سیاسی زعماء شریک ہوئے، مگر کونسل مسلم لیگ کے صدر جناب میاں ممتاز دولتانہ کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ شیخ مجیب الرحمن کو رہا کر کے اُسے گول میز کانفرنس میں شمولیت پر آمادہ کیا جائے۔ اُن کے اس مطالبے پر بعض سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی، مگر امر واقعہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں مل کر بھی مشرقی پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکتی تھیں، کیونکہ شیخ مجیب الرحمن عوامی مقبولیت کے ایک ایسے مقام پر فائز ہو چکے تھے کہ اُن کے بغیر کوئی سیاسی سمجھوتا قابل قبول تھا اور نہ اس پر عمل ممکن تھا۔ شیخ صاحب فاتحانہ انداز میں راولپنڈی آئے اور صدر ایوب خاں نے گول میز کانفرنس کے جو مطالبات منظور کیے تھے انہیں ناکافی قرار دیتے ہوئے پارلیمانی جمہوریت کے حق میں اور حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ پاکستان کے دونوں بازو سیاسی طور پر ایک دوسرے سے کٹتے جا رہے ہیں اور

لے لیا جس پر قابو پانے کے لیے فوجی آپریشن کا تباہ کن راستہ اختیار کیا گیا۔ بھارت نے عالمی برادری میں اس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا اور پاکستان کو پوری دنیا میں تنہا کر ڈالا۔ اس کے علاوہ کتنی باہنی جسے بھارت میں فوجی تربیت دی گئی تھی، اُس نے پاک فوج پر حملے شروع کر دیے اور سٹریٹجک مقامات قبضے میں لے لیے اور بھارتی فوج نے بھی ہر طرف سے یلغار کر دی تھی۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں فائر بندی کے فارمولے پر ابھی بحث جاری تھی کہ یکا یک سرنڈر کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا آج تک ایک معتمد بنا ہوا ہے جس کی عقدہ کشائی سے بہت سارے راز بے نقاب ہوں گے۔ سانحہ مشرقی پاکستان سے ہمیں چند اہم سبق ملتے ہیں جو آج کے تناظر میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا یہ کہ وطن میں استحکام کو فروغ دینے کے لیے سیاسی جماعتوں کا ایک مضبوط نظام اور استحکام از بس ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ انتخابات کے نتائج خوش دلی سے تسلیم کرنے اور اُن کے مطابق انتقال اقتدار کا ایک قابل اعتماد سسٹم بے حد ناگزیر ہے۔ تیسرا یہ کہ مسائل مذاکرات کے ذریعے طے کرتے رہنے سے معاشرے میں ہم آہنگی اور خود اعتمادی پروان چڑھتی ہے۔ چوتھا یہ کہ فوج اپنے عوام کے خلاف جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پانچواں یہ کہ معاشی اور معاشرتی استحکام کے لیے قانون کی حکمرانی، انصاف کی فراہمی اور انسانوں کی تہذیبی اقدار کا احترام اور اُن کی بنیادی ضرورتوں کی نگہبانی بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

آج ہم جن گھمبیر خطرات سے دوچار ہیں، وہ سیاسی اور جمہوری عمل کے تسلسل اور صحت مندرتقا کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ عظیم کام تمام جمہوری معاشروں کی طرح سیاسی جماعتیں ہی بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہیں، لیکن ہمارے ہاں سیاست دانوں پر پھبتیاں کسنا، انہیں ذلیل ترین مخلوق سمجھنا، اُن میں کیڑے نکالتے رہنا، ہمارے صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں اور فوجی دماغوں کا ایک محبوب مشغلہ چلا آرہا ہے۔ اُن کے بارے میں عمومی تاثر یہ ابھار دیا گیا ہے کہ وہ حد درجہ نااہل، کوتاہ نظر، عیاش اور بد عنوان واقع ہوئے ہیں۔ سیاسی جماعتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ عوام کے بجائے چند خاندانوں اور اونچے گھرانوں کی لونڈیاں ہیں اور انہی کے مفادات کی آبیاری کرتی رہتی ہیں۔ بلاشبہ سیاسی جماعتوں اور قیادتوں کا محاسبہ ایک صحت مند جمہوری معاشرے کی بقا اور نشوونما کے لیے کسی قدر ناگزیر ہے، مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے بغیر یا اُن پر سے اعتماد اٹھ جانے کے بعد معاشرے کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور ذات برادریوں پر مبنی سلطنتیں قائم ہو جائیں گی جو قومی وحدت کی جڑیں کاٹ ڈالیں گی۔ ہم جناب آصف علی زرداری کو ہدف تنقید بناتے رہتے ہیں، مگر سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ اُن کی پارٹی تمام صوبوں میں اثر و رسوخ رکھتی اور اتحاد کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ تاہم اس کا غیر مہذب کلچر تبدیل کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اسی طرح جناب محمد نواز شریف قومیت پرست جماعتوں کو قومی دھارے میں لانے کے

لیے دن رات کاوش کر رہے ہیں اور اُن کے سیاسی پیروکار بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جناب الطاف حسین بھی سندھ کے شہروں میں ایک قائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب عمران خاں نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور مل کلاس کی اُمیدوں کا مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کی شخصیت کا سحر بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور اُن کے دم قدم سے پاکستان کا بول بالا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی کی قیادت بھی لوگوں کو متحد اور منظم رکھنے میں ایک تاریخی کردار رکھتی ہے۔ جماعت اسلامی کی فکری، علمی اور سیاسی خدمات کا گلزار کہکشاں پورے ملک میں آباد ہے۔ ہمیں اُن قائدین کا بہت احترام کرنا چاہیے جو بلوچستان جیسے انتہائی سنگناخ علاقے میں سیاسی فصل کی کاشت اور حفاظت بڑی مردانگی، جاں فشانی اور بردباری سے کر رہے ہیں۔

قومی شیرازہ بندی میں سیاسی جماعتوں کی ناگزیر ضرورت کا صحیح تعین کر لینے کے بعد ہمیں اُن بنیادی نکات پر نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ہوگا جو سیاسی فضا میں ایک عظیم تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اُن پر بہت بڑا اعتراض خاندانی موروثیت کے حوالے سے ہو رہا ہے جس میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، لیکن برصغیر کی سیاست میں یہ چلن مدت سے چلا آرہا ہے۔ بھارت جو اپنے آپ کو سب سے بڑی جمہوریت قرار دیتا ہے، وہاں ابھی تک بھی نہرو خاندان کی موروثیت سیاست کا ایک اہم عنصر بنی ہوئی ہے اور یہی ڈر لے کر کانگریس کو اپنی سیاسی حیثیت قائم رکھنے کے لیے سونیا گاندھی کو اپنا سربراہ بنانا پڑا کہ وہ اندرا گاندھی کی بہو ہے، حالانکہ وہ خود اطالوی نژاد ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی شیخ مجیب الرحمن اور جنرل ضیا الرحمن کی خاندانی وراثت کا سکہ چل رہا ہے۔ سری لنکا میں بھی ایک ہی خاندان طویل عرصے سے اقتدار کا وارث چلا آرہا ہے۔ پاکستان کی پیپلز پارٹی کے لیے بھٹو خاندان سے وابستگی سب سے ضروری ہے اور اسی لیے بلاول زرداری کے ساتھ بھٹو کا لاحقہ لگانا پڑا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی میں بھی خاندانی وراثت قائم ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ قاف بھی ایک ہی خاندان کے گرد گھوم رہی ہے، جبکہ مسلم لیگ نون میں خاندان کو فوقیت دی جاتی رہی ہے، تاہم اس رجحان میں بتدریج کمی آرہی ہے۔ جماعت اسلامی ایک دینی اور سیاسی جماعت ہے جو خاندانی موروثیت سے بالکل ماورا ہے۔ اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ متحدہ میں بھی موروثیت کا سلسلہ قائم ہی نہ ہونے پائے۔ بلوچستان میں سیاسی جماعتیں اب جمہوری بنیادوں پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ تحریک انصاف میں داخلی انتخابات کے کامیاب تجربے سے سیاست میں جمود ٹوٹ رہا ہے اور عوام کے ساتھ براہ راست رشتے مضبوط کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔

☆☆☆

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی حکومتوں اور سیاسی جماعتوں میں کرپشن کی وبا بہت پھیلی ہوئی ہے جس کی شروعات فیلڈ مارشل ایوب خاں کے آمرانہ دور میں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۸ء سے پہلے کسی وزیر یا اعلیٰ عہدے پر فائز

بیوروکریٹ کے بارے میں رشوت لے کر کام کرنے کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں تھا، مگر اب کوئی بھی کام بھاری رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جگہ جگہ منصب داروں کی دکانیں کھلی ہیں اور سرعام بڑے بڑے سودے کیے جا رہے ہیں اور قومی وسائل لوٹے جا رہے ہیں تو ادارے کیا ترقی کریں۔ اس کچھر کے خلاف رائے عامہ بیدار اور منظم ہونے لگی ہے اور فعال میڈیا نے بدعنوانیوں کا سراغ لگانے میں کمال سراغ رسانی کے جوہر دکھائے جبکہ آزاد اور سرگرم عدالت عظمیٰ نے قوم کے اربوں روپے ہڑپ ہونے سے بچا لیے ہیں۔ پارلیمانی کمیٹیاں بھی احتساب کا حق ادا کر رہی ہیں اور جرنیلوں کا بھی احتساب کر رہی ہیں۔ ان اقدامات سے کرپشن کے خلاف شدید نفرت دیکھنے میں آرہی ہے اور اس امر کا قومی امکان پایا جاتا ہے کہ آنے والے انتخابات میں وہ سیاسی جماعتیں بڑے گھائے میں رہیں گی جن کے امیدواروں سے بدعنوانیوں کی بو آرہی ہوگی کیونکہ عوام انھیں مسترد کر دیں گے اور اچھی اخلاقی اور سیاسی شہرت رکھنے والوں کو ووٹ دیں گے۔ اب حسن ظن یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں امیدواروں کے انتخاب میں ذاتی کردار کو بنیادی اہمیت دیں گی اور مالی وسائل کی ریل پیل پر کم انحصار کریں گی۔ لوگوں میں یہ چرچے بھی ہو رہے ہیں کہ سول سوسائٹی بدعنوان اور بدکردار امیدواروں کا نامہ اعمال میڈیا کے ذریعے مشتہر کرنے کے علاوہ ان کا گھیراؤ بھی کر لے گی، کیونکہ ان انتخابات میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یہ بھی نظر آرہا ہے کہ اس مرتبہ ریٹرننگ آفیسر آئین کی ۶۲ اور ۶۳ دفعات پر نامزدگی کے کاغذات پر کھیں گے اور انھیں تفصیلی سکروٹی کے لیے مناسب وقت دیا جائے گا۔ کرپشن ایک عالمگیر مرض کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے ملک چین اور بھارت میں بھی بڑے پیمانے پر کرپشن موجود ہے، مگر ترقیاتی کام ہو رہے ہیں، جبکہ پاکستان میں ترقیاتی اور فلاحی منصوبے کرپشن کی بھیشت چڑھ رہے ہیں۔ اس تباہ کن عمل کی روک تھام نہایت ضروری ہوگئی ہے کیونکہ عوام بیروزگاری، مہنگائی اور مفلسی کے ہاتھوں بغاوت پر تلے ہوئے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کو بھی اس حقیقت کا بھرپور ادراک ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی اور اپنے حریفوں کو چوروں، لٹیروں اور علی بابا چالیس چور کے القاب سے پکارتی ہیں، تو وہ مجموعی طور پر ملکی سیاست کی حیثیت اور طاقت پر کاری ضرب لگاتی ہیں۔ دنیا میں ہماری ہوا اکھڑتی جا رہی ہے اور بیرونی سرمایہ کار خاندانوں کی سرزمین میں آنے سے خوف زدہ ہیں۔ وہ قد آور سیاسی شخصیتیں اور جواں ہمت سیاسی جماعتیں جنھوں نے آمریت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور جمہوریت کی بحالی میں ناقابل فراموش قربانیاں دی ہیں۔ انھیں بدست لوگ اپنے پاؤں تلے روندنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شرق اوسط میں ڈکٹیٹر تیس چالیس برسوں سے پہلے اقتدار سے ہٹائے نہیں جاسکے اور انھیں ہٹانے کے لیے عرب عوام کو خون کے دریا عبور کرنا پڑے ہیں، جبکہ پاکستان میں آمریت سے جمہوریت کا سفر بالعموم پُر امن اور عظیم جدوجہد کا مظہر ٹھہرا ہے۔ ہمیں اس عظیم الشان ورثے کو تضحیک کا نشانہ بنانے کے بجائے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ سیاسی جماعتیں

اور سیاسی قیادتیں اگر بالغ نظری کا ثبوت دیں گی، تو کوئی ادارہ اور کوئی طاقت ان کے مد مقابل نہیں ٹھہر سکیں گے کہ وہ عوام کی قوت کی پاسدار ہیں۔ آج ہمیں خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ عام انتخابات شاید وقت پر نہ ہو سکیں، کیونکہ نت نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور قومی سلامتی کے مسائل پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس خطرے کے سد باب کا ایک ہی فطری اور سیدھا راستہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں دسمبر کے آخر تک نگران حکومتوں کے قیام پر متفق ہو جائیں اور انتخابات کو شفاف بنانے پر بھرپور توجہ دیں۔ انتخابات کے لیے مارچ کا مہینا بہت سازگار ہوگا کہ ان دنوں بہت گرمی ہوگی نہ لوڈ شیڈنگ کا عذاب لوگوں پر مسلط ہوگا۔ وہ کسی قدر سکون اور یک سوئی کے ساتھ اپنے نمائندوں کا انتخاب کر لیں گے اور ان سیاسی قوتوں کو آگے لائیں گے جو مضبوط بنیادوں پر قوم کی شیرازہ بندی کر سکیں گی۔

سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا مسئلہ حقیقی معنوں میں اجتماعی مشاورت کا فقدان ہے۔ یوں تو ہر جماعت میں جنرل کونسل بھی ہے اور ورکنگ گروپس بھی اور نام کے تھنک ٹینک اور تہ در تہ کمیٹیاں بھی، مگر فیصلے کچن کیبٹ ہی کرتی ہے جس میں لیڈر کے گئے چنے افراد ہوتے ہیں۔ اسی روش نے سیاسی جماعتوں کے اندر فسطائیت کی آبیاری کی اور سیاسی جماعتوں کی افادیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ بسا اوقات پارٹی کے اہم لوگ بھی اپنے آپ کو غیر متعلق سمجھنے لگتے اور معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور کارکن اور قائد کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں رہتا۔ تب خوشامدیوں اور موقع پرستوں کی اجارہ داری مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں صحت مند سیاسی مسابقت سے سیاسی جماعتیں نئے سرے سے اپنی شیرازہ بندی کرنے اور ایشوز کو اہمیت دینے پر مجبور ہو جائیں گی۔

کراچی، بلوچستان اور فاٹا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس نے ہماری قومی زندگی میں سخت اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایگزیکٹو عدلیہ کو آنکھیں دکھا رہی ہے اور عدلیہ اپنی طاقت سے بڑھ کر حالات میں بہتری لانے کے لیے فیصلے صادر کر رہی ہے۔ انارنی جنرل عدلیہ کی اعانت کرنے کے بجائے اسے دھمکیاں دے رہے ہیں اور فاضل چیف جسٹس کے گرد گھیرا ڈالنے کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ دوسری طرف ایئر مارشل اصغر خاں کے مقدمے کا جو فیصلہ سامنے آیا ہے اس میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے اور مختلف اداروں میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ فاضل چیف جسٹس اپنے بیٹے اور آرمی چیف اپنے بھائی کے ہاتھوں سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں اور حاسدین آئے دن شوشے چھوڑ رہے ہیں۔ ان پیچیدہ حالات میں سیاسی قیادتوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انھیں پیش قدمی کرنا اور سلگتی ہوئی صورت حال کا ایک سیاسی حل تلاش کرنا ہوگا۔ اسلام آباد میں ڈی ایٹ کی سربراہ کانفرنس نے امیدوں کے قمقمے روشن کر دیے ہیں اور ایک دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ پاکستان دہشت گردی کا ہدف بن جانے کے باوجود زبردست قوت ارادی اور سیاسی بصیرت کا حامل ہے۔

شکستِ آرزو

جب پاکستان دولخت ہوا

پاکستان سے عہدِ وفا نبھانے والوں کو ہم نے تنہا کیوں کر دیا؟

سید شاہد ہاشمی

دسمبر ہمارے مشرقی بازو کے ٹوٹنے اور الگ ہونے کے درد سے بھرا مہینا ہے اور شکستِ آرزو ایک محب وطن بنگالی کی آرزوؤں اور خوابوں کے ٹوٹنے کا ماجرا جو دسمبر کے ان دنوں کو عمر بھر نہ بھول سکے۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضے کی مزاحمت کرنے والوں کا ذکر بھی اب ہمارے ہاں جرم ٹھہرا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ملک بچانے والے اب اجنبی ہیں اور ان کی باتیں کسی اور جہاں کی لگتی ہیں۔

سابق

مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی تاریخ کبھی اس طرح نہیں لکھی جاسکے گی کہ تمام متعلق فریقوں کو اس سے

اتفاق ہو۔ یوں تو اجتماعی زندگی کے ہر اہم اور حساس معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ ڈالنے کے عمل جیسا خونیں باب، اس طرح بیان کرنا کہ پاکستان سے وفاداری نبھانے والوں اور اس سے بے وفائی کرنے والوں کا موقف یکساں طور پر سمولیا جائے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ و قبضہ کی مزاحمت کرنے والوں کی تاریخ کا آج کوئی والی وارث اور کوئی وکیل مدعی موجود نہیں۔ لہذا پاکستان سے عہدِ وفا نبھانے والے، ایک طرف بنگلہ دیش میں ”غدار و باغی“ تخریب کار و قاتل اور جنگی مجرم“ وغیرہ قرار دیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف موجودہ پاکستان (پاکستان

پہلے پارٹی کے بانی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی اصطلاح میں ”نئے پاکستان“) میں غیر واجبی اور فلو بن کر رہ گئے ہیں۔ خود پاکستانی اخباری کالموں اور نصابی کتابوں میں وہ ”فوجی گٹھ جوڑ میں شامل، مشرقی بازو کی رائے عامہ کا احترام نہ کرنے والے اور بنگالیوں کے قاتل“ جیسی گالیاں کھا رہے ہیں۔ اُدھر بنگلہ دیش کا تعلیمی نصاب، پاکستان سے نفرت انگیزی اور قیام بنگلہ دیش کے سانحات کی مبالغہ آمیز تصویر کشی کا مرکب ہے۔ تو اُدھر بھٹو کے ”نئے پاکستان“ میں ساری ملتی تاریخ اور تعلیمی نصاب کو (مغربی استعمار کی فراہم کردہ مالی اور دانشورانہ امداد کے زور پر) ”نفرت انگیز“ مواد سے ”پاک“ کیا جا چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں عوامی لیگ اور بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ (RAW) کی سرپرستی میں قائم این جی اوز، باہم مل کر برادر بنگلہ دیشی عوام اور خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کا ذہن پاکستان کے حوالے سے زہر آلود کر چکے ہیں۔

مشرقی پاکستان ایک خود مختار ملک، پاکستان کا عالمی طور پر تسلیم شدہ حصہ تھا۔ پاکستان کے تحفظ و بقا کی اس باری ہوئی جنگ میں اپنی اور خاندان کی زندگی اور مستقبل سے بے پروا ہو کر کود پڑنے والے لوگ بلاشبہ لائقِ داد تھے، لائقِ داد ہیں۔ ایسا کرنے والے کئی ملین بنگلہ بولنے والے مہبان ملک و ملت بھی اُن میں شامل تھے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں، بھارت کی چھپی امداد و سازش اور کھلی مداخلت و جارحیت کے نتیجے میں بننے والے ”محصور“ ملک کا مستقبل، غیر محفوظ اور برہمن سامراج کے ہاتھوں ریغمال ہوتا ہوا دیکھ لیا تھا اور اس برے دن سے بچنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

بھارت کے محاصرے میں جکڑے بنگلہ دیش کی مثال بتیسی میں گھری زبان کی طرح ہے۔ وہ تین اطراف سے خشکی کے ذریعہ اور ایک طرف سے خلیج بنگال کے راستے بھارت کے حصار میں ہے۔ نتیجتاً بنگلہ دیش و پاکستان سمیت تمام ہمسایہ ممالک میں بھارتی لایبرز (Lobbies) اور اثرات میں تیز رفتار اضافہ ہوا ہے۔ بنگلہ دیش اس بھارتی ”سرمایہ کاری“ اور ”سرمایہ باری“ کے نتیجے میں کم از کم فی الحال پوری طرح بھارتی اثر و رسوخ اور ترجیحات کے تابع ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے مقام تک پہنچانے میں مددگار، مغربی پاکستان کے بعض وہ عناصر بھی تھے جنہیں ”اسلامی پاکستان“ سے کل بھی بغض تھا، آج بھی بیرہے اور جو اس خیال ہی سے چوتے اور منہ اور قلم سے جھاگ بکھیرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ شکستِ آرزو کی یہ داستان اُسی زبان و انداز، نقطہ نظر اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جو بھارتی سامراجی موقف رہا ہے

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین (۱۹۲۰-۱۹۹۵ء)، اس کتاب (The Wastes of Time) کے مصنف، اعلیٰ پائے کے دانشور، انگریزی ادب کے استاد اور ڈھاکا یونیورسٹی کے آخری پاکستانی وائس چانسلر خود جلدی پشتی ”بنگالی“ تھے۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں، پاکستان کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ عمر بھر حبِ پاکستان کی تپش میں جلتے اور پکتے رہے۔ شکستِ پاکستان و اصل اُن کی آرزوؤں اور خوابوں کی شکست و ریخت اور اُن کے شعور تاریخ اور نظریات کی تکذیب تھی، جسے وہ زندگی بھر قبول نہ کر سکے اور یہ صدمہ سینے سے لگائے اپنے رب کے ہاں چلے گئے۔

پاکستان کے پہلے عام انتخابات (۱۹۷۰ء) میں شیخ مجیب الرحمن کی اکثریت تسلیم نہ کر کے ”ایک ہی ملک میں دو وزراءئے اعظم“ تجویز کرنے اور ”ادھر تم ادھر ہم“ کا نعرہ ”فرزانہ“ لگانے والا یہ ملک فکر اپنی کم ظرفی، بد باطنی اور ملک دشمنی کا داغ اپنے تئیں چھپالینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اصل المیہ یہ ہے کہ کچھ باختیار ”مہبان پاکستان“ نے مشرقی پاکستان کی سرزمین پر وفائے عہد کی راہ میں بننے والے لہو کو فراموش کر دیا اور جو لوگ زندہ بچے، ان سے قطع تعلق کر لیا۔

ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و خیالات پر مبنی **شکستِ آرزو** کی یہ داستان آپ کے دل کو لگے تو کتاب ضرور پڑھے۔ یہ سابق مشرقی پاکستان کو بھی اور پاکستان کے تاحیات عاشق زار ڈاکٹر سید سجاد حسین مرحوم کو بھی ہمارا حقیر سا نذرانہ تحسین ہوگا۔ شاید ہماری، آپ کی ایسی چھوٹی چھوٹی کاوشوں ہی کے نتیجے میں پاکستان سے عہدِ وفا نبھانے اور اس کے صلے میں شہادت و بے وطنی کے عذاب جھیلنے والوں کا مقدمہ، ضمیر و تاریخ کی عدالت میں تازہ رہے، لاوارث لہو کا حساب کسی کتاب جہاں میں بھی درج ہو جائے۔

”بنگلہ دیش“ اب ایک حقیقت ہے۔ ہم اس کو ملتِ اسلامیہ کا ایک بازو، عالمگیر اسلامی برادری کا ایک باوقار حصہ اور پاکستان کا بھائی اور دوست سمجھتے ہیں اور بنگلہ دیش کی آزادی و خود مختاری، تعمیر و ترقی اور عزت و سرفرازی کے لیے دعا گو ہیں۔

(مستطوط ڈھاکا کے ماہ کی مناسبت سے ”شکستِ آرزو“ کے کا ایک بہت ہی اہم باب اس شمارے کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔)

سازش کا بیج - پروفیسر سید سجاد حسین (سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

”پاکستان کے خلاف تحریک جوں جوں زور پکڑتی گئی سونار بنگلہ کا راگ اس قدر الاپا گیا کہ معمر افراد کے حافظے کو بھی پروپیگنڈے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہے۔

۱۹۷۰ء کے آنے آنے کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ اگر کوئی شخص مشرقی پاکستان کے استحصال سے متعلق عوامی لیگ کے پروپیگنڈے میں کسی خامی کی نشاندہی کرتا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ عوامی لیگ کا فلسفہ قومی مفادات کے یکسر منافی ہے تو لوگ اسے غدار قرار دینے پر تیار جاتے تھے۔ تمام سیاسی جماعتیں شیخ مجیب الرحمن کی جانب سے خود مختاری کے مطالبے کی حمایت کے لیے میدان میں آگئی تھیں۔ بیشتر سیاسی جماعتوں نے شیخ مجیب الرحمن کے ۶ نکات کی بھرپور حمایت کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت میں یہ نکات ملک سے علیحدگی کے پروگرام کے سوا کچھ نہیں تھے۔ مگر کسی میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اب عوامی لیگ کے منشور کے خلاف بولنا بنگالیوں کے مفاد کے خلاف بولنا تصور کیا جانے لگا تھا۔ مشرقی پاکستان میں آئینڈیل ازم نے ہر سچائی کو گھنا دیا تھا۔ سازش، جہالت، خیالی باتیں، غیر ملکیوں کا خوف۔ ان تمام تصورات نے مل کر بوڑھوں اور جوانوں کو یکساں طور پر ایک ایسی فضا کے حوالے کر دیا تھا جس میں صرف یہ بات یاد رکھنے کے قابل سمجھی جا رہی تھی کہ کسی زمانے میں بنگال کی سرزمین سونار بنگلہ تھی، اس علاقے میں دودھ کی ندیاں بہا کرتی تھیں۔ اب دنیا بھر سے لوگ اس خطے میں وارد ہو کر اس کی خوشحالی کو ٹوٹ کر لے جانے لگے تھے۔

☆☆☆

ملک توڑنے کی سازش کا بیج ڈالنے سے ۱۹۷۱ء میں اس فصل کے ”بار آور“ ہونے تک یکے بعد دیگر

الہ آباد اور آگرہ کے ارد گرد پورے خطے میں مختلف نسل لوگ ملیں گے۔ آریاؤں کی اولادیں ترک، مغل، ایرانی اور پنجاب نسلوں میں گھل مل گئی ہیں۔

جنوبی ہند میں تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑ بڑی اور نمایاں زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کا تعلق نسل سے نہیں۔ جنوبی ہند میں سب سے بڑا نسلی گروپ دراوڑ ہے اور اس خطے کی نمایاں زبانیں بھی دراوڑ ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود برصغیر کی تاریخ نسلی ہے نہ لسانی۔ شمال اور جنوب تعصب کی بنیاد پر تقسیم رہا ہے اور ان میں کشیدگی بھی رہی ہے تاہم اسے زبان یا نسل کا تنازع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ برطانوی راج کے دوران جنوبی ہند میں حیدر آباد کی خود مختار ریاست میں مغل، ترک اور افغان نسل سے تعلق رکھنے

رو نما ہونے والے تمام واقعات کی بنیاد بنگالی قوم پرستی تھی۔ دانشوروں اور طلبانے اس پر فریب ”نظرینے“ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم ظاہر کر کے اس کے ساتھ مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس ضمن میں منطقی تجزیے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور نہ ہی جذبات کی سطح سے بلند ہو کر معاملات کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچا گیا۔ قوم پرستی پروان چڑھتی گئی اور اس پر فدا ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بنگالی قوم پرستی کے سراسر خلاف تھا لیکن نوجوانوں میں اس نظریے کی مقبولیت کا میں بھی اندازہ نہیں لگا سکا اور جب یہ ہم پھٹا تو پتا چلا کہ مجھ سمیت کسی نے بھی بچنے کی تیاری نہیں کی تھی۔

پاکستان کے خلاف عوامی لیگ نے جس بنگالی قوم پرستی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اسے ایک فریب اور سراب کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ مگر کیا بنگالی قوم پرستی کو معروف معنوں میں قوم پرستی قرار دیا جاسکتا ہے؟

سلطنت بنگال کو یہ نام زبان اور جغرافیہ دونوں کی بنیاد پر ملا۔ اس کی حدود میں بہار کے ہندی/اردو بولنے والے اور شمال مشرقی بھارت میں اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مشرق میں بنگال کی سلطنت آسام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ نام کے سوا بنگال کی سلطنت میں مغلوں سے قبل کے زمانے کی ریاستوں کے مقابلے میں کوئی فرق نہ تھا۔

ہندوستان کے ہر دور میں زبانوں اور نسلوں کا تنوع رہا ہے۔ بہار کی مغربی سرحدوں سے پنجاب کی مشرقی سرحدوں تک پھیلے ہوئے زرخیز علاقے میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ بستے آئے ہیں۔ راجپوتوں کی رگوں میں خالص آریہ نسل کے لوگوں کا خون دوڑتا ہے۔ دارالحکومت دہلی، لکھنؤ،

والے مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہ لوگ اردو بولا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ شمال کی طرف اسی طرح شک بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔

کھلا تضاد

ہندوستان نے باضابطہ پروپیگنڈا کیا کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیے جانے سے مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں کا استحصال ہو جائے گا اور انہیں غلامانہ زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ بھارت میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا مگر مغربی بنگال کے ہندوؤں کو اس میں اپنی زبان اور نسل کے لیے کوئی خطرہ دکھائی نہیں دیا! کیا یہ کھلا تضاد نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے نام نہاد

رومن ایمپائر کی شکست و ریخت کے بعد یورپ

برصغیر پاک و ہند آج اسی مقام پر گھڑا ہے جہاں قرون وسطیٰ میں رومن ایمپائر کی شکست و ریخت کے بعد یورپ تھا۔ انجینئر کے چاسر (Chaucer)، اٹلی کے دانٹے (Dante)، فرانس کے رابیلیر (Rabelais)، لاطینی کے مقابلے میں اپنی اپنی زبانوں کا جھنڈا بلند کرنے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے پہلے یورپین ہی گردانتے تھے۔ ان یورپی دانشوروں نے سمجھ لیا تھا کہ مختلف علاقائی اور لسانی مظاہر سے بڑھ کر یورپی ثقافت بھی جوان میں مشترک تھی۔

لسانی بنیاد پر قوم پرستی کی بات کرنے والوں کو جھگڑی، بالینڈ یا سوئٹزر لینڈ کی مثال پسند نہیں آئے گی۔ مگر کیا ریاستوں کی تشکیل میں ہم زبان اور کچھ کے کردار کو تاریخی حقائق کے معاملے میں زیادہ اہمیت دیں گے؟ رومن سلطنت کے ٹوٹ کر بکھرنے پر یورپ نے جو کچھ کیا وہی سب کچھ برصغیر میں بھی ہوا۔ مغل سلطنت کے بکھرنے پر مختلف علاقوں میں ہا اثر قائدین کے زیر اثر چھوٹی چھوٹی ریاستیں نمودار ہو گئیں۔ مقامی سیاست کے الٹ پھیر نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہار اڑیسہ اور بنگال پر مشتمل علی وردی خان کی بادشاہت، اودھ اور آگرہ میں نوابوں کی حکمرانی، پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت، مغرب میں مرہٹوں کی، حیدر آباد اور میسور میں مسلمانوں کی فرماں روائی مجموعی طور پر الگ الگ ریاستوں کی شکل میں باقی رہ سکتی تھی مگر برصغیر میں برطانیہ اور فرانس کی کشمکش نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

جو کچھ حکمرانوں نے لوگوں پر مسلط کیا اس سے بہت کر برصغیر میں اتحاد اور یکجہتی کی بنیاد ہمیشہ مذہبی ثقافت پر رہی ہے۔ مغرب کے مرنے، مشرق کے بنگالی اور دوسرے بہت سے علاقوں کے ہندوؤں کی مذہبی روایات ایک تھیں۔ ان کے دیوتا مشترک تھے، گیتا اور ایشور پران کا کامل یقین تھا۔ مہا بھارت اور رامائن ان کے لیے محض نظمیں نہیں تھیں بلکہ ان میں وہ مذہبی احکام بھی تلاش کرتے تھے۔ البتہ یہ اتحاد ہلا استثنائیں تھا، جزوی تھا۔ کروڑوں مسلمان تھے جو کسی بھی اعتبار سے ہندوؤں کی مذہبی روایات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ برصغیر کے باشندوں کو ایک لڑی میں پرونے والی چیز ہندو ازم تھا یا پھر اسلام۔ زبان یا نسل نے کبھی اتحاد کی بنیاد کا کردار ادا نہیں کیا۔ اگر ہندو ازم اور اسلام کو نکال دیا جائے تو اس خطے میں صرف نسلی اور قبائلی روایات اور ان کے باہمی تصادم سے پیدا ہونے والی بدعوا سی ہی رہ جائے گی۔

دانشور ہندوستان کے اس کھیل کو سمجھنے میں ناکام رہے اور انہوں نے بنگالی زبان کو اردو سے لاحق خطرات پر واویلا شروع کر دیا۔ راتوں رات یہ بدگمانی پھیلا دی گئی کہ پاکستان میں بنگالی زبان کے خلاف کوئی زبردست سازش کھڑی کر دی گئی ہے۔

بنگال کی تاریخ اور قحط

نام نہاد بنگالی اسکالرز یہ بھی بتانے لگے تھے کہ بنگال کا عظیم ثقافتی ورثہ خطرے سے دوچار ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھول بیٹھے کہ بنگال اُس وقت تک ۱۹۴۳ء کے قحط کے اثرات سے ہی چھٹکارا نہیں پاسکا تھا جبکہ دوسری جنگ عظیم کے باعث معیشت اور معاشرت کو پہنچنے والے نقصانات کا ازالہ بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکا تھا۔ بنگال میں قحط عام بات تھی۔ مختلف ادوار میں غذائی اجناس کی شدید قلت رونما ہوتی رہی ہے۔ عام حالات میں بھی غذا ایک مسئلہ رہا ہے مگر اس حقیقت سے بھی نظر چرائی گئی۔ ۱۹۴۳ء کے قحط سے پہلے ۴۳ سال قبل بھی بنگال میں ایک ایسا قحط پڑا تھا کہ لاکھوں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بنگالی ادب ہر بیس پچیس سال کے بعد رونما ہونے والے قحط اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خوراک کی قلت سے متعلق کہانیوں سے بھرا پڑا ہے اس حوالے سے شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس تکلیف دہ صورتحال پر بہت سی نظمیں بھی کہی گئی ہیں۔ مگر بنگال کے ناخواندہ لوگوں کو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا اور خیالی پلاؤ پکانا اچھا لگتا ہے۔ بنگال کی تاریخ قحط، سیلاب، طوفان اور افلاس سے عبارت ہے مگر وہ ان تمام باتوں کو بھول کر اس خیال سے دل کو بہلانا چاہتے ہیں کہ بنگال میں تو ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور یہاں کبھی کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔

صدیوں سے بنگال کے حصے میں مشکلات ہی آئی ہیں۔ آبادی کی بہتات اور بھوک نے اس خطے کو دیوبچ رکھا

بنگال میں شاندار زندگی کا تصور

ایک عام بنگالی کے ذہن میں کامیاب زندگی کا تصور بس یہ ہے کہ اسے اپنے کھیتوں سے اناج، تالاب سے مچھلی، درختوں سے پھل اور گھر کے موشیوں سے دودھ حاصل ہو جائے۔ بہتر زندگی وہی تصور کی جاتی تھی جس میں سے کچھ لینے دینے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔ زرعی معاشرے کی یہ سوچ اسی وقت کارگر ثابت ہو سکتی ہے جب کوئی معاشرہ خود کو باقی دنیا سے الگ تھلک کر لے اور پھر کچھ لینے یا دینے پر یقین نہ رکھے۔ قرون وسطیٰ کے بنگالی سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ”اعلیٰ معیار“ کی یہ زندگی بھی محض چند ہی افراد کو میسر تھی۔ آبادی کا بڑا حصہ انتہائی کمزور تھا۔ بہت کم نرخوں پر بھی یہاں لوگ کھانے پینے کا سامان خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ افلاس کی زندگی میں کسی جدت اور محنت جوئی کے فقدان سے اور تنگمیں ہو گیا۔ یا شاید افلاس کی شدت کی وجہ سے وہ کچھ نیا کرنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس ہی نہیں کر پاتے تھے۔ انہیں کہیں اور پردیس میں جا کر قسمت آزمائے کا خیال جیتا ہی نہیں تھا۔ آبائی علاقوں سے چھٹے رہتا ان کی نظر میں حب الوطنی تھی۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تو یہ حب الوطنی ام منطقی حدود عبور کر جاتی تھی۔ بعض علاقوں کے لوگ بڑے دریا کو پار کرنا بھی معیوب اور منحوس سمجھتے تھے۔ پدماء ہم چرا اور میٹھنا محض دریا نہ تھے بلکہ حد بندی کا کام بھی کرتے تھے۔ ان دریاؤں کے درمیانی علاقوں میں لوگ اپنی آبادیوں تک محدود رہا کرتے تھے اور کنویں کے مینڈک بن گئے۔ ان کی سوچ اس قدر محدود ہو گئی تھی کہ وہ اپنے ہی خیالات کو معیار سمجھنے لگے اور پر تعیش زندگی سے متعلق اپنے ان تصورات کو قابل تقلید نظریات کا درجہ دینے لگے۔ ہنرمند چیمبرجی، رابندر ناتھ ٹیگور اور سرت چند چیمبرجی کو بنگالی ادب کی تین اعلیٰ ترین شخصیات قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں سے کہیں بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ بنگال میں زندگی کا اعلیٰ معیار عام تھا یا علوم و فنون کوئی غیر معمولی ترقی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔

بنگال کی خوشحالی پر پٹا جانے والا ڈھول

بنگال میں وسائل اور آبادی کے درمیان ہمیشہ کھینچ تانی رہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے وسائل میں اضافے کے لیے کسی نے نہیں سوچا۔ زمین تو محدود ہے اور خوراک کے دیگر ذرائع بھی۔ ایسے میں خوشحالی کا کیسے سوچا جاسکتا ہے؟ بنگال کی زمین زرخیز ہونے کے باوجود لوگوں کو پیٹ بھرنے کی سکت اس لیے نہیں رکھتی کہ یہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔

قدرتی آفات بھی بنگال کا باقاعدگی سے رخ کرتی کسی اور خطے میں جس کو دولت کہا جاتا ہے اس طرح کی رہی ہیں۔ بنگلہ دیش سمندری طوفانوں، مون سون وولٹ کا بنگلہ دیش میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ کسی زمانے ہواؤں اور سیلابی ریلوں کی زد میں رہتا ہے۔ ان قدرتی زمینداروں کا ایک طبقہ تھا جو بڑی حویلیوں میں رہتا تھا آفات سے جانی نقصان بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ مگر انہیں اعلیٰ معیار زندگی کا کوئی شعور نہیں تھا۔ اب تو یہ سال میں کوئی ایک مہینہ بھی آفات سے مکمل طور پر محفوظ طبقہ بھی تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ یہ حویلیاں کیا تھیں؟ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء کے سمندری طوفان میں بنوں کی بے ترتیب بدنما دیواریں، بلا فرنیچر سجاوٹ، مشرقی پاکستان کے ۵ لاکھ سے زائد باشندے جاں بحق یا دی سہولتوں سے محروم، حفظان صحت سے عاری! آخر ہوئے تھے۔ ۱۹۵۴ء کے بعد کے ۱۰ برسوں کے دوران بون سی آسائشیں تھیں جن کا انہوں نے اہتمام کر رکھا تھا؟ سمندری طوفانوں سے سالانہ ۴۰ سے ۴۵ ہزار افراد موت تک معیار زندگی کا جدید تصور سامنے نہیں آیا تھا، انہی کے منہ میں جاتے رہے۔

بنگال میں کوئی بھی شخص ان تمام سنگین حقائق سے بے بنگال میں غربت اور خوش حالی میں فرق بس اتنا خبر نہیں ہے اور بے خبر رہ بھی نہیں سکتا۔ یہاں غربت کا یہ ما کہ جو خوش حال تھے وہ دن میں تین وقت دودھ، عالم ہے کہ جو لوگ صبح کا ناشتا اور دو وقت کا کھانا باقاعدگی! اول اور مچھلی پر مشتمل کھانے کا انتظام کر پاتے تھے۔

میزبانی کا تصور یہ تھا کہ مہمان کو چاول اور دالیں دے دی جاتی تھیں، جنہیں وہ خود پکاتا تھا۔ اگر مہمان راضی ہوتا تو دودھ سے بنی خام شکل کی مٹھائیاں بھی پیش کر دی جاتی تھیں۔

بنگال کے لوگوں کا مسلمانوں سے پہلی بار واسطہ تیرہویں صدی عیسوی میں پڑا جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔ بنگال کے رہنے والوں کی روایات اور مسلم فاتحین کی اقدار میں بہت واضح فرق تھا۔ مفتوح زمین کے لوگ اپنے ذات پات کے نظام اور ہزاروں سال پرانی دیگر روایات سے چمٹے رہے اور صدیوں تک حکومت کرنے والے فاتحین کی اقدار کو بہ آسانی قبول نہ کر سکے۔ جس طبقے نے مسلم فاتحین سے رابطے بڑھائے انہیں پتا چلا کہ کھانا پکانے کا فن کیا ہوتا ہے اور کھانے کے معمولات میں موزوں تبدیلی سے کس طرح زندگی کا معیار بلند کیا جاسکتا

ظلم کی رات

کبھی دراز نہ ہیں ہوتی

حسینؑ کی قربانی

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

پیوندکاری ہونے لگی اور اسلامی ریاست کا مزاج تبدیل ہونے لگا ہے اور اسلامی مملکت کی بنیادی اقدار خطرے میں ہیں تو انھوں نے وہی کچھ کیا جو اسلامی تعلیم کا عین تقاضا ہے اور اپنی قربانی سے اس کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب ہزار تالیفوں سے بھی اس کو چھپایا نہیں جاسکتا۔

دنیا میں کسی شخص سے بھی چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا اُن پڑھ شہری ہو یا دیہاتی، اگر یہ پوچھا جائے کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت کون سی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے

امام حسینؑ کی زندگی میں مسلمان ریاست کی وسعتوں میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا، جنگی فتوحات نے مسلمانوں کے دن پھیر دیے تھے، ہر جگہ دولت کی بہتات کھلی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سیدنا حسینؑ اس صورت حال پر فخر کرتے اور اللہ کا شکر بجالاتے لیکن انھوں نے جیسے ہی محسوس کیا کہ خلافت کے ادارے میں ملوکیت کی

سیدنا

۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی اور امریکی پریس

۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی کے دوران امریکی پریس، بالخصوص ٹائمز اور نیوز ویک جیسے جراند نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بنگالیوں نے بنگالیوں پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر بنگالیوں سے مراد مسلم بنگالی ہیں تو یہ بات سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ بنگال اور پاکستان کے دیگر علاقوں کی عمومی ثقافت میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ بنگالیوں کو کوئی نئی طرز زندگی اپنانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے اپنائی جانے والی صنعتی پالیسی کے نتیجے میں جدید ترین سہولتوں کے ساتھ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو بھی نئی زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ کچی مٹی سے لے ہوئے فرش کی جگہ ٹائلز نے لی۔ بانس اور گھاس پھوس کے بجائے سیمنٹ اور دیگر جدید تعمیراتی سامان کا استعمال عام ہوا۔ تنکوں کی چٹائی کی جگہ لکڑی اور وحاشات کی بنی ہوئی میز اور کرسیوں نے لی۔

سڑکوں کی تعمیر، مواصلات کے دیگر ذرائع کی ترقی، سرمایہ کاری اور صنعتی اداروں کے قیام نے زندگی ڈھانچائی بدل دیا تھا۔ پرانے اطوار کو اپنانے کا رجحان دم توڑ رہا تھا اور مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کی تنہائی خیمہ ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو غیر ملکیتوں سے رابطوں کا زیادہ موقع مل رہا تھا جن کے طور طریقے بہت مختلف تھے۔ لال منیر ہاٹ اور شانستہ مگر جیسے دور افتادہ مقامات پر ایئر پورٹس، چندرا گھونا میں پیپر مل اور کھلنا میں نیوز پرنٹ مل، صوبے بھر میں پٹ سن کی مختلف ملوں کے قیام اور ہری پور اور ٹیٹان میں گیس کی دریافت سے ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور تبدیلی کے عمل کی ابتدا بھی ہوئی۔

معیشت کو سہارا نہیں دے رہے تھے بلکہ اس علاقے سے منافع بٹور رہے تھے۔ نفرت پھیلانے والوں کا دعویٰ کہ ماضی میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب کسی بیرونی قوت کی ضرورت نہ تھی اور یہ خطہ غیر معمولی خوشحالی سے ہمکنار تھا۔ اور یہ کہ غیر بنگالیوں یا غیر ملکیتوں نے آکر مشرقی بنگال کی خوشحالی کو ختم کیا، اس کے وسائل لوٹے اور اسے غربت اور پس ماندگی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ لوگوں کو رزق رفتہ یہ سوچنے اور سمجھنے کی تحریک دی گئی کہ ان کی سرزمین زرخیز ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور یہ کہ اسے لوٹا گیا ہے۔ لوگوں کو جب بھی فرصت ملتی تھی وہ اپنی اصل مشکلات کے بارے میں دیگر زمینی حقائق کے حوالے سے بھی سوچا کرتے تھے مگر مجموعی طور پر انہیں اس قدر جذباتی کر دیا گیا کہ وہ اس تصور کو درست سمجھنے لگے کہ کبھی ان کی سرزمین خوشحال تھی اور اسے لوٹ کر ویران اور پس ماندہ بنا دیا گیا۔ ہندوستانیوں کی شہ پر سازش کرنے والوں نے لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔

ہے۔ حکمران طبقے سے انہوں نے پیر اور آئس کریم بنانے کا فن سیکھا اور کھانے کا شعور پایا۔ نئے معاشی مواقع پیدا ہونے سے معاشرے میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں اور بڑی تعداد میں غیر بنگالی مشرقی پاکستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ جدید سہولتوں نے بہت سے پرانے اور روایتی طریقوں کو خیر باد کہنے کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھیں وہ تبدیلیاں جن کے باعث بنگال میں طرز زندگی کو ”خطرہ“ لاحق تھا اور بنگالیوں کو طرح طرح کی تشویش میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ یہ دراصل بنگالیوں کا احساس کمتری تھا۔ غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت پروان چڑھنے لگی۔ مشرقی بنگال کو بڑے پیمانے پر سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں تھا۔ غیر بنگالیوں کے پاس سرمایہ بھی تھا اور مہارت بھی مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا جا رہا تھا اور لوگ انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے خلاف نفرت کو مزید پروان چڑھانے کے لیے یہ جواز تراشا گیا کہ غیر بنگالی مشرقی بنگال کی

اور اگر جان نہیں تو جہان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ جہان یعنی دنیا میں بے شمار نعمتیں ہیں۔ مطعومات کی کمی ہے نہ مشروبات کی، ملبوسات کا شمار ممکن ہے نہ باقی اسباب زندگی کا اور اس کے علاوہ موسموں کی نیرنگی، پھولوں کی خوشبو، دریاؤں کا زربوم، آبشاروں کا گرنا، چشموں کا ابلنا، تودوں کا پگھلنا، گھنگھور گھٹاؤں کا جھوم کراٹھنا، پرست پر چھائی ہوئی بادلوں کی چھاؤنی، چیزوں کے گڑے ہوئے جھنڈے، سرسوں کے پھولے ہوئے کھیت، مسکراتی ہوئی کشت زعفران، گندم کی روپہلی فصل۔ ایسی بے شمار نعمتیں اللہ نے انسان کے لیے پیدا کر رکھی ہیں لیکن ان سب کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔ جب تک زندگی ہے تو ایک نعمت سے فائدہ اٹھانے کا امکان باقی ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر نعمت بیش بہا ہے لیکن زندگی ان سب سے بڑھ کر انمول ہے۔ اس لیے کوئی شخص بھی بقا کی ہوش و حواس اپنا سر کٹوانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس عقدے کا آخر کیا حل ہے کہ جتنے پاکیزہ ترین لوگ اس دنیا میں آئے ہیں اور جن کی عظمتوں سے انسانیت کا نام روشن ہے۔ ان میں سے کوئی شخصیت گزری کہ جس نے کبھی زندگی سے پیار کیا ہو اور جس نے اپنا مقصد حیات محض زندہ رہنا قرار دیا ہو۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

حالات جدھر آدمی کو کھینچے پھرتے ہیں آدمی ادھر کو چلتا ہے۔ یہ وہ حیوانی زندگی ہے کہ جو اللہ کی پسندیدہ شخصیتوں کی زندگی سے مختلف ہے۔ وہ زندگی کو اللہ کی نعمت سمجھ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو مقصد نہیں بلکہ مقصد حیات کی ادائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جب کہیں مقصد حیات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو مقصد حیات کو بچانے کے لیے زندگی کو قربان کرنا پڑے تو ایک لمحے کے لیے تامل نہیں کرتے۔ حضرت علیؓ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا اور تلوار نیچے تک اتر گئی اور آپ نے محسوس کیا کہ اب بچنا مشکل ہے تو بے ساختہ آپ

کی زبان سے نکلا ”فرت برب الکعبة“ رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ جنگ موتہ میں یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار اور عبد اللہ بن رواحہؓ زخموں سے گھائل ہو کر گرے تو ہر ایک کی زبان سے یہی جملہ لوگوں نے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصد حیات کے مسافر اپنے سفر کو اس قدر دراز سمجھتے ہیں کہ جس کا ایک سرا دنیا کے ساتھ وابستہ ہے تو دوسرا آخرت سے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ زندگی کا سفر راستے میں ختم ہو جاتا ہے اور یہ مسافر اپنے سفر پر آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر بجز اس کے اور کوئی ارمان نہیں ہوتا کہ یہ زندگی جو اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس دین کی سر بلندی کے کام آجائے جو اس سے بھی بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ جب اس کا موقع پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

اعلیٰ اقدار اور انسانیت کی بقاء کے لیے مقصد حیات جسے دوسرے لفظوں میں دین کہا جاتا ہے (اور دین درحقیقت تمام اچھائیوں، تمام حقائق اور تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے) سب سے قیمتی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے جتنے عظیم بندے دنیا میں آئے ہیں۔ چاہے وہ اللہ کے نبی و رسول ہوں یا چاہے اس کے راستے پر چلنے والے لوگ وہ ہمیشہ انسانیت کے سرمائے کی حفاظت اور انسانیت کی بقاء کے لیے ہمیشہ اس راز کو اپنی قربانیوں کے ذریعے منکشف کرتے آئے ہیں۔ سیدنا حسینؓ نے بھی یہی احسان امت مسلمہ پر کیا اور مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ تمہارا اصل سرمایہ وہ ہے جو اس وقت خطرے میں ہے۔ اسے بچانے کے لیے اگر مجھے جان دینی پڑے یا میرے بچوں کو ذبح ہونا پڑے تو یہ کوئی بہت بڑی قیمت نہیں۔ کیونکہ میں اس جان سے گزر کر فوراً اس زندگی سے ہمکنار ہو جاؤں گا جس کو کبھی فنا نہیں اور میرے بچے بھی میرے لیے اخروی نجات اور بلندی درجات کا سبب بنیں گے لیکن میرے جان دینے سے نوع انسانی کو جو فوائد پہنچیں گے اس کا کوئی بدل نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر سیدنا حسینؓ کا سر کاٹا گیا، آپ کا خون کربلا کی ریت

زندگی کا سب سے بڑی نعمت ہونا تو ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن زندگی کا قربان ہو جانا اور اسے زندگی سے بھی بڑی نعمت سمجھنا یہ تو ایک عجیب معما ہے جس کا سمجھنا آسان نہیں لیکن امر واقع یہ ہے کہ اللہ کے تمام نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے تمام پاکیزہ لوگ جن میں سے ایک اہم فرد سیدنا حسین ابن علیؓ بھی تھے۔ دنیا پر اسی حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے آتے ہیں کہ انسان کی انسانیت اقدار انسانیت کے فروغ کا نام ہے۔ انسان بظاہر زندہ ہو لیکن اس کی انسانیت مرجائے تو اسے کوئی شخص زندہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ اس لیے وہ دنیا پر یہ راز و اشکاف کرتے ہیں کہ تم نے اپنے آپ کو سود و زیاں کے جن پیانوں میں جکڑ رکھا ہے۔ دراصل یہ زندگی کا مقصد نہیں۔ اس لیے حقیقت یہ ہے۔

برتر از اندیشہ سود زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اصل جواب تو وہی ہے کہ دنیا دارا العمل ہے دارالجزا نہیں اور دوسرے جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو جب اپنی رحمتوں اور درجات سے نوازنا چاہتا ہے تو اسے قربانیوں کے عمل سے گزارتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے قیامت کے دن جب لوگ اپنی نکالیف اور مصائب کا اجر دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج ہم بیش از بیش اس کا صلہ پاتے۔

یہ بھی امر واقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے کو قیامت پر ہی نہیں چھوڑتا بعض مرتبہ زمین پر بھی اس کا نوٹس لیتا ہے۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم نوح پر اللہ کے عذاب اس لیے ٹوٹ پڑے تھے تاکہ لوگ بالکل اللہ کے خوف سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ اسی طرح ہم شہادت حسینؓ کے سلسلے میں دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ پروردگار نے انھیں کھلی چھوٹ دے دی ہو۔ جس وقت حضرت حسینؓ پیاس سے مجبور ہو کر دریائے فرات پر پہنچے اور پانی پینا چاہتے تھے۔ اس وقت بد بخت حصین بن نمیر نے تاک کر آپ پر تیر چلایا جو آپ کے دہن مبارک پر لگا اور اس وقت آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ میں اس کا شکوہ آپ ہی سے کرتا ہوں۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ قتل حسینؓ میں شریک تھے۔ ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو۔ کوئی قتل کیا گیا، کسی کا چہرہ سخت سیاہ ہو گیا یا مسخ ہو گیا یا چند ہی روز میں سلطنت چھین گئی اور ظاہر ہے کہ یہ ان اعمال کی اصلی سزا نہیں بلکہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ جو لوگوں کی

میں جذب ہو گیا۔ بظاہر آپ کی زندگی ختم کر دی گئی اس سے جس معنوی زندگی کو دوام ملا اور حوصلوں کی جو فصل بار آور ہوئی اور اسلام کی بنیادی صداقتوں کو جو بے پناہ تائید و نصرت نصیب ہوئی اور خلافت کا تصور جس طرح دل و دماغ میں راسخ ہوا اور ملوکیت جس طرح گالی بن کر رہ گئی۔ بظاہر کامیاب ہونے والے جس طرح ناکام ہوئے اور بظاہر مارے جانے والے جس طرح سرفراز ہوئے یہ صداقتوں کے وہ قیمتی ابواب ہیں جنہوں نے صدیوں کو زندگی کی حرارت بخشی۔

اللہ کا عام قانون یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے جرم کی سزا دنیا میں نہیں دیتا۔ قیامت کا دن درحقیقت دارالجزا اور یوم الدین ہے۔ اگر دنیا میں ہی ہر نیکی بدی پر جزا و سزا کا انحصار ہوتا تو پھر قیامت کے آنے کا کوئی جواز نہ تھا اور پھر انسان کا امتحان بھی شاید مکمل نہ ہوتا کیونکہ انسان کا اصل امتحان ایمان بالغیب میں ہے۔

سیدنا حسینؓ کو اسے رسول اللہ ﷺ ہونے کے اعتبار سے نہایت ہی عزت و حرمت کے مالک تھے۔ لیکن ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور وہ بھی مسلمان کہلانے والے کے ہاتھوں، یہ ایک ایسا تکلیف دہ حادثہ ہے کہ جس کی یاد بھی دل کو دہلا دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی انسان سوچنے لگتا ہے کہ پروردگار نے ان ہاتھوں کو مغلوب کیوں نہ کر دیا جو آپ کے قتل کے لیے اٹھے تھے اور ان لوگوں پر زمین کیوں نہ پھٹ گئی۔ جنہوں نے آپ کی لاشوں کی بے حرمتی کی اور ان لوگوں پر آگ کیوں نہ برسی جنہوں نے آپ پر پانی بند کیا۔ اس کا

اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے جرم کی سزا دنیا میں نہیں دیتا۔ قیامت کا دن درحقیقت دارالجزاء اور یوم الدین ہے اگر دنیا میں ہی ہر نیکی بدی پر جزا و سزا کا انحصار ہوتا تو پھر قیامت کے آنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

عبرت کے لیے دنیا کو دکھا دیا گیا۔ ابن جوزیؒ کی روایت ہے کہ ایک بوڑھا آدمی حضرت حسینؑ کے قتل میں شریک تھا۔ وہ دفعتاً نابینا ہو گیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آستین چڑھائے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ کے سامنے چمڑے کا وہ فرش ہے جس پر کسی کو قتل کیا جاتا ہے اور اس پر قاتلان حسینؑ میں سے ۱۰ آدمیوں کی لاشیں ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے مجھے ڈانٹا اور خون حسینؑ کی ایک سلاخی میری آنکھوں میں لگا دی۔ میں صبح اٹھا تو اندھا تھا۔ جس شخص نے حضرت حسینؑ کو تیر مارا اور پانی نہیں پینے دیا، اس پر اللہ نے ایسی بیماری مسلط کر دی کہ کسی طرح پیاس بجھتی نہ تھی۔ پانی کتنا ہی پیا جائے پیاس سے تڑپتا رہتا تھا یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔

شہادت حسینؑ کے ۵ سال بعد ۲۲ ہجری میں مختار ثقفی نے قاتلان حسینؑ سے قصاص لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو عام مسلمان اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس نے اعلان عام کر دیا کہ قاتلان حسینؑ کے سوا سب کو امن دیا جاتا ہے۔ اس نے تلاش و تفتیش کے بعد ایک ایک قاتل کو گرفتار کیا۔ ایک دن میں ۲۳۸ آدمی اس جرم میں قتل کیے گئے۔ شمر ذی الجوش

حضرت حسینؑ کے بارے میں سب سے زیادہ شتی اور بد بخت تھا۔ اس کو قتل کر کے لاش کتوں کے سامنے ڈال دی گئی۔ عبداللہ بن اسید جعفی، مالک بن بشر، حمل بن مالک کا محاصرہ کر لیا تھا، انھوں نے رحم کی درخواست کی۔ مختار نے کہا ظالمو! تم نے سبط رسول ﷺ پر رحم نہ کھایا تم پر کیسے رحم کیا جائے۔ سب کو ختم کیا گیا اور مالک بن بشر نے حضرت حسینؑ کی ٹوپی اٹھائی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ، دونوں پیر قطع کر کے میدان میں ڈال دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ عثمان بن خالد اور بشیر بن شمیٹ نے مسلم بن عقیل کے قتل میں اعانت کی تھی۔ ان کو قتل کر کے جلا دیا گیا۔ عمرو بن سعد جو حضرت حسینؑ کے مقابلہ میں لشکر کی کمان کر رہا تھا اس کو قتل کر کے اس کا سر مختار کے سامنے لایا گیا۔ سنان بن انس جس نے سر مبارک کاٹنے کا اقدام کیا تھا کوفہ سے بھاگ گیا۔ اس کا گھر منہدم کر دیا گیا۔ یہ انفرادی سزائیں درحقیقت اس عظیم جرم کی سزا نہیں ہیں یہ تو صرف یہ بتانا ہے کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَ لِعَذَابِ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ** ایسا بھی ہوتا ہے عذاب۔ البتہ آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے کاش وہ سمجھ لیتے۔

عبدالملک بن عمیر لیشی کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ کے قصر امارت میں حضرت حسینؑ کا سر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا۔ پھر اسی قصر میں مختار کا سر کٹا ہوا مصعب بن زبیر کے سامنے دیکھا۔ میں نے یہ واقعہ عبدالملک سے ذکر کیا تو وہ اس قصر کو منحوس سمجھ کر یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔

ان عبرت انگیز واقعات پر غور کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ ظلم کی رات کبھی دراز نہیں ہوتی۔ مظلوم کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ ظلم کے اثرات مٹ جاتے ہیں لیکن حق کی خاطر دی ہوئی قربانی وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں اور محلی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اثرات روز بروز پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ لوگ اس قربانی کو علم بنا لیتے ہیں اور اسلام کی سرفرازی کے دن شروع ہو جاتے ہیں لیکن اگر

ہماری قریبی تاریخ میں سراج الدولہ نے موت کو لبیک کہا اور میر جعفر نے اپنے لیے زندگی کا سروسامان کیا لیکن آج تاریخ سے پوچھیے کہ تاریخ کے ایوان میں کس کا نام روشن ہے؟ اور کون مر گیا؟ انگریزوں کے مقابلے میں ایک کردار نظام حیدر آباد کن اور گول کنڈہ کے محمد علی جاہ کا ہے اور دوسرا کردار سلطان ٹیپو کا۔ پہلے دونوں کرداروں نے اپنی اور اپنی حکومت کی زندگی بظاہر دراز کی اور سلطان ٹیپو بظاہر اپنے باپ حیدر علی کی محنتوں پر بھی پانی پھیر گیا خود بھی قتل ہوا اور اپنی مملکت بھی انگریزوں کی غلام بنادی۔ لیکن آج تاریخ سے پوچھیے کہ ہندوستان کی آزادی میں نظام حیدر آباد کن کی زندگی کام آئی یا ٹیپو کا خون کام آیا۔ یہ کون تھا کہ جس کی شہادت نے غیرت و حمیت کا مفہوم واضح کیا اور وہ کون تھا جس نے آزادی کی قدر و قیمت کو دوچند کر دیا اور وہ کون تھا کہ جس نے گیدڑ کی زندگی اور شیر کی زندگی میں فرق واضح کیا۔ ٹیپو آج بھی ان صداقتوں کا امین ہے۔ اس کے مزار سے ان صداقتوں کی خوشبو آتی ہے۔ وہ آج بھی ان تمام لوگوں سے زیادہ زندہ ہے جو زندگی کو زندہ رکھنا سمجھتے ہیں۔ آج بھی ہم جب پاکستان کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں جس طرح اس کی پشت پر سید احمد شہید اور ان کے خلفاء نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سلطان ٹیپو بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ عظیم اور بیش بہا سبق ہے جو ہم کو ان شہداء کی شہادت سے ملتا ہے اور یہ درس ہمیں زیادہ توانائی اور پاکیزگی کے ساتھ سیدنا حسین ابن علیؑ نے دیا تھا۔ اس لیے محمد علی جو ہر نے کہا کہ قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دین کی حفاظت کے لیے قربانی دینے میں مضمر ہے۔ ذوالحج کا مہینا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا مہینا اور محرم کا مہینا حضرت حسینؑ کی قربانی کا مہینا ہے۔ ایک سال کا آغاز ہے اور دوسرا اختتام۔ یہ دنیا کی عظیم قربانیاں یقیناً مسلمانوں کو کوئی سبق دے رہی ہیں۔ ظفر علی خان نے جو سمجھا تھا وہ میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی جو رہا تو نام حسینؑ کا جسے زندہ رکھتا ہے کربلا اور اقبال داستان حرم کو اسی میں منحصر قرار دیتا ہے غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم ابتداء ہے اسماعیلؑ اور نہایت اس کی حسینؑ

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کی تحریر ان کی زندگی کے مشن کا عنوان ہی چاہیے۔ وہ کئی دہائیاں پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ مساجد کے سربراہ رہے۔ ریڈیو بی بی سی پر تفسیر بیان کرنا اس پر سوا تھا۔ ریڈیو نمٹ کے بعد تفسیر بھی لکھی اور باقاعدگی سے خطبات اور درس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بلند آہنگی سے بات کرنے والے مولانا کی گفتگو میں دلائل ایک خاص فطری ترتیب سے آپ کے دل سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔

سانحہ کربلا

دل پہ چھائی اداسی کی وجہ

اسلام کے نام لیوا

ایک دوسرے کے گھروں کو کربلا بنانے پر کیوں تلے ہیں؟

معروف اہل قلم، شاعر و نثر نگاروں کا خراج تحسین

فیصل شہزاد

اس کا خون وہ خون ہے، جو اعجاز شہادت حق ٹھہرا
محرم رمز رضا بھی وہی اور قبلہ اہل رضا بھی وہی!

(مختار صدیقی)

حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے جگر گوشہ جناب
امام حسینؑ حضور اکرم ﷺ کے نواسے تھے۔ آپ ﷺ کی
وفات کے وقت آپؑ کی عمر سات سال تھی۔ آپؑ کے
بڑے بھائی جناب حسنؑ تھے۔ ان دونوں بھائیوں سے
حضور اکرم ﷺ کو بے حد محبت تھی۔ چھوٹے ہوتے ان کو
کندھوں پر اٹھالیتے تھے۔ بعض اوقات نماز میں سجدہ کی
حالت میں یہ آپؑ کی کمریا گردن پر بیٹھ جاتے تو آپؑ
شفقت و محبت کی وجہ سے سجدہ لمبا کر دیتے۔

حضرت حسینؑ اپنے علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری اور
شجاعت و بہادری میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔
خلفائے راشدین کے دور میں ہونے والے جہاد اور
فتوحات شام، اردن اور عراق و ایران میں آپؑ کا بھی حصہ
ہے۔ اس کے بعد اپنے والد محترم جناب علیؑ کے ساتھ مل
کر اندرونی مخالفین کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ لیکن اس
دوران پورے اسلامی اخلاق و آداب کا پاس کیا۔

حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ کی خلافت کے بعد حضرت امیر
معاویہؓ اسلامی مملکت کے امیر بن گئے۔ ان سے امام حسینؑ
کا عزت و احترام کا معاملہ رہا لیکن وہ دنیا سے جاتے
ہوئے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ جس کی فوج نے
آپؑ کے نہ لڑنے کی پیش کش کے باوجود لڑائی مسلط کر
کے آپؑ کو خاندان سمیت میدان کربلا میں
۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو شہید کر دیا۔

☆☆

حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے

سامنے سجدہ ریز ہونا ہے

ہماری روشن اور منور اسلامی تاریخ میں لاتعداد
معروف اور غیر معروف اکابرین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں
نے اسلامی تعلیمات کے منافی کاموں پر جابر سلطین کے
سامنے مسلسل کلمہ حق کہا اور جبر، دھونس اور تحریص کے
ہتھکنڈوں کے سامنے ہتھیار پھینکنے کے بجائے اپنے موقف
پر ڈٹے رہے جس کے نتیجے میں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ
بنایا گیا اور بعض صورتوں میں انہیں جان کا نذرانہ بھی پیش
کرنا پڑا۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ جس نے طاقتور کے
سامنے کلمہ حق ادا کیا، اس نے کلمہ حق کہنے کا حق ادا کر دیا
اور سچ یہی ہے کہ ہمارے عظیم اکابرین نے اس ضمن میں
کبھی کسی مصلحت سے کام نہیں لیا! ہمارے اکابر علماء ملا
نہیں مجاہد تھے، ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہماری
تاریخ ہمیں ”ملا“ کی اذال اور ”مجاہد کی اذال“ کا فرق
صاف صاف بتاتی ہے۔

ہم جب ماضی میں جھانکتے ہیں تو جہاں اپنے ماضی پر
فخر محسوس ہوتا ہے وہاں دل پر اداسی کی کیفیت بھی طاری
ہوتی ہے۔ دل پر چھا جانے والی اداسی کا سبب یہ ہے کہ
متذکرہ شہسوار میدان جنگ میں بیشتر صورتوں میں تنہا یا
گنتی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

امام حسینؑ کے بے شمار ماننے والے خانوادہ
رسول ﷺ کو یزیدیوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھتے ہیں

اور دیواروں کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے پر اکتفا کرتے
ہیں۔ اسی طرح زین العابدینؑ کے بیٹے حضرت زیدؑ کے
حواری ان کا ساتھ عین وقت پر چھوڑ دیتے ہیں، ان کے
ساتھ صرف ڈھائی سو جاں نثار رہ جاتے ہیں، حاکم وقت
کے اہلکار حضرت زیدؑ کی پیشانی پر تیر چلاتے ہیں اور
اسلامی تاریخ کے دامن پر ایک اور خون ناحق کا داغ لگ
جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؑ کی کمر پر اعلیٰ کلمہ الحق کی
پاداش میں کوڑے برسائے جاتے ہیں اور اس کے خلاف
گوئی آواز نہیں اٹھتی، امام ابو حنیفہؒ کو جیل میں اذیتیں دی
جاتی ہیں اور کوئی گھروں سے باہر نہیں نکلتا، حضرت عبداللہ
بن زبیرؓ کی لاش تین دن تک شہر کے چوک میں لٹکی رہتی
ہے اور لوگ اس کے قریب سے آنکھ چرا کر گزر جاتے
ہیں، ملوکیت آنکھوں کو بے نور بنا دیتی ہے اور سروں میں
سے مغز نکال لیتی ہے، اس نظام میں احساس زیاں بہت
دیر بعد ہوتا ہے کافی عرصے کے بعد حضرت امام حسینؑ اور
ان کے خانوادہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف
جاں نثاروں کا ایک گروہ سامنے آتا ہے اور سارے حساب
چکاتا ہے۔ لیکن۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

تاہم اعلیٰ کلمہ الحق کے لیے اپنی جان پر کھیل
جانے والوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم اور نا انصافی
کے خلاف ڈٹ جانے والے مرکز بھی زندہ رہتے ہیں اور
طاقت کے زور پر حق کی آواز دبانے والے اور ان کے
آلہ کار بننے والے حتیٰ کہ شہر اور اس کے مکین، کوفہ اور کوفی،
رہتی دنیا تک نفرت کی علامت بن جاتے ہیں۔ اتنی
صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے نظریے کے لیے
قربانیاں دینے والے، لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں
زندہ ہیں اور ان سے اسی طرح ہدایت اور روشنی لی جاتی
ہے جس طرح وہ ہمارے درمیان زندہ موجود ہیں۔ اس
کے برعکس ان مجاہدوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوششیں
کرنے والے جابر حکمرانوں کی قبروں کے نشانات بھی

موجود نہیں ہیں، تاریخ میں ان کا نام گالی بن چکا ہے اور
ان کا مقام، مقام عبرت کے سوا کچھ نہیں!
آج بھی یہ سوال وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا
ہے کہ ہم نے حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے سامنے سجدہ
ریز ہو جانا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنی آئندہ
تاریخ کے ابواب سنہری لفظوں سے رقم کروانے ہیں یا اس
ضمن میں نامہ اعمال کی سیاہی سے ہی کام چلایا جائے گا؟
(عطا الحق قاسمی)

☆☆

غازی اونچے مرتبے والے پاک نژاد شہید
ساتھ امام کے، رسم وفا کی دے گئے داد شہید
سب کچھ پا گئے اک لمحے میں نیک نہاد شہید
میرے واسطے چھوڑ گئے بس اک فریاد شہید

(ریاض احمد)

شہادت امام حسینؑ

دنیا میں انسانی عظمت و شہرت کے ساتھ حقیقت کا
توازن بہت کم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو
شخصیتیں عظمت و تقدس اور قبول و شہرت کی بلند یوں پر پہنچ
جاتی ہیں، دنیا عموماً تاریخ سے زیادہ افسانہ اور تخیل کے
اندر انہیں ڈھونڈنا چاہتی ہے، اسی لیے فلسفہ تاریخ کے
بانی اول ابن خلدون کو یہ قاعدہ بنانا پڑا کہ جو واقعہ دنیا میں جس
قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اتنی ہی افسانہ سرائی اسے
اپنے اپنے حصار تخیل میں لے لے گی۔ ایک مغربی شاعر
گوئے نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کی
ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی عظمت کی حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ
افسانہ بن جائے۔ تاریخ اسلام میں حضرت امام حسینؑ کی
شخصیت جو اہمیت رکھتی ہے، محتاج بیان نہیں۔
خلفائے راشدینؓ کے عہد کے بعد جس واقعہ نے اسلام کی
دینی، سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا
ہے، وہ ان کی شہادت کا عظیم سانحہ ہے۔ بغیر کسی مبالغہ
کے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی المناک حادثہ پر نسل

انسانی کے اس قدر آنسو نہ بہے ہوں گے جس قدر اس حادثہ پر بہے ہیں۔ پچھلے کئی سو برسوں سے ہر محرم اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہا۔ امام حسینؑ کے جسم خونچکاں سے دشت کربلا میں جس قدر خون بہا تھا، اس کے ایک ایک قطرے کے بدلے دنیا اشک ہائے ماتم و الم کا ایک ایک سیلاب بہا چکی ہے۔

(ابوالکلام آزاد)

☆☆

خلافت و ملوکیت کی ٹکر

حضرت امام حسینؑ نے ایک اصولی موقف پر اپنی جان کی بازی لگا دی اور بلاشبہ یہ انہی کو زیب دیتا تھا کہ ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین اور مسلمانوں کے اجتماعی مقصد کے لیے جان کی بازی لگائیں۔ شہادت امیر حمزہؑ کو بھی ملی اور شہید حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ بھی ہوئے اور شہید تو خود حضرت حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور برادر بزرگ امام حسنؑ بھی ہوئے لیکن ہماری ملی تاریخ میں شہادت کا سرخ رنگ جس قدر حضرت حسینؑ کا نکھر کر تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن گیا ہے، اتنا نکھاں شاید اور کسی شہادت کو میسر نہیں آیا ہے۔ یہ عظیم حادثہ دراصل خلافت و ملوکیت کی ٹکر تھی جس میں خلافت کے اصولوں کو چکنا چور کر دیا گیا اور وراثتی ملوکیت اور شخصی حکومت مسلمانوں پر غالب آگئی اور پھر آج تک امت نظام خلافت کے لیے ترس رہی ہے۔ سیدنا حضرت امام حسینؑ نے جو کچھ کیا وہ قیام ”حکومت الہیہ“ کے لیے کیا۔ مسلمان سے قرآن کا یہ پہلا مطالبہ ہے۔ قرآن نے خالص خدا پرستی کا جو سبق دیا ہے حضرت امام حسینؑ نے اس کی روح کو سمجھا اور بدرجہ اتم پورا کیا اس لیے آپ کی محبت یہ ہے کہ آپ کی اس سنت کو فراموش نہ کیا جائے اور جو کچھ آپ کے نام سے کیا جائے خدا پرستی کے لیے کیا جائے۔

☆☆

(سید اسعد گیلانی)

سانحہ کربلا

بلاشبہ ۶۱ ہجری میں کربلا کے مقام پر جو واقعہ پیش آیا اس میں شامل افراد رتبے کے اعتبار سے بہت عظیم اور قیمتی تھے اور اس واقعے میں انہوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ رہتی دنیا تک اہل حق کے لیے ایک روشن مثال رہے گا کہ امام عالی مقامؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے جس رسم کا آغاز کیا تھا اس سے نہ صرف اسلامی تاریخ کے ایک روشن باب کا آغاز ہوا بلکہ اہل دنیا کو بھی آزادی رائے اور انسانی حقوق کا وہ سبق ملا جس کے باعث اہل یورپ نے سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں وہ راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے آج ہر طرف جمہوریت کا بول بالا ہے اور انسانی حقوق کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

امام عالی مقامؑ تمام مسلمانوں کے لیے لائق عزت و احترام ہیں اور ان کی شہادت ہر کلمہ گو کے لیے راہ حق میں دی جانے والی سب سے بڑی قربانی ہے تو پھر ہم عقیدے کے نام پر مختلف جماعتوں میں بٹ کر جو ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں کیا یہ اس عظیم شخصیت کی بے مثال قربانی کی توہین کے مترادف نہیں! مولانا محمد علی جوہر نے تو کہا تھا کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد..... یہ کیسا اسلام ہے جس کے نام لیوا ایک دوسرے کے گھروں کو کربلا بنانے پر تلے ہوئے ہیں!!

(امجد اسلام امجد)

☆☆

اے لوگو یہ جال تو دیکھو، دونوں جہاں کا امام اس کے ساتھی صرف بہتر، باقی سپاہِ شام نیزے، بھالے، تیر، کمائیں جھک جھک کریں سلام روئیں سچے موتی ایسی، جسم ہیں لالہ فام

(ریاض احمد)

حضرت امام حسینؑ کی

سنہری باتیں

خاور ساحل

☆ خوشامد تیرے تکبر کا ختم ہے۔

☆ ذلیل وہ ہے جو بخیل ہے۔

☆ غرور کا سر ہمیشہ نیچے ہوتا ہے۔

☆ زبان کی حفاظت بہترین عبادت ہے۔

☆ جب پیسا بولتا ہے تو سچائی ختم ہو جاتی ہے۔

☆ ایمان کے لیے خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔

☆ اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو غم بھی نہ دو۔

☆ ایماندار وہی ہے جو آخرت کے لیے توشہ جمع کرے۔

☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

☆ جس شے کا وجود نہیں اُسے ہم اعتماد سے پیدا نہیں کر سکتے۔

☆ شکم سیری بیماری کی جڑ اور پرہیز سازی بیماری کا علاج ہے۔

☆ اس چیز کے پیچھے نہ بھاگو، جسے تم سمجھ نہیں سکتے یا پانہیں سکتے۔

☆ سردار بننا چاہتے ہو تو حرکت و عمل اور جدوجہد کو اپنا معمول بناؤ۔

☆ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔

☆ انسان کو بادل ہونا چاہیے جو پھولوں کے علاوہ کانٹوں پر بھی برستا ہے۔

☆ دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے غیرت اور آبرو کو برقرار رکھو۔

☆ جو لوگ تمھارے دوست بننا چاہتے ہیں اُن کے دوست بنو، عادل کہلاؤ گے۔

☆ ملامتِ خلق کا شکوہ نہ کر کہ ذاتِ حق بھی زبانِ خلق سے محفوظ و سلامت نہیں رہی ہے۔

☆ وہ سب رخصت ہو گئے جن سے محبت تھی اور اب میں ان لوگوں میں ہوں جو مجھے پسند نہیں۔

☆ دنیا میں سب سے کمزور وہ ہے جو اپنی خواہش پر قابو نہ رکھتا ہو۔ قوی وہ ہے جو ضبط کی قوت رکھتا ہے۔

رشتوں کا سب سے زیادہ لحاظ کرنے والے اور اہل و عیال کے ساتھ جڑ کر رہنے والے

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب

ایک سخی کا قصہ دلپذیر
خدا کے رسولؐ بھی ان کی خوبیوں کا ذکر جمیل فرماتے

ہلاکت

کے سال ”عام الرمادہ“ میں جب انسان و حیوان اور نباتات و جمادات سخت قحط کا شکار ہو گئے تو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کھلی فضا میں مسلمانوں کے ساتھ نماز استسقا پڑھنے اور اللہ رحیم و کریم سے باران رحمت کے لیے گڑگڑا کر دعا کرنے کے لیے باہر نکلے۔ پھر حضرت عمرؓ ایک مقام پر کھڑے ہو گئے اور اپنے دائیں ہاتھ سے حضرت عباسؓ کا دایاں ہاتھ تھام کر آسمان کی طرف بلند کر کے دعا گو ہوئے:

”اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبیؐ کی وساطت سے تجھ سے بارش کی دعا کرتے تھے اور اس وقت نبیؐ

ہمارے درمیان موجود تھے۔ اللہ! آج ہم تیرے نبیؐ کے چچا کی وساطت سے بارش طلب کرتے ہیں، اللہ! ہم پر بارش برسا!“

مسلمان ابھی یہاں سے ہل نہیں پائے تھے کہ بارش آ گئی اور اس قدر برسی کے چہروں پر تازگی کی لہر دوڑادی، ہر طرف پانی پانی کر دیا اور زمین کو سرسبز و شاداب کر ڈالا۔ صحابہؓ حضرت عباسؓ کے پاس گئے، ان سے بغل گیر ہونے لگے، ان کی پیشانی کے بوسے لینے لگے اور یہ کہتے ہوئے ان کو بابرکت قرار دینے لگے:

”اے (اہل) حرمین کی پیاس بجھانے والے شکر یہ!“

☆ ☆

حضرت عباسؓ جس قدر رسول اللہؐ سے محبت

رکھتے تھے رسول اللہؐ بھی اسی قدر ان کو عزت و اکرام دیتے تھے۔ آپؐ ان کی تعریف و ستائش کرتے اور ان کی خوبیوں کا ذکر جمیل فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ فرماتے:

”یہ میرے باپ دادا کی نشانی ہیں۔“

”یہ عباسؓ بن عبدالمطلب ہیں قریش کے سب سے بڑے نخی اور رشتوں کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنے والے۔“

جس طرح حضرت حمزہؓ رسول اللہؐ کے چچا بھی تھے اور ہم جولی بھی، اسی طرح حضرت عباسؓ آپؐ کے چچا بھی تھے اور ہم عمر بھی۔

رسول اللہؐ اور حضرت عباسؓ کی عمروں میں دو یا ۳ سال کا فرق ہے، حضرت عباسؓ رسول اللہؐ سے ۳ سال بڑے تھے۔ اس طرح رسول اللہؐ اور آپؐ کے چچا عباسؓ ایک ہی عمر کے بچے اور ایک ہی نسل کے جوان تھے۔ ایک اور چیز جس کو انسانیت کے پرکھنے میں نبیؐ کے نزدیک ہمیشہ اولین حیثیت حاصل رہی وہ حضرت عباسؓ کا اخلاق اور اچھی صفات تھیں۔

حضرت عباسؓ نخی تھے، بہت بڑے نخی..... گویا وہ ان اچھی خوبیوں کے بھی چچا ہی تھے۔ آپؓ رشتہ داروں اور اہل و عیال کے ساتھ جڑ کر رہنے والے انسان تھے۔ ان دونوں کے رشتوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؓ اپنے مال و متاع یا سعی و جہد اور اثر و رسوخ میں سے کسی بھی اعتبار سے نخل نہیں کرتے تھے۔ آپؓ عام رشتہ داری اور خاندانی قرابت داری کے معاملے میں حد درجہ دانشمندی سے کام لیتے تھے۔ آپؓ کی اسی دانشمندی و ذہانت نے آپؓ کو قریش کے درمیان بلند مقام سے سرفراز کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہؐ نے دعوت کا برملا اظہار کیا تو حضرت عباسؓ اس قابل تھے کہ رسول اللہؐ کو پہنچائی جانے والی بہت سی تکلیفوں کو آپؓ سے رفع کر سکیں۔

☆ ☆

رسول اللہؐ کے خادم حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں:

”میں عباسؓ بن عبدالمطلب کا نوکر تھا اور اس وقت اسلام اس گھر کے افراد میں داخل ہو چکا تھا۔ عباسؓ

ایک اور چیز جس کو انسانیت کے پرکھنے میں نبیؐ کے نزدیک ہمیشہ اولین حیثیت حاصل رہی وہ حضرت عباسؓ کا اخلاق اور اچھی صفات تھیں

مسلمان ہو گئے، ان کی بیوی ام فضل مسلمان ہو گئیں اور میں بھی مسلمان ہو گیا مگر عباسؓ اپنا اسلام چھپا کر رکھتے تھے۔“

حضرت ابورافعؓ کی یہ روایت غزوہ بدر سے قبل حضرت عباسؓ کے قبولیت اسلام کی وضاحت کرتی ہے۔ رہی بات ہجرت نبویؐ کے بعد مکہ میں ان کے ٹھہرے رہنے کی تو یہ ایک ایسی حکمت عملی تھی جس نے بہترین طریقے سے اپنے اہداف کو حاصل کیا۔

قریش حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے ارادوں میں شکوک و شبہات کو کب چھپا رہے دے سکتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ جناب عباسؓ کے مقابل میں آنے کا بھی ان کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ بظاہر ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اسی دین اور طریقے پر تھے جس کو قریش پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوہ بدر کا موقع آگیا اور قریش کو حضرت عباسؓ کے دل میں چھپے ارادوں کا امتحان لینے کا موقع مل گیا۔ جناب عباسؓ قریش کی اس مکروہ تدبیر سے بھلا کب لاعلم رہنے والے تھے۔

آپؓ اگرچہ قریش کی حرکات و سکنات کی خبریں مدینہ میں رسول اللہؐ کو پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن قریش بھی عنقریب انھیں اس معرکہ میں شرکت کے لیے نکال باہر لانے میں کامیاب ٹھہرنے والے تھے جس معرکہ میں شرکت پر جناب عباسؓ ایمان رکھتے تھے نہ کوئی ارادہ۔ تاہم یہ جنگ جناب عباسؓ کے لیے ایک مقررہ

حضرت حمزہ قریش کے ظلم و عدوان اور ابوجہل کی درشتیوں کا علاج اپنی ”منا ڈالنے والی تلوار“ کے ذریعے کرتے تھے جبکہ حضرت عباسؓ اپنی ذہانت و ہوشیاری اور تدبیر کو استعمال میں لاتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے اسلام کو اسی طرح نفع پہنچایا جس طرح دفاع کرنے والی تلواروں نے اسلام کی حمایت و حفاظت کا حق ادا کیا۔

متعین کامیابی تھی جو انہی قریش کے لیے ہی تباہی و بربادی لانے والی تھی۔

غزوہ بدر میں دونوں طاقتیں آمنے سامنے آتی ہیں اور تلواریں ہر گروہ اور فریق کے انجام کا تعین کرتے ہوئے پوری خوفناکی کے ساتھ آپس میں ٹکرانے کے لیے تیار ہیں۔ رسول اللہؐ اپنے اصحاب کو مخاطب فرماتے ہیں: ”کچھ بنو ہاشم سے اور کچھ بنو ہاشم کے علاوہ لوگ مجبور کر کے نکالے گئے ہیں، انھیں ہمارے ساتھ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان میں سے کسی کا سامنا تم میں سے کسی کے ساتھ ہو جائے تو وہ اسے قتل نہ کرے۔ جو شخص ابوالہتیری بن ہشام بن حارث بن اسد کو پائے وہ اسے قتل نہ کرے۔

اور جو عباسؓ بن عبدالمطلب کو پالے وہ بھی ان کو قتل نہ کرے، ان کو تو مجبور کر کے جنگ میں لایا گیا ہے۔“

رسول اللہؐ اس حکم کے ساتھ اپنے چچا عباسؓ کی کسی خوبی کو مخصوص نہیں کر رہے تھے، خوبیاں بیان کرنے کا یہ موقع تھا نہ وقت۔ اگر رسول اللہؐ کے نزدیک آپ کے چچا مشرکین میں سے ہوتے تو آپ ایسے نہ تھے کہ اپنے صحابہ کے سروں کو میدان جنگ میں متحرک دیکھتے اور پھر بھی اپنے چچا کے لیے سفارش کرتے..... اللہ اکبر رسول اللہؐ کے چچا ابوطالب جن کی آپ اور اسلام کے لیے بہت سی قربانیاں تھیں، رسول اللہؐ کو اس چچا کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ عقل و شعور کا فیصلہ یہی ہے کہ ایسا رسول اللہؐ غزوہ بدر میں جائے تو اپنے مشرک آباء و اخوان کو قتل کرنے والوں سے کہے کہ میرے چچا کو قتل نہ کرنا۔

ہم اس گفتگو کا بیان وفد کے ارکان میں سے ہی ایک رکن پر چھوڑتے ہیں۔ یہ رکن وفد حضرت کعب بن مالکؓ ہیں، فرماتے ہیں:

”ہم گھائی کے اندر بیٹھے تھے، رسول اللہؐ کا انتظار کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ ہمارے پاس آگئے اور آپ کے ساتھ عباسؓ بن عبدالمطلب تھے۔ عباسؓ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا ”اے خزرج! تمہیں معلوم ہے کہ محمدؐ ہم میں سے ہیں اور ہم نے ان کو اپنی قوم سے اس طرح بچا کر رکھا ہے کہ وہ اپنی قوم میں ایک معزز و باوقار حیثیت رکھتے ہیں اور علاقے میں محفوظ بھی ہیں لیکن وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جس چیز کی طرف تم نے انھیں بلایا ہے اس سے وفاداری کرو گے اور انھیں ہر اس شخص سے بچا لو گے جو ان کی مخالفت کرے گا تو پھر تم جو کر رہے ہو خوشی سے کرو۔“

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ان کو اپنے پاس لے جا کر بے یار و مددگار چھوڑ دو گے اور انھیں رسوا کرو گے تو پھر ابھی سے پیچھے ہٹ جاؤ اور انھیں نہ لے جاؤ۔“ جناب عباسؓ اپنے یہ کاٹ دار اور فیصلہ کن الفاظ کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھیں انصار کے چہروں پر گڑی تھیں۔ آپ اپنی باتوں کے جواب اور ان کے فوری رد عمل کا انتظار کر رہے تھے۔

حضرت عباسؓ کی عظیم ذہانت عملی ذہانت ہونے کی بنا پر مادی میدان میں حقیقت کا احاطہ کر لیتی تھی، وہ ایک باخبر نگران اور تفتیش کار کی طرح دور دور تک حقیقت کا پیچھا کرتے تھے، لہذا آپ نے اسی گفتگو پر اکتفا نہ کیا بلکہ انصار سے ایک اہم سوال کر کے بات کو نئے سرے سے شروع کیا ”مجھے بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے کس طرح جنگ کرتے ہو؟“

حضرت عباسؓ اپنی ذہانت اور قریش کے ساتھ اپنے تجربے کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ اسلام اور شرک کے درمیان جنگ ناگزیر ہے، کیونکہ قریش بھی اپنے عناد،

آپ ﷺ سے پوچھا گیا
آپ کو اللہ تعالیٰ نے
فتح عظیم سے سرفراز فرمایا
ہے پھر کیوں سو نہیں سکے؟
تو آپ ﷺ نے جواب دیا
”مجھے بیڑیوں میں جکڑے
عباسؓ کی کراہیں سنائی
دے رہی تھیں“

سرداری اور دین کو چھوڑ نہیں سکتے اور اسلام جو ہمیشہ حق ہوتا ہے وہ کبھی باطل کے لیے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ تو کیا انصار جو اہل مدینہ ہیں، مستقبل میں پیش آنے والی اس جنگ کے متحمل ہو سکیں گے؟ اور کیا وہ کزوہ اور جنگ کے ماہر قریش کے تکنیکی اعتبار سے ہم پلہ ہو سکتے ہیں؟ یہی وجہ تھی کہ آپ نے انصار سے مذکورہ سوال کیا۔

انصار بھی وہ لوگ تھے جو جناب عباسؓ کی گفتگو پر ہمد تن گوش تھے گویا وہ انسانی چٹائیں ہوں۔ حضرت عباسؓ اپنی گفتگو سے فارغ ہوئے تو انصار نے بات شروع کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام نے جناب عباسؓ کے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”ہم..... اللہ کی قسم..... اہل حرب ہیں، ہمیں جنگ کی غذا دی گئی ہے، اس کا عادی بنایا گیا ہے اور اپنے آباء سے نسل در نسل ہمیں یہ وراثت میں ملی ہے۔

ہم تیروں کے ذریعے تیر اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ تیر ختم ہو جاتے ہیں۔

پھر ہم نیزوں کے ذریعے نیزہ زنی کرتے ہیں، یہاں تک کہ نیزے ٹوٹ گرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جس روز غزوہ بدر اپنے انجام کو پہنچا اور آپؐ کے چچا نے حالت اسیری میں رات گزاری تو آپؐ رات بھر سو نہ سکے۔ جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم سے سرفراز فرمایا ہے پھر کیوں سو نہیں سکے؟ تو آپؐ نے جواب دیا:

”مجھے بیڑیوں میں جکڑے عباسؓ کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔“

کسی مسلمان نے آپؐ کے یہ الفاظ سنے تو فوراً قیدیوں میں جا کر حضرت عباسؓ کی مشکیں ڈھیلی کر دیں اور آ کر خبر دی کہ: یا رسول اللہ ﷺ میں نے عباسؓ کی بیڑیاں کچھ ڈھیلی کر دی ہیں۔

لیکن صرف ایک عباسؓ کی ہی بیڑیاں کیوں ڈھیلی کی گئی ہیں۔

آپؐ نے اپنے صحابی کو حکم دیا: ”جاؤ اور تمام قیدیوں کے ساتھ یہ نرمی کر دو۔“

جب قیدیوں سے فدیہ لینا طے ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا: ”عباسؓ! اپنا، اپنے بھائی کے بیٹے عقیل بن ابی طالب کا، نوفل بن حارث کا، بنی حارث بن فہر کے بھائی اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو، تم مالدار ہو۔“

حضرت عباسؓ کا ارادہ تھا کہ بغیر فدیہ کے ہی اپنی قید ختم کرالوں، لہذا آپؐ سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ میں تو مسلمان ہوں، میری قوم مجھے مجبور کر کے لے آئی!“

لیکن رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لینے پر اصرار کیا، اس موقع پر قرآن مجید بھی نازل ہوا جو حضرت عباسؓ کے دل کی کیفیت پر ایک مبلغ تبصرہ بھی ہے اور خوشخبری بھی:

”اے نبیؐ، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں اُن سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کر دے گا، اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔“

اس طرح حضرت عباسؓ نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا فدیہ دیا اور مکہ کی راہ لی۔ اس کے بعد قریش انہیں ان کی عقل و دانش اور دین و ہدایت کے معاملے میں دھوکا نہ دے سکے۔

آپؐ نے اپنا مال و متاع اکٹھا کیا اور خیبر کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے جا ملے تاکہ قافلہ اسلام میں شریک ہو سکیں۔ اس طرح آپؓ مسلمانوں کی طرف سے عظیم اکرام و محبت کا مرکز قرار پائے کیونکہ مسلمان رسول اللہ کی ان کے ساتھ محبت و تکریم اور آپؓ کے فرمان سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپؐ نے فرمایا ہے:

”لوگو! سن لو کہ عباسؓ میرے لیے باپ کی جگہ ہیں، جس نے عباسؓ کو تکلیف دی گویا اس نے مجھے دی۔“

حضرت عباسؓ کو اللہ نے بڑی بابرکت اولاد کا باپ بنایا، خیر امت حضرت عبداللہ آپؓ کے بیٹوں میں سے ایک ہیں۔

تاریخی اور عظیم گفتگو ہوئی۔

☆☆

ہجرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آنکھوں پر برسی یعنی اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اپنے دین اور رسول ﷺ کے لیے فتح کر دیا تھا۔ جزیرہ عرب کے بعض سردار قسم کے قبائل پر یہ گراں گزرا کہ ایک بالکل نیا دین اس تیزی کے ساتھ اس قدر بڑی فتح حاصل کر لے۔ لہذا ہوازن، ثقیف، نضر، جشم اور دوسرے قبائل اکٹھے ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ

پھر ہم تلواریں لے کر نکلتے ہیں اور تلوار زنی کرتے ہیں یہاں تک کہ ہم میں سے جو پہلے موت کے منہ میں جانے والا ہوتا ہے وہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے یا پھر ہمارا دشمن موت کا شکار ہو جاتا ہے۔“

حضرت عباسؓ نے خوش ہو کر جواب دیا: ”پھر تو تم اہل حرب ہو، کیا تمہارے پاس زر ہیں بھی ہیں؟“

انصار نے جواب دیا: ”ہاں..... ہمارے پاس پورے جسم کو ڈھانکنے والی زر ہیں۔“

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور انصار کے درمیان

برپا کرنا طے کر لیا۔

یہاں لفظ ”قبائل“ سے ان جنگوں کی کیفیت کے بارے میں دھوکا نہیں کھانا چاہیے جن میں رسول اللہ ﷺ ساری زندگی مشغول رہے کہ یہ تو بس چھوٹے چھوٹے پہاڑی قبیلوں کی جھڑپیں تھیں، کوئی بڑی جنگیں نہ تھیں جو یہ قبائل اپنے قلعوں میں لڑتے تھے۔

یہ قبائل شدید ترین جنگجوؤں کی بے شمار صفوں کی صورت جمع ہو گئے۔ مسلمان ۱۲ ہزار کی تعداد میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے۔

۱۲ ہزار.....؟ کن لوگوں میں سے ۱۲ ہزار.....؟

ان لوگوں میں سے جنھوں نے ابھی کل ہی مکہ فتح کیا تھا اور بت اور بت پرستی کو اس کی آخری اور بدترین جگہ پر پہنچا دیا تھا، ان کشور کشاؤں کے پرچم آسمان کے افق پر اس طرح بلند ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے کوئی قوت مزاحمت نہ کر رہی تھی۔

یہ سوچ کچھ غرور پیدا کر دیتی ہے اور مسلمان شر کے آخری پھیر میں آجاتے ہیں۔ اس سوچ کی وجہ سے وہ فخر و تکبر کا شکار ہو گئے جو ان کی کثرت تعداد اور مکہ کی فتح نے پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ دیا: ”اب ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔“

جب آسمان انھیں جنگ سے بڑے اور اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کر رہا تھا، اس وقت ان کا اپنی عسکری قوت اور جنگی فتح کے غرے میں آجانا ایک نامناسب عمل تھا جس سے انھیں جس قدر جلد ممکن ہو سکتا نجات دلانا ضروری تھا خواہ یہ نجات صدمہ پہنچا کر دلائی جائے۔

یہ صدمہ شافیہ لڑائی کے آغاز میں بہت بڑی شکست کی صورت میں رونما ہوا۔ یہاں تک کہ مسلمان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور آپس کے دامنوں کو چھوڑ کر اللہ کے دامن سے چٹ گئے، اپنی قوت پر بھروسے کو چھوڑ کر اللہ کی قوت پر توکل کرنے لگے۔ تب جا کر یہ شکست فتح میں بدلی اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں:

”اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوہ حنین کے روز (اس کی دشگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اُس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ﷺ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔“ (التوبہ: ۲۵، ۲۶)

اس روز حضرت عباسؓ کی آواز اور ثابت قدمی سکینت و بہادری کے نمایاں ترین مظاہر میں سے ایک مظہر تھا۔ ہوا یوں کہ مسلمان اپنے دشمن کی آمد کے انتظار میں تہامہ کی ایک وادی میں جمع ہونے والے تھے کہ مشرکین ان سے پہلے ہی وادی میں پہنچ گئے اور وادی کے نشیب و فراز میں گھاتیں لگا کر بیٹھ گئے اور اچانک مسلمانوں پر بھرپور حملہ کیا اور انھیں اس قدر خوفزدگی کے عالم میں دور تک مار بھگایا کہ کوئی مسلمان پیچھے مڑ کر دوسرے مسلمان کو نہیں دیکھتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اچانک حملہ آور ہونے والے دشمن کی یہ کارروائی دیکھی تو فوراً اپنے سفید خنجر پر سوار ہوئے اور باواز بلند پکارنے لگے:

”لوگو بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف واپس آجاؤ۔ یہ ہرگز جھوٹ نہیں کہ میں نبی ہوں، میں عبدالمطلب کا پوتا ہوں۔“

اس لمحے نبی ﷺ کے ارد گرد ابو بکرؓ، عمرؓ، علیؓ بن ابوطالبؓ، عباسؓ بن عبدالمطلبؓ، عباسؓ کے بیٹے فضلؓ، جعفرؓ ابی طالبؓ، ربیعہؓ بن حارثؓ، اسامہؓ بن زیدؓ، ایمنؓ بن عیینہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھوڑی سی نفری موجود تھی۔

اس موقع پر یہاں ایک خاتون تھیں، جنھوں نے اپنی شجاعت و بسالت سے بہادروں کے درمیان بلند مقام پایا۔ یہ خاتون ”ام سلمہ بنت ملحان“ رضی اللہ عنہا تھیں۔

دیا کہ لوگوں کو بلند آواز سے بلاؤ۔ چونکہ حضرت عباسؓ بھاری جسم کے آدمی ہی نہ تھے بلکہ بلند آہنگ بھی تھے آپؓ نے لوگوں کو بلانا شروع کیا ”اے انصاریو! اے بیعت والو۔“

یہ آواز جونہی اچانک حملہ سے بھاگ اٹھنے والے اور وادی میں ادھر ادھر منتشر ہو جانے والے لوگوں کے کانوں سے ٹکرائی تو ان سب نے بیک آواز جواب دیا ”ہم حاضر ہیں۔“

یہ سارے لوگ آندھی کے مانند تیزی سے واپس آئے یہاں تک کہ اگر کسی کا اونٹ یا گھوڑا اڑ گیا تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنے تیرکمان اور زرہ اٹھائے پیدل ہی اس طرف بھاگنا شروع ہو گیا جہاں سے جناب عباسؓ کی آواز آرہی تھی۔

اب معرکہ نئے سرے سے اپنی سختی اور خوفناکی کے ساتھ شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے آواز بلند فرمائی ”میدان اب گرم ہوا ہے۔“

میدان گرم ہوا تو ہوا زن و ثقیف کے جنگجو ڈھم ہوئے، اللہ کا لشکر لات کے جتھوں پر غالب آیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مومنوں پر اپنی سکینے نازل فرمائی۔

☆☆

۱۴ رجب بروز جمعہ ۳۲ ہجری کو مدینہ کے باشندوں نے کسی اعلان کرنے والے کو یہ اعلان کرتے سنا کہ ”اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے عباسؓ بن عبدالمطلب کو دیکھا۔“ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عباسؓ وفات پا گئے ہیں۔ جناب عباسؓ کے جنازے میں اس قدر عظیم تعداد میں لوگ نکلے کہ مدینہ نے اس سے پہلے اس کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ خلیفہ مسلمین حضرت عثمانؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مدینے کے قبرستان بقیع میں ابوالفضل جناب عباسؓ بن عبدالمطلب کا جسد محو استراحت ہے۔ آپؓ ان نیک لوگوں کے ساتھ محو خواب ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کیا۔

رسول اللہؐ نے اپنے چچا سے فرمایا
”عباسؓ! اپنا، اپنے بھائی کے
بیٹے عقیل بن ابی طالب کا،
نوفل بن حارث کا، بنی حارث
بن فہر کے بھائی اور اپنے حلیف
عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو
تم مالدار ہو“

=====

انہوں نے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو فوراً اپنے خاوند ابوطحہ کے اونٹ پر سوار ہوئیں اور اسے بھگاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئیں۔ ان دنوں یہ عظیم خاتون اپنے رحم میں کسی خوش نصیب کی پرورش کر رہی تھیں۔ اونٹ کے بھاگنے کی وجہ سے بچے نے رحم کے اندر حرکت کی تو انہوں نے اپنی چادر اُتار کر مضبوطی سے پیٹ پر باندھ لی اور ہاتھ میں خنجر لہراتے ہوئے جب خدمت رسول ﷺ میں پہنچیں تو آپؐ مسکرا دیے پھر فرمایا ”ام سلیمؓ ہے؟“ انہوں نے جواب دیا ”ہاں۔۔۔۔۔ یا رسول اللہ ﷺ“ آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! ان لوگوں کو قتل کر ڈالے جو آپؐ کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، جس طرح آپؐ ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو آپؐ کے ساتھ جنگ کر رہے ہوں۔ یہ اسی لائق ہیں۔“

چہرہ رسالت پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ام سلیمؓ سے فرمایا ”اے ام سلیمؓ ان کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔“

اس موقع پر جبکہ رسول اللہ ﷺ ایسے سخت حالات میں تھے حضرت عباسؓ آپؐ کے پہلو بلکہ آپؐ کے قدموں میں کھڑے آپؐ کے خنجر کی لگام پکڑے موت اور خطرے کو مقابلے کا چیلنج کر رہے تھے! رسول اللہ ﷺ نے آپؐ کو حکم

اس تک پہنچنے میں دو ماہ لگے۔ یہ ایک حیرت انگیز آدمی سے ملاقات تھی۔ کسی افسانوی کردار دالیم (ڈھاکا کا انار) جیسی انوکھی اور یادگار۔ ڈھاکا کا میجر شریف الحق دالیم معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے دادا اور نانا ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس میں شریک تھے۔ وہ دسویں میں تھا تو اپنی بہادری اور جارج طبیعت کی وجہ سے ڈھاکا کے سائیکل رکشا چلانے والوں کا صدر بن چکا تھا۔

دالیم نے ۱۹۶۳ء میں پاکستان ایئر فورس میں شمولیت اختیار کر لی اور رسالپور اکیڈمی سے پائلٹ بن کر نکلا۔ ۶۵ء کی جنگ میں اپنے ساتھی شاہینوں سے سرمنی عقاب کا خطاب پایا۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد طبی بنیادوں پر اس کے پاس گراؤنڈ ہونے کا بھی آپشن تھا مگر اس نے پاک آرمی کو اپنے خوابوں کا مرکز بنالیا۔

۱۹۶۶ء کو اپنے لڑاکا جہاز کے کاک پیٹ سے نکلا اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کیڈٹوں میں جا کھڑا ہوا۔ وہاں گزرے شب و روز نے اس کو اکیڈمی کے نمایاں افسروں میں شامل کر دیا۔ اس کے بیچ کے ۲۲ لڑکے جنرل کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچے۔ سندر بن کے رائل ٹائیگر کی سی چستی اور پارے جیسی سیماب صفت شخصیت کا مالک دالیم دوست بنانے اور دوستی نبھانے میں بہت مشہور تھا۔

کاکول کے خوبصورت گراؤنڈ میں وہ آخری بانکا بنگالی بنالین سارجنٹ تھا۔ زیر تربیت کیڈٹوں کو صلاحیت کی بنیاد پر طے عہدوں میں بنالین سارجنٹ میجر تیسرا بڑا عہدہ تھا جو اس کی پہچان بنا۔ برفانی بھیڑیے کی سی خو لیے وہ اپنے گروپ کے لڑکوں کے لیے کسی سے بھی بھڑکتا تھا۔

اس کے دوست اسے ناقابل شکست اور باکسنگ رنگ کا محمد علی اور اسکے ستائے ہوئے اسے پی ایم اے کا جگا، ڈھاکا کا بد معاش ”ایٹلا دی ہن“ کہتے لیکن ایک بات پر بھی متفق ہیں کہ جنرل یحییٰ خاں اور اس کے ۳ رکنی فوجی ٹولے..... جنرل پیرزادہ، میجر جنرل رحیم اور میجر جنرل کریم نے ڈھاکا

کی سرزمین پر جنرل ٹکا خاں کی سربراہی میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات بندوق اور ٹینک کے ذریعے عوامی سیاسی تحریک کو کچلنے کے لیے فوجی ایکشن کا سہارا نہ لیا ہوتا اور وہ رات اپنے ہی بنگالی فوجیوں اور سولیلین کے خون سے سیاہ تر نہ ہو گئی ہوتی اور میجر شریف الحق دالیم اپنے ۲ ساتھیوں سمیت کوئٹہ گریڈن سے ۱۳ اپریل ۱۹۷۱ء کی شب روانہ ہو کر بہاولنگر سے سرحد پار کر کے ہندوستان نہ چلا جاتا تو یقیناً ۳۸ روپے پی ایم اے کے جرنیلوں میں سے ایک ہوتا۔

وہ زندگی بھر کسی نہ کسی مشن سے وابستہ رہا۔ اس کے اندر کی سیماب صفتی نے اسے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کلکتہ کے مجب نگر میں قائم بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے صدر، وزیر اعظم اور مکتی باہنی کے کمانڈر ان چیف کرنل عثمانی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کیونکہ وہ کبھی اسے کسی نہ کسی حوالے سے جانتے اور عزیز رکھتے تھے۔

اس نے فرار میں شریک اپنے ساتھی لیفٹیننٹ نور کو کرنل عثمانی کے ملٹری سیکریٹری کے طور پر چھوڑا اور خود تیسری بنگال رجمنٹ کے لیفٹیننٹ مطیع الرحمن موتی کے ساتھ آگ اور بارود سے ڈھکی سرحد پار کر گیا۔ مکتی باہنی اور بنگلہ لبریشن آرمی کا انچارج بھارتی جرنیل اوبان سنگھ چند ہی ملاقاتوں میں اس کی صلاحیتوں اور عسکری و سیاسی امور پر گرفت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے اسے پیشکش کی کہ مشرقی کمان کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے فورٹ ولیم ہیڈ کوارٹر کے زیر سایہ عمودی پرواز کے لیے وہ پاکستان آرمی کے باغی دستوں پر مشتمل ایک الگ فوج تشکیل دے جو انڈین کمان کے زیر تحت ہو اور انڈیا بنگلہ دیش کی دوستی اور یک جہتی کے کام آئے۔ اس کا یونیفارم بھارتی فوج جیسا ہو اور اسے یہیں سے کمانڈ کیا جائے۔ بھارتی عزائم کا یہ رخ دیکھ کر وہ پوری جرأت سے کرنل عثمانی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے انکار کے بعد یہ فورس عوامی لیگی قادر صدیقی کو سونپی گئی اور آنے والے برسوں میں اس فورس نے بدنامی اور ظلم میں سب کومات کر دیا۔

مشرقی بازو میں اسے مکتی باہنی کا گوریلا ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ پاک فوج کے خلاف جاری اس جنوبی جنگ میں جو

بنگالیوں کے ناموس اور آزادی کی پری کے لیے لڑی جا رہی تھی، اس نے گوریلا دستوں سے وہ رشتے استوار کیے جو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد بھی اس کی قوت، طاقت اور ہمت بنے۔

جنگ آزادی کے دوران زخمی ہونے کے بعد اس نے کلکتہ میں ہجرت کر کے آئی ایک لڑکی نئی سے ڈرامائی طور پر شادی کر کے عبوری حکومت کے ہیڈ کوارٹر میں سر اسیمبلی پھیلا دی۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد وہ بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمن کے قریب تھا مگر وہ کھوکھلے غرور کا قیدی جبر و تشدد کے قصیدے پڑھنے والوں، سیاسی ٹھگوں مفاد پرستوں اور لٹیروں کے ہجوم میں گھرا اور برا عظیم عوام سے کٹ چکا تھا۔ اسے نہ اپنے عوام کے دکھوں کا احساس تھا نہ ملک میں پھیلی انارکی اور ظلم سے زیادہ بھوک کا حتی کہ جس نے ۵۰ ہزار سے زیادہ قحط کی ماری خواتین کو پہننے کا لباس تک اپنی خوراک کے لیے بیچنا پڑا تھا۔ انجمن مفید الاسلام کے ڈاکٹر عبدالوحید نے بدانتظامی کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز اس سے کہا تھا ”ہم عام طور پر ڈھاکا سے روزانہ ۲ درجن قحط کے مارے مردہ لوگوں کی لاشیں اٹھاتے تھے۔ اب یہ تعداد ۶۰۰ روزانہ تک پہنچ چکی ہے۔ قحط زدہ لوگوں کی امداد، خوراک اور سامان تک عوامی لیگ کے لیڈروں کے گھروں میں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہا جانے لگا کہ شیخ مجیب کے حصے کا کھل بھی ان تک نہ پہنچ سکا۔

مکتی باہنی (فوج آزادی) کے متوازی کھڑی کی گئی مجیب باہنی، راکھی باہنی، لال باہنی، نیل باہنی، قادر باہنی جیسے منگول لشکر کی لوٹ مار ملک کو تہ و بالا کر چکی تھی۔ بھارتی فوج کی لوٹ مار الگ سے تھی۔ بقول مولانا بھاشانی وہ ۱۶ ہزار کروڑ ڈالر مالیت کا ساز و سامان اور فیکٹریاں لوٹ کر لے جا چکی تھی۔ بنگالیوں کو پاکستان سے آزادی بہت مہنگی پڑی تھی۔ پاکستانی حکومت صرف آمریت تھی اب قسطنطنیہ کا دور دورہ تھا۔ نہ زندگی محفوظ رہی نہ عزت و آبرو، یہ ساری پابنیاں شتر بے مہار بنی، ہر چھوٹے بڑے شہر میں دندناتی پھرتی تھیں۔ عوامی لیگ کے مخالف مردوزن کو اٹھاتی، تشدد کرتی اور مار دیتیں۔ اس دوران خود دالیم پر ۳ بار جان لیوا حملہ ہو چکا تھا۔ ایک بار تو شیخ مجیب

کے ایک چہیتے نے اسے مارنے کے لیے بیوی سمیت بھری محفل سے انوا کر لیا تھا۔

تب ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کی رات شریف الحق دالیم اور جنگ آزادی میں شریک اس کے مکتی باہنی کے دوستوں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا اور بد عنوان حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ جس میں شیخ مجیب اور اس کا خاندان کام آ گیا۔

صدر کھنڈ کر مشتاق اور جنرل ضیاء الرحمن کی قیادت میں اس حکومت کے خلاف جوانی انقلاب آیا تو دالیم وہاں بھی لمحہ جان ہتھیلی پر لیے باغی بریگیڈر خالد مشرف اور اس کے ساتھیوں سے مذاکرات کے ڈول ڈالتا رہا تا کہ بنگلہ دیش کی فوج باہم نہ لڑ پڑے۔ جنرل ضیاء الرحمن کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد میجر دالیم لیفٹیننٹ کرنل بنا اور پھر ۱۹۷۶ء میں اس کی خدمات فارن آفس کے سپرد کر دی گئیں۔ اس سے پہلے اسے بہادری اور شجاعت کا سب سے بڑا اعزاز ”پیراٹم“ عطا ہو چکا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین میں کامیاب سفارت کاری کے بعد اسے برطانیہ، ہانگ کانگ، کینیا اور تنزانیہ میں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر کے فرائض انجام دینے کی عزت ملی۔

۱۹۹۵ء میں وہ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ سیاحت، کتب بینی، سپورٹس اور اب مذہب اس کی زندگی کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ کئی گھنٹوں پر مشتمل اس ملاقات کا اہتمام ایک دوست ملک میں کیا گیا جہاں دالیم ان دنوں اپنی بیٹی کے ہمراہ مقیم ہے۔ کچھ عرصہ قبل وہ اپنی بیوی کو کھوپچا جو بیماری سے ہار کر ایک طویل محبت بھری زندگی کا اچانک اختتام کر کے رخصت ہو گئی۔

میرے لیے یہ بات بہت حیرت کی تھی کہ کئی روز تک ملکہ برطانیہ کا ذاتی مہمان رہنے والا دالیم، جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا اور ملائیشیاء کے مہاتیر محمد کا ذاتی دوست، جس کے یارانہ ہنری کسنجر سے لے کر دنیا کے کتنے ہی مصروف و مقبول لوگوں سے ہیں، سفارت کاری کے طویل کیریئر کے بعد ایک پرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے حالانکہ اس کے اپنے وطن میں اس کے سر پر بھاری رقم کا اعلان ہے۔ اس ملک میں اسے سزا سنائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ

اپنی ہی فوج سے ٹکرا گیا تھا۔ سوناہ بنگلہ میں آج اس کا داخلہ ممکن نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ حسینہ واجد کی زندگی میں اب یہ ممکن نہیں رہا۔ اس نے آئین میں دی گئی انقلاب کے حصہ داروں کی سزاؤں کے لیے ہر قسم کا استثنیٰ ختم کر دیا ہے اور گن گن کر ان لوگوں سے بدلے لے رہی ہے جس نے اس کے والد اور خاندان کو اس جہاں سے رخصت کیا تھا۔

دالیم نے ۱۹۳۶ء میں آنکھیں کھولیں تو تحریک پاکستان جاری تھی۔ اس کے بزرگ اس تحریک کا حصہ تھے۔ جواں ہوا تو اپنے وطن کی آزادی کے ہراول دستے میں خود شامل تھا۔ اس کی بیوی اس کی پشت پناہ تھی۔ آج جب وہ زندگی کی ۶۶ بہاریں دیکھ چکا ہے، اس سے مل کر حیرت دو چند ہو جاتی ہے۔ متحرک آنکھیں اور بولتے لفظ اب کسی سیاسی اور ہنگامی موضوع کا احاطہ کرنے میں کم دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے ایک بار پھر پاکستان اور پاکستان کے لوگ بھاتے ہیں۔ وہ گھنٹوں اس موضوع پر بات کرتا ہے بلکہ اس سے بھی وہ ہاتھ آگے وہ امت مسلمہ کے حوالے سے سوچتا ہے۔

اس کی شخصیت میں اتنی تبدیلی دیکھ کر میں نے پوچھا کہ کل کا سرمئی عقاب، مکتی باہنی کا انقلابی گوریلا، فوج کا ایک دلیر کمانڈر، کامیاب سفارت کار، مطمئن بزنس مین..... ایک شخصیت نے کتنی شخصیتوں کو چھپا رکھا ہے؟

موسم بہار کی ایک خوبصورت سہ پہر جب ہماری

ملاقات طے تھی۔ ملاقات سے پہلے وہ اپنی اہلیہ کی قبر سے ہو کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جسے وہ باقاعدگی سے قبر پر بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پان تھے۔ ہر نشست میں جب تک میں چائے کا کپ ختم کرتا یا عرب مٹھائیوں کا مٹھاس بھرا کوئی چھوٹا ٹکڑا کاٹ کاٹ کر منہ میں رکھتا تو وہ ایک پان کھا چکا ہوتا۔

یہ ملاقات بے شک بہت طویل تھی۔ بہت مختلف تھی مگر بہت اچھی تھی۔ اپنے وطن کے ٹوٹنے، ایک حصہ علیحدہ ہونے کا دکھ برسوں سے ازار کا باعث تھا اور میں نہیں جان پاتا تھا کہ اتنا بڑا واقعہ، اتنا بڑا سانحہ چند دنوں میں کیسے وقوع پذیر ہوا اور جن کے ہاتھوں یہ زخم لگا وہ کیسے لوگ تھے؟ چند نام، چند چیزیں اس غصے اور ناراضی کا مرکز بننے رہے مگر پوری بات کبھی سامنے نہ آئی۔ علیحدہ ہونے والوں پر کیا ہوتی۔ اب وہ کیا سوچتے ہیں۔ ان کی کہانی کیا ہے؟ صفحات کی تنگ دامانی حاصل نہ ہوتی تو ضرور بتاتا کہ سفید پاجامے اور سفید قمیص میں ملبوس آج کا دالیم سپاہی کم دانشور اور صوفی زیادہ لگتا ہے جس کی چند سال قبل خواب میں آنحضور ﷺ سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کے وجود سے نکلی روشنی اس کو نہلا دیتی ہے اور لندن کے خنک موسم میں خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھتا اور پھر اپنی بیوی اور ساس کے کہنے پر وہ پہلی بار نفل نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے اور تب وہ

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ہونے والی واحد حکم عدولی



ملٹری اکیڈمی کے اڑتیسویں پی ایم اے کی پانگ آؤٹ سے ذرا پہلے سات روزہ قیادت ایکسرسائز ختم ہوئی تو سارے لڑکے کامیابی سے برف میں سات دن گزار کر بیماری اور تھکاوٹ کے ساتھ واپس آ رہے تھے تو جنرل منٹھا نے خلاف توقع تحسین کرنے کے بجائے سزا سنادی کہ کوئی کیڈٹ سڑک یا ٹرانسپورٹ استعمال نہیں کرے گا اور یہاں سے ۳۵ کلومیٹر دور اکیڈمی پہاڑی رستے سے جائے گا۔ یہ بہت ناروا اور ظالمانہ حکم تھا۔ کسی کیڈٹ کی جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ پہاڑی راستے سے زندہ سلامت اکیڈمی پہنچ پاتا۔ دالیم نے انھیں سڑک استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ راستے میں تین چار لڑکے پکڑے گئے۔ جنرل منٹھا نے حکم عدولی پر پورے بیج کو بی نکال دینے کا عندیہ دیا اور تائید کے لیے جی ایچ کیو پہنچ گیا جہاں دالیم کے بھیجے ہوئے تین لڑکے اپنے جرنیل باپوں کو اصل صورت حال سے آگاہ کرنے اور جنرل منٹھا کے ظالمانہ حکم کے نقصان بتانے پہنچ چکے تھے۔ یوں اس کی حکمت عملی سے یہ لوگ سزا سے بچ گئے۔

یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نماز کیسے پڑھنی ہے۔ آئیے..... اس ملاقات میں آپ بھی شریک ہوں۔

س: بھارتیوں کی رائے ہے کہ بنگلہ دیش ایک اور پاکستان ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں کس طرح بحالی تعلقات کے لیے پیش قدمی کرنی چاہیے؟

ج: ٹھیک ہے ملک ٹوٹ گیا۔ جیسے دیوار ٹوٹ گئی تو کیا اسے دوبارہ جوڑا نہیں جاسکتا؟ دوبارہ بنایا نہیں جاسکتا۔ ہمیں آگے دیکھنا چاہیے۔ علیحدگی کے بعد ہم نے ایک دوسرے کے لیے کیا کیا؟ کیا بنگلہ دیش کے لوگ آپ پر Trust کرنے کو تیار ہیں؟ تعلقات تب بہتر ہوتے ہیں جب لوگوں کو معاشی فائدہ ہوتا ہے تو وہ محبت کو بھی قبول کرتے ہیں۔ آپ نے ان کا خون چوسا، اسے بھولنے کے لیے انھیں کچھ دیں گے تو بھولیں گے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ کتنے لوگوں نے اب یہاں سے جا کر وہاں کارخانے لگائے ہیں۔ یہی کام پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ حکومتی سطح پر ہوتا تو نتائج اور بھی اچھے ہوتے۔ حسینہ واجد کے آنے سے پہلے تک وہاں کے لوگوں میں آپ کے لیے بہت acceptance پیدا ہو گئی تھی۔ ڈھاکا میں ہونے والے کرکٹ میچ کو دنیا نہیں بھولی جب امریکا تک میں کہا گیا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان ہوم گراؤنڈ پر میچ کھیل رہا تھا۔ اندرا گاندھی اور اس کے مشیر برائے مشرقی پاکستان ڈی پی دھر کے بیانات آن ریکارڈ موجود ہیں کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر ہم نے غلطی کی (انھوں نے بلنڈر کا لفظ استعمال کیا)۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کمزور ہو جائے گا۔ بنگلہ دیش ان کا غلام اور غلطی بن جائے گا۔ الٹا کیا ہوا کہ بنگلہ دیش ایک اور پاکستان بن گیا۔

۳۰ ہزار کے قریب فوجی تھے جو ملک ٹوٹنے کے بعد پاکستانی فوج سے ادھر گئے۔ یہ فوج کے لوگ تھے۔ ان کے دل آپس میں بہت جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی یاد، کوئی بات اور اچھا وقت نہیں بھولتے۔ جنرل ضیاء الرحمن کے زمانے میں ہمیں اسلحہ چاہیے تھا جو کہیں سے مل نہیں رہا تھا تو پاکستان میں جنرل ضیاء تک بات پہنچائی گئی کہ ہمیں اسلحہ چاہیے۔ اس نے پوچھا، ضرورت بتائیں۔ ہزاروں گنیں

پاکستان نے دیں اور ان کے پیسے بھی نہیں لیے۔ اس طرح کے اظہار سے ملکوں میں تعاون بہت بڑھتا ہے۔ افواج، سکولوں/کالجوں کے طلبہ، سیاسی و اقتصادی اور کچھ ریل و فوڈ کے تبادلے اور سب سے ضروری معاشی سرگرمیاں بڑھانی چاہئیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں! بنگلہ دیش کے قیام نے دو قومی نظریے کی سچائی کو اور پختہ کر دیا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر الاقوامی ملک تھا، ایک قوم نہیں تھا۔

س: ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد مجیب کو اقتدار کیوں نہیں دیا گیا؟ آپ اس ادارے کا حصہ تھے جس نے اسے بااختیار ہونے سے محروم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا؟

ج: مجیب کو اقتدار دینے سے کیوں ڈرتے تھے، میں نہیں سمجھ پایا۔ اس نے تو کبھی آزاد بنگلہ دیش کا نعرہ ہی نہیں لگایا تھا۔ اس میں ایسی ہمت بھی نہیں تھی۔ آپ اسے وزیر اعظم بنا دیتے، جس طرح کا وہ نااہل حکمران ثابت ہوا، ۲ سال نہیں چل سکتا تھا۔ آپ نیا حکمران لے آتے۔ مجھے نہیں سمجھ آئی کہ فوجی جنتا اور پاکستانی سیاسی اشرافیہ کو اس سے کیا ڈر تھا۔ کیا وہ وزیر اعظم بن کر اسلام آباد کی اینٹیں اکھڑا کر لے جاتا.....!

نااہلیت کی حد یہ ہے کہ وہ جو بابائے قوم (بنگلہ بندھو) کے مقام پر فائز تھا اس نے اپنی ناقص پالیسیوں، نا سمجھی، اقربا پروری اور غلط بخششوں کی وجہ سے پورے ملک کو ۲۰ سال کے اندر تہمتیں نہس کر دیا۔

۱۶۰۰۰۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ مالیتی سامان بھارتی فوج لوٹ کر لے گئی۔ باقی عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اپنی اپنی بائیاں (فوج) بنالیں۔ ان کی لوٹ مار، قتل و غارت، سرگلنگ جیسے جرائم پر بھی پردہ ڈال دیا گیا۔ پورے بنگلہ دیش میں ایسی انارکی پھیل گئی کہ فوج کو بلانا پڑا۔ فوج آ تو جاتی ہے لیکن اس کی واپسی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے پھر فوج کو کرپٹ لوگوں کے خلاف کام سے روک دیا گیا۔ مجیب کے اندر ایک بدترین آمر تھا۔ آخر میں تو وہ تا عمر صدر بننے والا تھا۔ ایسی ہی سوچ بھٹو صاحب میں بھی تھی۔

س: کبھی بھٹو سے ملاقات رہی۔ وہ اس عہد میں

ج: بھٹو سے میری ۲ ملاقاتیں ہوئیں پہلی اس وقت جب میری پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ کراچی سے جہاز لیٹ اڑا تو پتا چلا کہ بھٹو آ رہا ہے۔ جہاز میں دو تین ایئر ہوسٹس بھی زیادہ تھیں۔ اس روز بھٹو میرے دائیں طرف ایک قطار چھوڑ کر بیٹھا ہوا، کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے مجھے بلایا اور پینے کی دعوت دی۔ میرے انکار پر وہ قہقہہ لگا کر بولا ”تمہارے میس میں تو مفت ملتی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ تم نہ پیو.....؟“

کوئٹہ قریب آیا تو اس کے کارندوں نے پیچھے سے آکر اس کے کپڑے بدلے۔ کوٹ پہنایا۔ ماؤ کیپ دی۔ مجھے تو نرا ڈراما لگا۔ کوئٹہ پہنچ کر جہاز سے اتر کر اس نے پانی منگوایا پھر یہ کہہ کر پینے سے انکار کر دیا کہ یہاں غریب لوگوں کو پانی میسر نہیں، میں کیسے پی سکتا ہوں؟ یہ میرے سامنے ہوا۔ مجھے بہت برا لگا۔ بالکل نوٹنگی حالانکہ بڑے جلسے میں اس نے خوب خطاب کیا۔

س: ہندوستانی جنرل اوبان سے کب واسطہ پڑا، ملاقات کب ہوئی اور اس کا بنگلہ دیش موومنٹ سے کیا تعلق تھا؟

ج: ہندوستانی بارڈر کراس کرتے ہوئے ہم نے اپنے آپ کو ہندوستانی حکام کے حوالے نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم پاک فوج کے افسر تھے اور

ہندوستانی تفتیش کاروں نے دہلی خبر ہونے تک ہمیں اویسر کر رکھ دینا تھا۔ ہم نے دلی میں وزارت خارجہ میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور

اندر گاندھی کے نام ایک خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ اس کی ایک نقل عبوری بنگلہ دیش حکومت جس کے سربراہ نذر الاسلام اور وزیر اعظم تاج الدین تھے، کے نام



بھی بھجوا دی اور خود گنگا نگر سے کالگا ایکسپریس لے کر دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دہلی میں ہم ۲ دن نٹ راج ہوٹل میں رہے۔ شہر کی سیر بھی کی اور ۱۰ ہزار پاکستانی روپوں کو تبدیل بھی کرایا۔ تب اوپن مارکیٹ سے ایک پاکستانی روپے کے ہمیں ایک روپے ۰.۷۰ روپے بھارتی ملے تھے۔ موتی نے تمام خبر رساں ایجنسیوں، اخباروں، رسالوں کے نمبر حاصل کر کے سب کو بلا لیا اور ہم نے اُن کی موجودگی میں اپنے آپ کو وزارت خارجہ کے حوالہ کیا۔ تب جوائنٹ سیکریٹری اے کے رائے نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ سے ملوایا گیا۔ سفید قمیص اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک نوجوان سے بھی ملوایا۔ یہ جنرل اوبان سنگھ تھا۔ پتا چلا کہ را کے ریسرچ اور تجربہ ونگ کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اچھا، سادہ اور منکسر المزاج آدمی تھا۔

۴۰ سالہ بریگیڈئر نارائن بھی وہاں موجود تھا اور وہ ہمارا میزبان تھا۔ وہ ہم تینوں کو لے کر بازار گیا۔ شاپنگ کرائی، نئے کپڑے، جوتے اور شب خوابی کا لباس لے کر دیا۔ اگلے ۲ روز ہم تفتیشی افسروں کے سوال ناموں کے جوابات تیار کرتے رہے۔ ہمارے جوابات کی ایک منظم طریقے سے جانچ پڑتال کی گئی۔ انھوں نے ہم سے بہت سی قیمتی معلومات بھی اگلو لی تھیں۔ دفاعی تنصیبات، مواصلات، فوج کا طریق کار، طرز زندگی، سکیورٹی سسٹم، بنگالی فوجی، افسران، بیوروکریٹس، ذاتی، خاندانی زندگی، دوستوں، رشتے داروں کے نام پتے۔ یہ مشق ۴ دن اور ۴ راتیں جاری رہی۔

س: عبوری حکومت کے عہدے داروں سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی اور آپ نے ان کو کیسا پایا؟

ج: ہمیں ۴ دن بعد عبوری حکومت کے وزیر اعظم تاج الدین احمد، وزیر خارجہ کھنڈکر مشتاق احمد اور مکتی باہنی کے کمانڈر ان چیف کرنل عثمانی (کرنل ایم اے جی عثمانی جو بعد میں جنرل عثمانی کے نام سے پہچانے گئے) سے ملوانے کے لیے گاڑیاں بدل بدل کر لے جایا گیا۔



کرنل عثمانی نے کہا ”لوگو! آپ کو آنا مبارک ہو۔ میں آپ کی حب الوطنی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہمیں آپ جیسے افسروں کی اشد ضرورت تھی۔ ہم چاہتے ہیں آپ جیسے اور افسر بھی پاکستان سے آجائیں۔“

میں نے بتایا ”سر بہت سے اور افسر بھی آنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ہندوستانی حکومت کا اُن کے ساتھ رویہ کیسا ہوگا؟ وہ ایسا قدم اٹھانے سے ڈرتے اور ہچکچاتے ہیں۔ اگر ہم ان کو بتا سکیں کہ ہندوستانی حکومت اور فوج کس قدر ہمارے مقصد کے ساتھ ہمدرد ہے اور کس قدر تعاون کر رہی ہے تو بہت سے اور افسر بھی آجائیں گے۔“

س: اس فوج کا سربراہ جنرل اوبان سنگھ تھا اور اس کا اصل فرض کیا تھا؟

ج: آزادی کے بعد عوامی لیگ کی حکومت کو تحفظ اور مسلح حمایت دینا تھا۔ اس کا نام بنگلہ دیش لبریشن آرمی (BLA) رکھا گیا۔ اس فوج کو بعد میں مجیب باہنی کہا گیا اور ایک نام جاتیوراکھی باہنی (GRB) بھی تھا۔ اس نے بہت ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ہندوستانی حکومت نے فیصلہ کیا کہ پاکستان سے فرار ہو کر آنے والے تینوں فوجی

۶ جنوری ۶۸ء کو اچانک ۲ سینئری ایس پی آفیسرز اور ۲۶ دفاعی مقامی بنگالی آفیسرز کی گرفتاری ہوئی۔ حکومت نے پریس ریلیز جاری کی کہ انھوں نے دسمبر ۶۷ء میں ڈھاکہ میں قائم بھارتی قونصلیٹ کے ساتھ مل کر علیحدگی کی سازش کی۔ ۷ جنوری کو شیخ مجیب رہا ہوئے اور فوراً ہی انھیں دوبارہ گرفتار کر کے چھاؤنی منتقل کر دیا گیا کہ یہ اگر تلہ سازش کیس کا بڑا ملزم ہے۔ وہ ۵۵ ملزموں میں شامل ہی نہ تھا۔ بحریہ کے لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین مسلح افواج میں بنگالی افسروں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک پر بولتے تھے۔ وہ اس منصوبے کے خالق تھے۔ شیخ مجیب کا سیاسی مستقبل تاریک کرنے کے لیے اسے سازش میں ڈال دیا گیا۔ کیس کے دوران حکومت کے خلاف غم و غصے کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ مجیب خود مختاری کے حامی تھے۔ علیحدگی کا انھوں نے نام نہیں لیا البتہ مولانا عبدالحمید بھاشانی نے کئی سال پہلے ولیم السلام مغربی پاکستان کہہ کر آزاد بنگلہ ریاست کے لیے ذہن ہموار کرنے شروع کر دیے تھے۔

افسر جنرل اوبان کے ساتھ مل کر BLA کو قائم اور منظم کریں۔ وہ ہمیں غیر سیاسی اور شیخ مجیب پر اندھا اعتماد کرنے والا سمجھتے تھے۔ ہمارے دفاعی پس منظر، پیشہ ورانہ صلاحیتوں، اندھی جرات اور مقصد سے سچی لگن کے باعث عبوری حکومت بھی اس فیصلے میں ان کے ساتھ تھی۔ آنے والے دنوں میں میں نے نوٹ کیا ہندوستانی افسر، بنگالی افسروں پر اعتماد نہیں کرتے تھے ہندوستانی فوج کے مشرقی کمانڈر جنرل اروڑا کے بعد میں ایک انٹرویو میں جو اس نے مسٹر نکھیل چکروتی کو دیا، کہا ”مسلح افواج کے بنگالی ممبران اور افسروں پر نہ صرف مجیب اور ان کی پارٹی شکوک و شبہات رکھتی تھی بلکہ خود ہندوستان کے حکام بھی ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔“

س: ہندوستانی حکام کو دوسرا بڑا خوف اور خطرہ کس سے تھا؟

ج: نکلسل باڑیوں جیسی انتہائی بائیں بازو کی قوتوں سے تھا۔ نکلسل باڑی پہلے ہی مکتی باہنی کی صفوں میں گھس کر نفوذ حاصل کر چکے تھے۔ مغربی بنگال، اڑیسہ، بہار، آسام، تری پورہ، منی پورہ، میزورام جیسی ملحقہ ہندوستانی ریاستیں یا صوبے ایسے تھے جہاں نکلسل باڑی تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ لہذا ملے ہوا کہ ان کو شروع سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے ورنہ یہ لوگ بعد میں فوجی حکام سے مل کر عوامی لیگ کی قیادت کے لیے بہت مسائل پیدا کریں گے۔ ان کے اندر سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ پورا

انقلاب ہائی جیک کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔

ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اپنے کیریئر اور جانوں کو داؤ پر لگا کر اس جنگ میں کود پڑنے والوں کے بارے میں کیسی غلط رائے قائم کی گئی۔ ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے حکام اصل میں علیحدگی کے جس نقشے پر کام کر رہے تھے، اس میں بنگلہ دیش کی آزادی نہیں تھی، دارالحکومت اسلام آباد سے کلکتہ شفٹ کرنے کا مسئلہ تھا۔ ایک کمزور سا ملک جسے مستقل طور پر اپنا غلام بنا کر رکھنے کی ساری تیاری تھی کہ کہیں کسی طرح آنے والے وقت میں یہ قوم اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو جائے۔

ج: سنا ہے یہ جانتے ہی آپ تینوں نے حلف اٹھایا کہ اس مکروہ منصوبے کا حصہ نہیں بنیں گے۔ کیا یہ درست ہے؟

ج: بالکل درست ہے۔ ہم نے حلف لیا اور طے کیا کہ اپنے آپ کو پوشیدہ طور پر منظم کریں گے۔ اصل میں انہی دو تین ہفتوں میں ہندوستانی حمایت، کوششوں اور سرگرمیوں کو دیکھ کر ہمارے ضمیر نے بغاوت کر دی تھی۔ ہماری اولین خواہش یہ تھی کہ دہلی سے مجیب نگر (کلکتہ) پہنچ کر ہم محاذ جنگ پر پہنچ جائیں، آگے حالات ہم سنبھال لیں گے۔ لوگوں کو خود منظم کر لیں گے۔

س: کلکتہ میں پاکستان مشن کا انحراف اور بنگلہ پرچم کا لہرایا جانا تب بڑا واقعہ تھا؟

ج: کلکتہ میں پاکستان مشن کے انحراف کی داستان ہمیں شہاب الدین اور امجد نے سنائی۔ وہ ہم سے ملنے آتے تھے۔ مشن میں بنگالی افسر حسین علی کے بعد رفیق اسلام چوہدری سینئر ترین افسر تھے۔ وہ وہاں فرسٹ سیکریٹری انچارج تھے۔ ان کی تقرری خفیہ طور پر انٹیلی جنس ایجنسی کے ذریعے ہوئی تھی اس لیے وہ بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ عملے کے زیادہ لوگ بنگالی تھے۔ جونہی عبوری جلاوطن حکومت کا اعلان ہوا، ان سب نے منحرف ہو کر بنگلہ حکومت کی حمایت اور اطاعت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹ ستمبر کو یونیو پر واقع یہ پہلا غیر ملکی مشن تھا جس پر پاکستان کے بجائے بنگلہ کا

پرچم لہرایا گیا اور تمام پاکستانی عملے کو مشن سے نکال دیا گیا۔ س: کچھ ۵۸ بالی گنچ کے بارے میں بتائیے جہاں مجیب کے ساتھیوں نے ہندوستان کی چھتری تلے عبوری حکومت کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ وہاں جا کر کیا محسوس ہوا؟

ج: یہ بلند دیواروں سے گھرا ہوا ایک دو منزلہ بنگلہ تھا۔ باہر گیٹ کے قریب ایک پول پر بنگلہ دیش کا مجوزہ سبز رنگ کا پرچم جس کے درمیان سرخ ابھرتا ہوا سورج اور اوپر پیلے رنگ کا بنگلہ نقشہ تھا، لہرا رہا تھا۔ گیٹ پر سنتری موجود تھے۔ یہ مجیب نگر کی عبوری حکومت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اندر چند خیمے لگے تھے۔ گیٹ پر بی ایس ایف کے مسلح گارڈ تھے۔ ساری عمارت لوگوں سے بھری رہتی تھی۔ ہمیں حیرت تھی کہ جنگ ملک کے اندر لڑی جا رہی ہے اور ہیڈ کوارٹر وہاں سے دور بالی گنچ کلکتہ میں کیوں ہے؟ ہمیں یہ سارا معاملہ عقل سے بعید اور قدرے ناموافق لگا۔ ہم نے پوچھا کرنل عثمانی کہاں ہے؟ یہ مکتی باہنی کے کمانڈر ان چیف تھے۔ بتایا گیا کہ وہ وزیر اعظم تاج الدین کے ساتھ ادھر ہی رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر واقع ان کے کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے میں ایک طرف بیڈ اور دوسری طرف کپڑوں کا شیلف تھا۔ ایک میز، چار کرسیاں، لکڑی کا لمبا سا بیچ بھی پڑا تھا۔ اس کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کرنل نے ہمیں خوش آمدید کہا اور بولا اچھا لڑکو! یہ میرا چھوٹا سا دفتر اور رہائش ہے۔ اب تم بیٹھ جاؤ پھر بولے، شام کو کابینہ کی میٹنگ کے بعد آئندہ لائحہ عمل پر بات کریں گے۔



تاج الدین

فی الحال آؤ وزیر اعظم سے مل لیتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ چلتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں گئے۔ وزیر اعظم بیڈ پر لیٹے

میں اتنے برسوں بعد پورے خلوص سے سمجھتا ہوں کہ پاکستان اللہ کا بہت بڑا عطیہ اور تحفہ ہے، اسے قائم رہنا ہے۔ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ قائد اعظم جیسے حوصلے اور صلاحیتوں کے حامل رہنما کی ضرورت ہے جو ملک کے وقار کو بڑھائے، عزت اور ترقی کی راہ پر لگائے۔ اس عظیم قائد نے انگریز راج کو ہی نہیں ہندو چالکیہ کو بھی شکست سے دوچار کیا تھا۔ اب بھی لیڈر شپ کی سوچ میں اتنی ہی میچورٹی کی ضرورت ہے۔ اے، میں علیحدگی سے ہم نے کچھ حاصل کیا ہو یا نہ میچورٹی ضرور حاصل کی ہے۔

میں نے چند سال پہلے بطور سفیر ہانگ کانگ میں ایشیائی ملکوں کے ایک سیمینار میں کہا، بھارت جیسا ہے ویسا نہیں رہے گا تو بھارتی نمائندے ہر انیم میرے پاس آئے اور میرے پیپر پر ناراضی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا، یہ بطور ڈپلومیٹ نہیں بطور تجربہ نگار میرا جائزہ ہے۔ ڈپلومیٹ تو وہ ہوتا ہے جو جھوٹ بیچتا ہے اپنے وطن کی محبت اور فائدے میں! مجھے بعد میں فارن سروس سے بھی پوچھا گیا۔ میں نے کہا جس بنیاد پر ہم ملک بنے۔ اس بنیاد پر بھارت کی بارہ تیرہ ریاستیں تو ضرور آزاد ہوں گی۔ ہماری آزادی کی جنگ میں شامل بھارتی آفیسرز اپنے اپنے صوبوں میں جا کر آزادی کی تحریکوں کو منظم کر رہے ہیں۔

کائنات دیکھ رہے تھے۔ یہ کمرہ بھی کرنل عثمانی کے کمرے جیسا تھا۔ ۲۰ منٹ بعد ہم واپس آگئے اور وہ دونوں کابینہ کے اجلاس کے لیے چلے گئے۔

س: ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات ایسا کیا ہوا تھا جس نے ملک کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی بدل کر رکھ دیا؟ آپ بھی اسی وجہ سے پاک فوج سے فرار ہوئے؟

ج: دیکھیں بنگ مین.....! ۲۵ مارچ کی رات ایک فیصلہ کن رات تھی۔ یہ رات نہ آتی تو ملک کبھی نہ ٹوٹا۔ ملک کے بے اصول، بددیانت فوجی ٹولے نے اپنی مسلح افواج کو مشرقی پاکستان کے نہتے لوگوں پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہزاروں معصوم اور بے گناہ بنگالیوں کے ساتھ ساتھ پاک فوج کے بنگالی افسر اور جوان بھی اس خون ریزی کا شکار ہوئے۔ لوگ اس برق رفتار قتل و غارت کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار نہ تھے۔

افسوس ناک اور مایوس کن پہلو یہ بھی تھا کہ شیخ مجیب کو حملے اور ملٹری ایکشن کی اطلاع بھی تھی مگر اس نے نہ تو کسی متبادل نظام اور لیڈر شپ کا اہتمام کیا اور نہ خود عوام کے ساتھ کھڑا ہوا۔ ہزاروں لوگ راتوں رات مارے گئے۔ شیخ مجیب نے عملاً اپنے آپ کو ایک نااہل لیڈر ثابت کیا۔ لوگ

آخر دم تک منتظر رہے کہ اس کی طرف سے مسلح جدوجہد کا کوئی پیغام اور اعلان آ سکے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ بے حس و حرکت رہے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے ”میں روایتی سیاست پر یقین رکھتا ہوں، مسلح جدوجہد پر نہیں۔“ ہزاروں لوگوں کے قتل عام پر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا متحدہ پاکستان کا لیڈر بننا اس کی سب سے بڑی اور اولین خواہش تھی جو ہر چیز پر بھاری تھی۔ وہ اپنے گھر پر سکون انداز میں بیٹھا رہا پھر اچانک پراسرار حالات میں اپنی گرفتاری دے دی۔ اس کی بیوی اور بیٹی حسینہ واجد کے علاوہ باقی ماندہ سارا خاندان بھی حکومت پاکستان کی میزبانی کے مزے لیتا رہا۔

س: شیخ مجیب نے نہیں تو پھر اعلان آزادی کس نے کیا؟ ج: شیخ مجیب کی بے وفائی پر پوری قوم صدمے کی کیفیت میں تھی۔ ان نازک لمحات میں فوج کے ایک غیر معروف میجر ضیاء الرحمن نے جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا، اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کلور گھاٹ ریڈیو اسٹیشن چٹا گانگ سے آزادی کا اعلان کر کے قوم کو مسلح جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔ اس اعلان نے قوم کو متحد اور متحرک کر دیا۔ بنگال رجمنٹس کے علاوہ تمام پاکستانی یونٹس کے ای پی آر، پولیس، انصار،

ہنگالی میں کہو

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے دوستوں کی ایک دعوت تھی۔ جس میں فوج، انٹیلی جنس آفیسر، کچھ بڑے تاجر اور چند سیاسی لوگ شامل تھے۔ پاکستان ٹوٹنے پر بات چل نکلی۔ کسی نے سوال کیا، ملک ٹوٹنے کی اصل وجہ کیا تھی؟ کبھی اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ظاہر ہے اصل بات کوئی اور کیسے بتا سکتا تھا؟ میزبان نے کہا آپ ضرور کچھ کہیے، میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وجہ ساری دنیا جانتی ہے۔“

”اصل وجہ اس سے مختلف ہے۔“ میں نے میزبان سے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے ایک جملہ کہا، ”آپ کچھ کہیں“ بنگلہ میں اسے کیا کہتے ہیں؟“

وہ ہنسی بھری نگاہ میں اس نے کہا ”میں کیسے بتا سکتا ہوں؟“

یاد رہے وہ ایک مشہور آدمی ہے۔ میں نے کہا، چلو چھوڑیں، یہاں ۲۰، ۱۵، ۲۰ بندے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آدمی ہی بتا دے کہ ان لفظوں کو ہنگالی میں کیسے ادا کریں گے؟

پھر میں نے کہا، یہاں اکثریت پنجاب کے لوگوں کی اور وہاں اکثریت بنگالی بولنے والوں کی ہے۔ آپ لوگ آپس میں کمیونی کیٹ ہی نہیں کر سکتے تو اکٹھے کیسے رہ سکتے تھے؟

آپ نے کوشش ہی نہیں کی، نہ زبان سیکھنے کی، نہ انھیں ساتھ رکھنے کی۔ نہ کوشش ہو اور نہ خواہش ہو تو دھکے سے کوئی کب ساتھ رہتا ہے۔ یہ آپ نے قومی طور پر غلطی کی تھی اسے دھرایے مت، اس سے سیکھیے اور اپنے مسائل کا حل نکال لے۔

جاتیوراکھی باہنی کو متبادل کے طور پر پروان چڑھایا۔ اس صورت حال میں فوج کے پاس بھی دو خفیہ تنظیمیں، فوجی کونسل اور گانوبانی بنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ۱۹۷۲ء کے بعد جب پوری قوم دہشت زدہ تھی اور ایک فوجی کرنل ضیاء الدین نے ہی سب سے پہلے آواز اٹھائی تھی اور بھارت سے ۲۵ سالہ معاہدہ دوستی یا غلامی ختم کرنے پر زور دیا تھا۔

ج: ۱۵ اگست کے انقلاب کی فوری کامیابی کی کیا وجہ تھی؟

ج: ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو بنگلہ دیش کی تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا اور آمر مطلق شیخ مجیب کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تبدیلی پر پوری قوم نے جشن منایا اور کھنڈ کر مشتاق احمد کو صدر بنا دیا گیا۔ پر زور عوامی حمایت نے اسے ایک عوامی انقلاب کی صورت دے دی اور حمایت نے اس انقلاب کو اخلاقی جواز بھی مہیا کر دیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو پارلیمنٹ کے اسپیکر، مرزا غلام حفیظ نے کہا ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو شیخ مجیب الرحمن سیاسی تبدیلی

جمہوریت کو فنا کیا اور قوم پر ایک جماعتی نظام نافذ کر دیا۔ حد یہ کہ تمام اخبارات بند کر دیے۔ صرف ۴ سرکاری اخبارات کو چھپنے کی اجازت دی۔ عدلیہ کو ایگزیکٹو برانچ کے انتظامی کنٹرول میں دے دیا۔ بنیادی حقوق، عوامی آزادی اور عدلیہ سب کچھ فنا کر دیے گئے۔

س: بنگلہ دیش کی فوج میں ایک خفیہ فوج بنانے کی کہانی کی کیا حقیقت ہے؟

ج: بنگلہ دیش کی مسلح افواج آزمودہ محب وطن بنگالیوں اور پاکستانی مسلح افواج سے بھاگے ہوئے ارکان پر مشتمل تھی۔ انھوں نے بڑی مشکلات کہیں اور وفا داری پر لمبی سزائیں کاٹی تھیں۔ اس لیے بنگلہ دیش کی مسلح افواج کا کردار دنیا کی روایتی افواج سے مختلف تھا۔ افواج کے اراکین کا ایمان تھا کہ عوام اور قومی مفاد اہم ہے نہ کہ کوئی سیاسی گروہ یا پارٹی۔ فوج کی اس سوچ نے شیخ مجیب کی حکومت کو بہت بھڑکا دیا۔ وہ فوج کو قائم رکھنے کے ہی حق میں نہیں تھا۔ اس نے فوج کے مقابلے کے لیے

ہتھیار ڈالنے کی تقریب ہمارے خیال سے جنرل عثمانی اور مشترکہ کمانڈ کے اعلیٰ ترین کمانڈر جنرل اروڑا کے سامنے ہونی چاہیے تھی مگر جنرل عثمانی کو وہاں آنے ہی نہیں دیا گیا اور جنرل اروڑا کو واحد فاتح کے طور پر پیش کیا گیا۔

س: شیخ مجیب کے عروج کو اس قدر جلد زوال کیسے آیا؟ آپ کو تو ان سے بڑی قربت بھی تھی؟

ج: یہ درست ہے میں انھیں کبھی کبھی چچا کہہ کر بلاتا۔ ان کے گھر آنا جانا عام بات تھی۔ خاندانی تعلقات کی قربت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ آزادی کے بعد ڈھاکہ میں جو پہلی سماجی تقریب ہوئی، وہ میری شادی کی پہلی سالگرہ تھی جس میں شیخ مجیب کے اہل خانہ اور وزراء بھی شامل ہوئے تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجیب اور اس کی پارٹی عوامی بکمال کا دور حکومت ایک خوفناک خواب کے مانند ہے۔ یہ بھوتوں کی طرح آکر ڈراتا رہتا ہے۔ مجیب نے پاکستان سے رہائی کے بعد براہ راست ڈھاکہ کا آنے کے بجائے دہلی جانا ضروری سمجھا۔ کہا جاتا ہے کہ اندرا گاندھی کے حکم پر ہی قوم پرستی، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرزم کو بغیر کسی عوامی منظوری یا استصواب کے آئین کے ۴ بنیادی اصولوں کی طرح نافذ کر دیا گیا۔ اس عجیب و غریب فلسفے کو ”مجیب وارڈ“ کا نام دیا گیا اور کھنڈ کر محمد الیاس نے جعلی فلسفی بننے کے لیے مجیب وارڈ کو کتابی صورت دے ڈالی۔

بنگلہ دانشوروں نے اس کا موازنہ ہٹلر کی کتاب ”میں کیہف“ سے کر کے اسے فاشزم اور آمریت کی تمہید قرار دیا۔

عوامی بکمال (یہ عوامی لیگ کا بدلا ہوا نیا نام تھا) کا دور بنگلہ دیش کی تاریخ کا سب سے تاریک اور بدترین دور ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب نے قلم کی ایک جنبش سے

مجاہد فورس سے فرار ہو کر آنے والے فوجیوں اور سول انتظامیہ کے ممبران نے جو بھی ہتھیار ہاتھ میں آیا، لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہتھیار لاثیمیاں، بلم، شارٹ گنیں، ۳۰۳ رائفلیں تھیں۔ یہ ساری چیزیں پاکستانی فوج کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ اس لیے مزاحمت ٹھوس صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

س: حملے کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج: ۱۳ دسمبر کو شام تقریباً ۵ بج کر ۲۸ منٹ پر پاکستانی فضائیہ نے ہندوستانی علاقوں میں سرحدوں کے نزدیک چند ہوائی اڈوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ بیک وقت سری نگر، اونی پور، پٹھان کوٹ، اتر لائی، جودھپور، انبالہ اور آگرہ پر بھی ہوائی حملے کیے گئے۔ اس وقت اندرا گاندھی ٹھکانے میں ایک جلسے سے خطاب کر رہی تھی۔ اس کو جیسے ہی اطلاع ملی اس نے جلسے کے اندر ہی اعلان جنگ کر دیا۔ دہلی جانے سے پہلے مشرقی کمان کے کمانڈروں کو مشرقی پاکستان پر حملے کا حکم دے دیا گیا۔ جنرل اروڑا کی کمانڈ میں ۳۳ آرمی کور (۲۳۳۲) تھیں۔ جنرل ٹی این راؤ کا ہیڈ کوارٹر کرشنا نگر میں تھا اور جنرل تھایا اور جنرل ناگرا اپنی اپنی کور کے ساتھ تھے۔

ہندوستان کی کل فوج ۵ لاکھ تھی اور اسے تقریباً ایک لاکھ مکتی باہنی اور ایک لاکھ دوسرے مجاہدین آزادی کی مدد حاصل تھی۔ انھیں مطلوبہ ہوائی اور سمندری مدد دی گئی۔ حملہ بیک وقت کیا گیا، برج ہیڈز قائم کیے جاتے رہے۔ ان تمام برج ہیڈز سے پیش قدمی کر کے فوج ڈھاکہ کی طرف روانہ ہوئی۔ پاکستانی فوج کو جگہ جگہ پسپائی کے راستے بند کر کے قید کر دیا گیا۔ پاک فوج کے مقابلے پر ۵ لاکھ، بھارتی فوج اور ۲ لاکھ مکتی باہنی کے جوان تھے۔ یہ قوت ۷۶ گنا زیادہ تھی۔ پاک فوج مزاحمت جاری نہ رکھ سکی اور ۱۲ ویں دن اس نے غیر شروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔

۲۵ مارچ کی رات ایک فیصلہ کن رات تھی

یہ رات نہ آتی تو ملک کبھی نہ ٹوٹتا

پاکستان میرے دل سے نہیں نکلا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میرے دل سے نہیں نکلا، الگ ملک بنا کر اسے اپنے خوابوں کا مرکز بنایا مگر میرے سارے خواب ٹوٹ گئے۔ جس کو لیڈر بنایا اسی نے دھوکا دیا۔ جن پر اعتبار کیا انھوں نے قبلہ اسلام آباد کے بجائے دہلی کو بنانے کے ۲۵ سالہ معاہدے کر لیے۔ فوج کے ظلم کے خلاف ملک چھوڑا جہاں عوامی لیگ کے بڑے لیڈر نے اپنی اپنی ہائی بنا کر ظلم و جبر کا ایسا طوفان برپا کیا کہ آزادی کے پہلے سال ۳۰ ہزار سے زائد لوگوں کو چین چین کر مار دیا گیا۔

حکومت عملی کی وجہ سے ۲۹۹ کے ایوان میں ۲۳۰ ریشیں مل گئیں اور اس نے وزیر اعظم بننے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اتحادی پارٹی کے جنرل حسین محمد ارشاد کو صدر بنانے سے انکار کر دیا۔ اس نے پھر پرانے بدلے چکانے پر کمر باندھ دیا۔ اپنے باپ کے نام پر ادارے، پبل، سڑکیں جہاں جہاں ممکن ہے، اس کا نام لکھا جا رہا ہے۔ شیخ مجیب کے قتل میں ملوث تمام افراد کے وارنٹ جاری کروائے۔ انھیں سزائیں سنائی جا رہی ہیں۔ میرے سر پر بھی ۱۰۰۰۰۰ ڈالر کی ہیڈ منی رکھی گئی ہے۔

ٹرانسپیری انٹرنیشنل نے ۲۰۱۲ء تک ڈیجیٹل بنگلہ دیش کے خواب دکھانے والی حسینہ کے بنگلہ دیش کو دنیا کا کرپٹ ترین ملک قرار دیا ہے۔ خود حسینہ پر بنگلہ دیش کے بزنس مین جنرل اسلام فاروقی سے پاور پلانٹ لگانے کی منظوری دینے کے لیے ۳۳۱۰۰۰ ڈالر (۳۰ ملین ٹک) کی رشوت لینے کا کیس عدالت میں ہے۔

رات بھیک رہی تھی۔ ملاقات جاری تھی۔ پاکستان سے فرار ہونے کی سنسنی خیز کہانی، کس کس نے کہاں اور کیسے مدد کی۔ کیسے کوئٹہ سے آکر ہارون آباد سے بھارت کی سرزمین پر قدم رکھا۔ شیخ مجیب کے ہاتھوں برطرفی سے جنرل ضیاء الرحمن کے طویل دور حکومت میں اعزازات اور خدمات، تصوف کی طرف رجحان اور دنیا کی ہر اچھی کتاب کے پڑھنے کا جنون کتنی ہی اور باتیں ہوئیں مگر ان کا تذکرہ پھر بھی۔ اتنا ضرور ہے کہ زمین اور زبان کے مسئلے پر دشمن بننے، دشمن کا ساتھ دینے اور پھر اپنے ہم زبانوں کے ظلم و ستم کا شکار بننے کا ہر لمحہ سیکھنے اور برسوں بعد اپنی غلطیوں پر سوچنے کا موقع تو ضرور دیتا ہے۔

اس کی پارٹی کو شرمناک شکست سے دو چار کیا۔ اب وہ دوبارہ حکمران ہے اور اسی انتقامی سیاست پر کاربند ہے۔

س: حسینہ شیخ کی سیاسی سوجھ بوجھ کے حوالے سے آپ کے تحفظات ہیں مگر ۷۵ء میں اپنی پوری فیملی کھودینے کے بعد اور ۸۱ء تک ہندوستان میں جلا وطن رہنے کے بعد بنگلہ دیش مانگے تھے۔ پھر وہ اپنی موجودہ جارج حکمت عملی تک کیسے واپس پر وہ مسلسل فوج کے ساتھ کامیابی سے برسر پیکار ہے۔

پچھنی کہ سب پرانے کیس کھول دیے گئے ہیں، سزاؤں ج: اس کے بنگلہ دیش آتے ہی مئی ۸۱ء میں صدر جنرل ضیاء الرحمن فوجی انقلاب میں جاں بحق ہو گئے۔

ج: ۷۲ء اور ۷۵ء کے درمیان عوامی بکسال حکومت کے گلے ہی سال ۸۲ء میں جنرل حسین محمد ارشاد نے جرائم اس قدر زیادہ تھے کہ عوامی لیگ (بی اے ایل) نے رٹل لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ۸۳ء میں حسینہ واجد پوری چالاکی سے کام لیتے ہوئے ۹۶ء کے انتخابات میں اپنے ۱۵ پارٹیوں کے اتحاد کے ساتھ جنرل ارشاد کے منشور میں اس ”قومی انقلاب اور یوم یکجہتی“ کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ مہم کا آغاز کیا۔ کبھی گرفتار اور کبھی رہائی کے ساتھ کیا۔ ۹۶ء میں حسینہ واجد اکثریت نہ پاسکی۔ پھر جنرل ۸۱ء میں اس نے خالدہ ضیاء کے ساتھ مل کر فوج کے ارشاد کے ساتھ معاہدے کیے اور عوامی لیگ نے جاتیو پارڈ لاف جدوجہد کی۔ ۹۰ء میں بالآخر ۸ پارٹیوں کے اتحاد کے ساتھ اتحاد کیا۔ جنرل ارشاد کو رہا کیا جو خالدہ دور میں سزاؤں کے خلاف کامیابی حاصل کر لی۔ بی این بی گئی سزا بھگت رہے تھے۔

۲۱ سال کے بعد حسینہ شیخ نے اقتدار میں آتے ہی ایک مجموعہ ہیں۔ اس نے جنرل اے ایس ایم نسیم کی ۹۶ء حجاب اور تسبیح کو پھینک دیا اور اس کے ساتھی اپنے اصل رنگ کی گئی بغاوت کو سپورٹ کیا اور پاور میں آتے ہی میں واپس آ گئے۔ انھوں نے پہلا حکم فوجی انقلاب اور پول نسیم کو معمول کی رینائرمنٹ دے دی جب کہ یکجہتی کو آئندہ حکومتی سطح پر نہ منانے کا دیا۔ آئین سے ۷۹ء کے پہلے برطرف کیا گیا تھا۔ حسینہ واجد نے ۲۰۰۷ء میں سزاؤں کے استثنیٰ کا قانون نکال دیا اور ۱۵ اگست اور ۷ نومبر کے ملٹری کو کی حمایت ہی نہیں کی، اسے کے ہیروز کو گرفتار کر لیا۔ ”مجیب قتل“ اور ”جیل قتل“ کے ہونی تحفظ کا وعدہ بھی کیا اور پھر جنرل حسین ارشاد کی پارٹی سے دو بڑے مقدمات کا آغاز کیا۔ شیخ مجیب کی بیٹی نے اتحاد کر کے حکومت حاصل کر لی اور جنرل ارشاد کو صدر ۹۶ء سے ۲۰۰۱ء کے ۱۵ سالہ دور میں اپنی پارٹی کے خوف کا دیا۔ اس نے جنرل معین کو بھی صدر بنایا۔ اس نے ماضی کو پھر سے تازہ کر دیا۔ وہ پہلے سے زیادہ ظالم اور منتقم بول مسعود کو سول اور ملٹری سروسز میں پروموٹ کیا۔ چکی تھی۔ عوام نے پریشانی اور غصے میں ۲۰۰۱ء کے الیکشن میں ۲۰۰۱ء کے پارلیمانی انتخابات میں اسے کیئر ٹیکر حکومت کی



کے نتیجے میں مارے گئے۔ مجیب اور باقی لوگوں کی موت کسی طور پر معمول کی ہلاکت نہیں تھی۔ وہ مسلح جھڑپ کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ اسی دن اس وقت کے وزیر اعظم شاہ عزیز الرحمن نے ضیاء الرحمن کی اجازت سے بڑے واضح انداز میں کہا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو جس انداز میں کالا قانون ایوان میں ۱۵ منٹوں کے اندر منظور کر کے ۸ کروڑ عوام کے گلے میں ایک پارٹی کے اقتدار کا پھندا ڈالا گیا تھا۔ فوجی انقلاب اس فاشٹ حکومت کے خلاف تھا۔ اس اجلاس میں ۳۰۰ ممبروں میں سے ۲۳۱ نے سزاؤں کے استثنیٰ کا بل پاس کیا اور اسے پانچویں ترمیم کے طور پر آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس طرح ضیاء الرحمن جب بعد میں براہ راست صدر منتخب ہوئے تو بی این بی حکومت نے ۱۵ اگست کے انقلاب کو قانونی استحقاق مہیا کر کے اس کے حق میں حتمی فیصلہ دے دیا تھا۔

س: حسینہ واجد حکومت تو اس استثنیٰ کو نہیں مانتی، وہ تو اسے قتل کا جرم قرار دے رہی ہے جس کا ارتکاب چند ناراض فوجیوں نے کیا جو قواعد و ضوابط سے عاری تھے۔

ج: اگر یہ معاملہ ہے تو پھر حکومت کی تاریخی تبدیلی کے بعد مسلح افواج بی ڈی آر، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ، حتیٰ کہ راکھی باہنی کے سربراہان نے کھنڈ کر مشتاق کی حکومت کی حمایت و تائید کر کے تعاون کیوں پیش کیا؟ ان کے بیانات ریڈیو اور ٹی وی پر آئے۔ عوامی بکسال کے رہنمائی حکومت میں شامل کیوں ہوئے؟ پوری قوم جشن کیوں مناتی رہی؟ عوام نے کرفیو کیوں توڑے اور سینا باہنی زندہ باد کے نعروں سے ڈھا کا کیوں گونجتا رہا؟

بکسال کا کوئی ایک لیڈر بھی ملک کے کسی حصے میں جلوس نہ نکال سکا۔ انقلاب بے شک افواج نے برپا کیا تھا مگر اس کے پیچھے اصل طاقت تو باضمیر عوام کی تھی۔ اگر وہ انقلاب نہ آتا تو آج کی ۸۰ سیاسی جماعتیں کب اور کیسے وجود میں آتیں۔

س: ۱۹۹۶ء کے انتخابات حسینہ واجد نے حجاب اوڑھ کر اور تسبیح ہاتھ میں لے کر لڑے اور کھلے عام شیخ مجیب کی بکسال حکومت کی غلط کاریوں کو تسلیم کر کے عوام سے ووٹ

ٹینڈرنوٹس

محکمہ لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ ضلع گجرات کے منظور شدہ ٹھیکیداران جنہوں نے موجودہ مالی سال (2012-13) کیلئے رجسٹریشن / تجدید کروائی ہے ان سے مارکیٹ ریٹ سسٹم پر درج ذیل کاموں کے لیے MRS BI-ANNUAL PERIOD 1st AUG 2012 TO 31st JAN 2013 سے کم یا زیادہ فیصد کی گرانٹ پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر فارم مورخہ 10-12-2012 کو دفتری اوقات کار تک جاری کئے جائیں گے اور مورخہ 11-12-2012 کو بوقت 1 بجے تک وصول کر سکتے ہیں۔ ٹینڈر شدہ کمپنی / موجودہ ٹھیکیداران یا ان کے نمائندگان کی موجودگی میں 2 بجے تک کھولے جائیں گے۔ کسی وجہ سے ٹینڈر بند مقررہ تاریخ کو جاری اور وصول نہ ہو سکتا تو مورخہ 15-12-12 کو جاری اور مورخہ 17-12-12 کو وصول کر کے کھولے جائیں گے۔ تخمینہ جات کی تصریحات و دیگر تفصیلات دفتری اوقات کار کے دوران دفتر اسسٹنٹ انجینئر یا گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات سے ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

شرائط: (i) مینڈر کے ساتھ حیثیت رجسٹریشن / مطلوبہ زر ضمانت 2% کال ڈیپازٹ بنام اسسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات میں جو کہ کسی بھی شیڈول بینک کی ہولڈ کرنی ہوگی۔ بغیر / کم زر ضمانت والا اینڈر وصول نہ کیا جائے گا۔

(ii) مظلوم / مشروط / ابد ریڈاک بھیجے گئے مینڈر قابل قبول نہ ہونگے۔

(iii) 4.99 فی صد سے زائد کم ریٹ دہندہ ٹھیکیدار کو کم بولی کی رقم کے برابر بطور پرفارمنس سیکورٹی جمع کروانا ہوگی۔ عدم تعمیل کی صورت میں 2% CDR میں تخریر کر لی جائے گی اور ٹھیکیدار اس کے نام سے کیفینسل کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں گورنمنٹ کے تمام موجودہ قوانین بھی نافذ العمل ہونگے۔

(iv) زیر تخطی کو حق حاصل ہوگا کہ بغیر وجہ بتائے کوئی ایک یا تمام ٹینڈرز منسوخ کر دے۔

(v) ان منصوبہ جات کی ایڈمنسٹریشن پر ڈیڑھ لاکھ روپے (150000) کی رقم خرچ کی گئی ہے۔

(vi) اس سینیڈر نوٹس میں شامل منصوبہ جات کے اسٹیٹس کی فی منظوری متعلقہ 1st AUG 2012 TO 31st JAN 2013 PERIOD اس سال کے تحت ہوئی ہے۔

نوٹ: صرف ٹینڈرفارم کی چھپائی کی فیس ادا کرنے کے بعد بلا معاوضہ ٹینڈرفارم دفتر اسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ اینڈ کیونٹی ڈیولپمنٹ سحجرات اور لوکل گورنمنٹ اینڈ کیونٹی ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ آف پنجاب کی ویب سائٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ پروگرام برائے سال 2012-13 حلقہ پی پی 111

نمبر شمار	تفصیل کام	تخمینہ لاگت (لاکھوں میں)	زرمذمانت (ہزاروں میں)	میٹھا کا کام	ٹائیٹل نمبر
1.	تعمیر گھیاں دہالیاں یونین کنسل نمبر 45 سگمراٹ ٹی۔ "تعمیر گھلی جامع مسجد محمدی محلہ مسلم پورہ نزد ڈارچوک" "امانت ٹائی والی محلہ مسلم پورہ" "مرزا عثمان بیک والی محلہ مسلم پورہ" "قاری محمد افضل امام مسجد محلہ مسلم پورہ" "غلام حسین والی محلہ مسلم پورہ" "کاشف بٹ والی محلہ قدرت آباد" "بٹیاں والی اور منیر مہر والی محلہ قدرت آباد"	24,00,000/-	48,000/-	برطانیہ اور آرٹھو	لا

2.	46	41,380/-	20,69,000/-	قبرگیاں دتالیاں یونین کونسل نمبر (A) 46 سگرات ٹٹی۔ "قبرگلی جتڑکا والی محلہ نیامت پورہ" "گلی نمبر 4 راجا رشدوالی محلہ فیروز آباد" "گلی نمبر 6 پتھاریاں والی محلہ خالدا آباد" "مسجد عرفاروق والی نئی آبادی عثمان پورہ" "افضل پہلووان والی محلہ نیامت پورہ" "محمد اکرم والی دینی روڈ محلہ نیامت پورہ" "رشید فوجی والی سے مین گلہ لڈ پورہ عثمان پورہ" "گلی نمبر 2 اختر والی سراج کالونی"
3.	46	42,260/-	21,13,000/-	قبرگیاں دتالیاں یونین کونسل نمبر (B) 46 سگرات ٹٹی۔ "قبرگلی نمبر 6 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "جامع مسجد بلال والی مین سراج کالونی روڈ" "علیپ ستار والی لنک مین سراج کالونی روڈ" "گلی نمبر 8 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "گلی نمبر 2 تاگلی نمبر 3 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "گلی محبوب الہیٹ والی (سائیں گھوٹو) غوث اعظم روڈ اور قبرگلی نمبر 5 کے سامنے محلہ خالدا آباد۔"
4.	47	40,980/-	20,49,000/-	قبرگیاں دتالیاں یونین کونسل نمبر 47 سگرات ٹٹی۔ "قبرگلی سلیم کونسلروالی نزد (چوگلی والی مسجد) سرگودھا روڈ محلہ رحمت آباد" "ذکاء اللہ والی (نعیم جٹ والی) محلہ طارق آباد چٹوکل" "گلی حاجی مرزا احمد ریاض والی (حاجی مشتاق) محلہ خوشیا آباد نزد یلے لائن چٹوکل" "گلی نمبر 1 حاجی یونس والی محلہ امین آباد" "گلی ڈیرہ کجانی بابا اکبر والی اتھاق کالونی" "مرقان چوہان والی محلہ امین آباد" "گلی وتالیاں ارستہ ڈیرہ انصاریاں نزد قبرستان بی گوریاں"
5.	48, 54 & 58	45,340/-	22,67,000/-	قبرگیاں دتالیاں یونین کونسل نمبر 48, 54 & 58 سگرات ٹٹی۔ "قبرگلی مولوی ٹکلیل والی محلہ سلطان پورہ۔ UC-48" "چیمہ سٹریٹ نزد دیوان خاص ہوٹل جی ٹی روڈ سگرات۔ UC-48" "گلی مولوی عظیم والی ملحقہ گلی ارشد عبداللہ والی محلہ سلطان پورہ ۔ UC-48" "علی سٹریٹ اور ملحقہ اکرم کرپانہ شورو والی بیک سائڈ سائنس کالج محلہ سلطان پورہ UC-48" "بچاؤ اور سچائی پائپ لائن گلی نمبر 2 منگور میر والی محلہ غریب پورہ۔ UC-54" "گلی حاجی خالد محمود والی محلہ حسن پورہ۔ UC-54" "گلی سیٹھ مسعود والی اور ذوالفقار بھٹو والی نزد سیٹھی سٹریٹ محلہ رنگپورہ۔ UC-58"
6.	49	41,080/-	20,54,000/-	قبرگیاں دتالیاں یونین کونسل نمبر (A) 49 سگرات ٹٹی۔ "قبرگلی فیصل رٹ والی محلہ چاؤ کھولے والا" "انور ہاشمی والی محلہ چاؤ کھولے والا" "ملک چاند والی نزد اوز شریف پارک" "ملک افضل والی نیا نور پور پٹے نزد اوز شریف پارک "انور رٹ والی محلہ نور پور پٹے سے میراں صاحب روڈ" "عزیز احمد والی محلہ نور پور پٹے سے میراں صاحب روڈ" "مسجد بلال والی جتڑا اختر شاہ کالونی نزد یلے لائن"

چشم کشار پورٹ

ہمارے ہاں انرجی ڈرنکس کی خرید و فروخت
میں سات سو گنا اضافہ کیا رنگ لائے گا؟

انرجی ڈرنکس یا موت کے پیامبر

ان مشروبات کے استعمال سے لوگ ذیابیطس کے مریض بن رہے ہیں

کلیم اللہ فاروقی



7.	تعمیرگیاں و تالیاں یونین کونسل نمبر (B) 49 گجرات ٹی۔	40,100/-	20,05,000/-	//	//
	"تعمیرگلی ملک اسلام والی محلہ قاسم پورہ" "فرنیچر مارکیٹ والی عزیز چوک محلہ قاسم پورہ" "بابر نیاریہ والی میراں صاحب روڈ" "جامع مسجد اقصیہ والی بلحاقل گرین ٹاؤن شاد یوال روڈ" "حاجی اعجاز والی محلہ اختر شاہ کالونی شاد یوال روڈ" "ابوبکر صدیق والی نزدیکی مسجد شاد یوال روڈ"				
8.	تعمیرگیاں و تالیاں یونین کونسل نمبر (C) 49 گجرات ٹی۔	40,440/-	20,22,000/-	//	XEN/TS/CDM/GRT Dt. 20-11-2012
	"تعمیر نالہ محلہ نور پور پٹے تانیا تعمیر شدہ نالہ نزد قبرستان میراں صاحب" "نالہ / گلی محلہ پٹے کھولے بھایا حصہ"				
9.	تعمیرگیاں و تالیاں یونین کونسل نمبر 49 & 53 گجرات ٹی۔	40,900/-	20,45,000/-	//	SE/LG/TS/GRT Dt. 20-11-2012
	"تعمیرگلی چوہدری شیر پڑاوالی نزدوا از شریف پارک UC-49" "دبیر شاہ والی / کریم سٹریٹ محلہ قاسم پورہ UC-49" "زاہد اسلام والی میراں صاحب روڈ محلہ قاسم پورہ UC-49" "گلی / رستہ قبرستان میراں صاحب UC-49" "اسد والی / عبداللہ سٹریٹ / الہی کالونی محلہ مسلم ٹاؤن UC-53" "مظہر حسین والی (رولہ حسن چوک) بارخ باول UC-53"				
10.	تعمیرگیاں و تالیاں یونین کونسل نمبر 53 گجرات ٹی۔	43,280/-	21,64,000/-	//	XEN/TS/CDM/GRT Dt. 20-11-2012
	"تعمیرگلی / نالہ ہمراہ مسلم آباد روڈ تاجا مال پور جناس روڈ اور محلہ گلی نمبر 3"				

استیٹ انجینئر

لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات
برائے ایگزیکٹو انجینئر لوکل گورنمنٹ سرکل گجرات

IPL # 15391

گزشتہ

دونوں میری لینڈ کی رہائشی خاتون
وینڈی کراسلینڈ نے مونسٹر
انرجی کے خلاف مقدمہ دائر کیا
ہے کہ اس کی ۱۴ سالہ بیٹی

انائس فورینر کی موت مونسٹر انرجی ڈرنک سے ہوئی
تھی۔ انائس نے ۲۴ مارچ (۱۰ اپریل لیٹر) مشروب پیا تھا
جس میں ۲۴۰ ملی گرام کیفین تھی جو کہ نئے اسٹینڈرڈز میں
مذکورہ مقدار سے ۶۰ ملی گرام زیادہ تھی۔ نتیجتاً FDA نے ۴
دوسری اموات جن کا تعلق بھی مونسٹر انرجی ڈرنک سے تھا،
کے متعلق تحقیقات شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی مونسٹر
انرجی ڈرنک جس کے شیر کی قیمت گذشتہ دو برس کے دوران
دوگنی ہو چکی تھی کی فروخت صرف ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر ۷
فیصد کم ہو گئی۔

۲۰۰۰ء سے انرجی ڈرنکس کی فروخت میں ۷۰۰ فیصد
اضافہ ہوا ہے۔ مونسٹر کا خوبصورت لوگو، پرکشش سلوگینز کے
ساتھ اشتہارات لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے کافی تھے۔
۲۰۱۱ء میں مونسٹر ڈرنک مارکیٹ کا ۳۵ فیصد شیر رکھتا تھا اور
ریڈ بل کے ۳۰ فیصد مارکیٹ شیر کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا
تھا۔ راک اشار کا مارکیٹ شیر ۱۹ فیصد تھا۔ لیکن اس واقعے کے
نتیجے میں کینیڈین حکومت نئے قوانین کے تحت اس مشروب کی
فروخت پر پابندی لگا رہی ہے۔ یہی نہیں ایسے مشروب جن
سے صحت پر مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کے متعلق اور
انہیں بنانے والی کمپنیوں کے متعلق ڈیٹا جمع کیا جا رہا
ہے۔ ۲۰۰۹ء تک مونسٹر انرجی کے استعمال کے نتیجے میں
۱۵ اموات سامنے آچکی ہیں۔ مونسٹر انرجی کے نمائندے کے
مطابق صرف ایک موت کا انہیں علم ہے۔ وہ یہ ماننے کو تیار
نہیں کہ ان کا مشروب موت کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح
سنٹرل واشنگٹن یونیورسٹی کے ۹ طلبہ ایک پارٹی میں
فور لکوکو (Four Loko) پینے کے نتیجے میں ہسپتال پہنچ
گئے۔ ۱۸ سالہ ڈکونا سیلر بڑے سائز کے دو انرجی کین
استعمال کرنے کی وجہ سے بعد ۵ دن تک ہسپتال میں
رہا۔ ایک اور ۱۸ سالہ آئرش اٹھلیٹ Ross Conney

باسکٹ بال گیم کے چند گھنٹے بعد موت کا شکار ہوا۔ اس
نے ریڈ بل کے ۴ کین استعمال کئے تھے۔ فرانس نے اس
واقعے کے بعد اس مشروب کی فروخت پر پابندی عائد
کر دی۔ جسے ۲۰۰۰ء میں مقدمے کے بعد بحال کیا گیا۔

یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ مشروب بنانے والی
کمپنیاں ایسی رپورٹس موصول ہونے کے بعد کوئی عملی
اقدامات کر رہی ہیں یا نہیں اور یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہیں
کہ واقعی ان کی پراڈکٹ محفوظ ہے یا نہیں؟

یو ایس سبھانس ایبوز اینڈ مینٹل ہیلتھ ایڈمنسٹریشن کے
تحت میوکلینک کے شریک مصنف بکنر کے مطابق ۲۰۰ ملی
گرام استعمال کرنے والے افراد میں اس مشروب کے
استعمال سے رد عمل سامنے آیا ہے۔ کیفین والے مشروب
سے کم از کم چار اموات ہو چکی ہیں۔ بچے ان مشروبات
کے استعمال سے فتنہ انگیزی پر اتر آتے ہیں۔ سنٹر فار
سائنس این پبلک انٹریسٹ کی اسٹڈی کے مطابق یہ
مشروبات بچوں کو hyperactivity کا شکار بناتے
ہیں۔ نیویارک ٹائمز میں گریشن رینالڈز کی ایک رپورٹ
کے مطابق کیفین اور الکحل سے بھرے انرجی ڈرنک فور لوکو
کی تیاری اور فروخت فوری طور پر ممنوع قرار دی گئی ہے۔
۲۰۱۱ء میں ہیلتھ جرنل آف پیڈیاٹرکس نے ”بچوں،
بالغوں، اور نوجوانوں پر انرجی مشروبات کے اثرات“ کے

ایرجنسی میں پہنچنے والے کیس

۲۰۰۵ء میں امریکہ میں قومی سطح پر انرجی ڈرنکس
کے استعمال کے نتیجے میں ایرجنسی میں پہنچنے والے
کل ۱۱۲۸ کیسز تھے جبکہ ۲۰۰۹ء میں یہ تعداد ۱۳۱۲۴ تک
جا پہنچی۔ جو کہ ۲۰۰۵ء کے مقابلے میں ۱۰ گنا زیادہ
تھی۔ اکتوبر سے دسمبر ۲۰۱۱ء میں ۶۷۷ کیس سامنے
آئے۔ اس سال ابھی تک ۳۳۱ کیسز اور ڈوز اور سائیڈ
ایفیکٹس کے سامنے آچکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اب
FDA پر مناسب قوانین بنانے کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے۔

حیران کن انکشاف:

بھارت میں پیپسی اور کوکا کولا کو بطور کیڑے مار دوا استعمال کیا گیا۔ چنانچہ چند ریاستوں میں ان کی فروخت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر اور لوگوں کی awareness کی وجہ سے امریکہ میں ان مشروبات کا استعمال کم ہونا شروع ہوا تو مشروبات بنانے والی کمپنیوں نے شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ، اور جنوبی ایشیاء کو ٹارگٹ کرنے کے لئے اداکاروں، اداکاراؤں، اور کھلاڑیوں کا سہارا لیا۔ ان مشروبات کے متبادل کے طور پر مغربی دنیا اب معدنی پانی کے علاوہ پیپسی نے Aquafina اور Kurkure کوکا کولا Kinley اور Minute Made جیسے برانڈ متعارف کرائے تاکہ آمدنی میں کمی نہ ہونے پائے۔



عنوان سے ایک ڈراؤنی رپورٹ شائع کی۔ اسی طرح نیشنل کونسل آف اسپورٹس اینڈ فٹنس نے ”نوجوان اور انرجی مشروبات“ کے عنوان سے رپورٹ میں متنبہ کیا کہ بچے اسپورٹس ڈرنک اور انرجی مشروبات کا فرق نہیں سمجھتے۔ حال ہی میں میڈیکل جرنل آف آسٹریلیا نے اپنی چونکا دینے والی رپورٹ میں انکشاف کیا کہ کیفین کے استعمال سے متاثرہ ۲۹۷ افراد کی عمریں اوسطاً ۱۷ سال تھیں۔

طبی ماہرین کہتے ہیں کہ سوٹ ڈرنکس، اسپورٹس ڈرنکس اور انرجی ڈرنکس اگر صرف ایک ماہ تک مسلسل استعمال کر لئے جائیں تو زندگی بھر رہنے والی بیماریاں اور صحت کے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ ان کے استعمال سے نہ صرف جسم کا اندرونی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بلکہ نائپ-۲ ذیابیطس، ہڈیوں میں درد کی شکایت اور جلدی تنھن کا شکار ہو کر انسان زندگی بھر کے لئے عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

امریکی ماہرین نے ریڈ بل، سیانک شوٹر، ریڈ لائن کے متعلق رپورٹوں میں کہا ہے کہ یہ بیماریوں کے اچانک حملے، نظر کی خرابی، دل کے امراض اور گردوں اور جگر کی خرابی کا باعث ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انرجی ڈرنک کیا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں استعمال کرتے ہیں؟

ذہنی یا جسمانی توانائی میں فوری اضافہ کرنے والا مشروب جس میں کیفین جیسے محرک کے علاوہ دیگر اجزا شامل ہوں۔ اگرچہ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ انرجی ڈرنک کا استعمال بھی ورزش سے قبل نیوروسکولر ہم آہنگی کی ابتدا کرنے والے (primer) کے طور پر ہو سکتا ہے۔ لیکن اکثر ماہرین اس کے استعمال کے خلاف ہیں کیونکہ ان میں شکر بہت زیادہ ہوتی ہے۔

۲۰۰۷ء سے کیفین کے استعمال سے ۵۰۰۰ واقعات سامنے آئے ہیں جن میں ۴۶ فیصد کی عمر ۱۸ سال تھی۔ بعض انرجی مشروبات میں شکر، امانو ایسڈز، میتھائی

زیادہ فروخت ہونے والا مشروب متعارف کرایا۔ اس کی بنیاد ایک تھائی مشروب Krating Daeng تھا جو خود لپوٹان کی نقل تھا۔ ۱۹۹۷ء سے امریکہ میں ریڈ بل کا مارکیٹ شیئر سب سے زیادہ (۴۷ فیصد) تھا۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں فرکٹوز بیوریتج کمپنی نے "V" کے نام سے بھی ایک مشروب لانچ کیا جو ایس اے بی ملر (SAB Miller) اور مولسن کورز بریوئنگ (Molson) کے نام سے

لیگنٹینتھائنز (Methylxanthines) (بشمول کیفین)، کاربونیڈ واٹر، یربامیٹ، اکائی (acai)، تارین، جنسنگ، مالٹوڈیکسٹریں، انوسٹیل، کارنی ٹائن، کریٹائن، گلوکیورونال ایکٹون، جنکو پلو با، اور گوارانا یا دیگر نباتاتی مرکبات شامل ہوتے ہیں۔ آغاز میں کوکا کولا کو جس میں کوکا کے پتوں اور کوکا نٹس سے حاصل شدہ کیفین استعمال کی جاتی تھی، انرجی ڈرنک ہی سمجھا جاتا تھا۔

سوفٹ ڈرنک اور بچے

سافٹ ڈرنک استعمال کرنے والے بچے موٹاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سوفٹ ڈرنکس میں بھی ایک سے زائد عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں فاسفورک اور سائٹرک ایسڈ، ٹارٹرک اور دیگر نامیاتی تیزابی عناصر دانتوں کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس لئے امریکن بیوریتج ایسوسی ایشن ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں کو اپنی تیار کردہ مصنوعات کو فروخت کرنے سے منع کر رہی ہے۔ نیز ڈرنکس بنانے والی کمپنیوں کو کہا گیا ہے ڈرنکس کے لیبل پر لکھا ہو کہ بچے، حاملہ عورتیں، نرسنگ کے شعبے سے متعلق خواتین اور ایسے لوگ جو کیفین کے لئے sensitive ہوں، ان مشروبات کو استعمال نہ کریں۔

(Coors Brewing) کی جائنٹ وینچر میکن راور کارپوریشن سے ۱۹۰۶ء میں خریدا گیا تھا۔

اسپورٹس مشروبات کا استعمال کیوں؟

گیٹورید، پاور ایڈ جیسے مشروبات میں پانی میں نمک، شکر ایسی نسبت کے ساتھ ملا یا جاتا ہے کہ جسم اسے جلد جذب کر لیتا ہے۔ پسینے کے ذریعے ضائع ہونے والا نمک اور پانی جلد جسم کو واپس مل جاتا ہے۔ مسلسل کام کرتے رہنے کے لئے عضلات کو شکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمک کی تھوڑی سی مقدار ہائپو نیٹریمیا کے خلاف water intoxication کا کام کرتی ہے۔

ریڈ بل کے چار ڈرنک آئرش اٹھیلیٹ کی موت کا باعث بن گئے۔

توانائی بخش مشروبات کی تاریخ

برطانیہ میں ۱۹۲۹ میں لوکوزیڈ (Lucozade) کے نام سے ایک مشروب ہسپتالوں میں مریضوں کی صحت کی بحالی میں مدد دینے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں اسے زائل شدہ توانائی کو بحال کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں امریکہ میں ڈاکٹر ایف (Dr. Enuf) کے نام سے شکاگو کے ایک تاجر ولیم مارک شوارٹز نے اپنے ساتھیوں کی فرمائش پر گئے کے رس، وٹامن بی اور کیفین ملا کر ایک مشروب تیار کیا۔ ۱۹۶۰ء میں جاپان اور ساؤتھ کوریا میں لپو ویتان (Lipovitan) کے نام سے ملتے جلتے مشروب بازار میں لائے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں امریکہ میں جولٹ کولا کے نام سے مشروب تیار ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں پیپسی کو (PepsiCo) نے جوٹا نامی مشروب لانچ کیا لیکن ۱۹۹۹ء اس کی تیاری بند کر دی۔ یورپ میں ایس۔ اسپنر کمپنی نے پاور ہاؤس کے نام سے انرجی ڈرنک متعارف کرایا۔ اس سے قبل آسٹریلیا کے انٹرپرائیوٹر Dietrich Mateschitz نے دنیا بھر میں سب سے



میرا تھن کے دوران

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشروبات کام میں لگن اور خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ان میں حیاتین اور کیمیکلز ہوتی ہیں جو بہت قلیل مدت کے لئے توانائی کا لیول بڑھاتی ہیں۔ ان میں کیفین، ایفی ڈرین، شکر، گوارانا اور جنسنگ وغیرہ ملی ہوتی ہیں۔

در اصل اسپورٹس ڈرنکس کے استعمال کا اصل مقصد کھیل کود میں زائل ہو جانے والی توانائی کی جلد بحالی ہوتا ہے۔ لہذا اگر اسپورٹس ڈرنک کا استعمال ضروری ہی سمجھا جائے تو کھیل کے دوران یا بعد میں کیا جائے، نہ کہ کھیل سے پہلے۔ عموماً اسپورٹس ڈرنکس میں الیکٹرولائٹس موجود ہوتے ہیں۔ یوں سوڈیم کی زیادہ مقدار جسم کو پانی کی نسبت جلد ہائیڈریٹ کر کے توانائی بحال کرنے میں مدد ثابت ہوتی ہے۔ ذہن بیدار رہتا ہے اور سستی طاری نہیں ہوتی۔ ماہرین کے مطابق کھیل شروع ہونے کے بعد ۴۵ منٹ تک کسی مشروب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر موسم بہت گرم ہو تو جب پیاس اور گرمی بہت زیادہ محسوس ہو تو پانی یا اسپورٹس

مشہور انرجی مشروب ریڈ بل کا اہم تارین (taurine) ہے جو کہ سائڈ (نیل) کے پیشہ اور جنسی مادے میں پائی جاتی ہے۔ نیل کے جگالی کر کے نتیجے میں بننے والے تھوک میں بھی تارین ہوتی ہے جسے مصنوعی طریقے سے تیار کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ ریڈ بل کی ۸۰ ملی لیٹر کی بوتل میں ۱۰۰ گرام کیفین کی مقدار کوک کی عام بوتل میں پائی جانے والی کیفین کی مقدار سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یو کے اسٹینڈرڈ ایجنسی اس مشروب کو جس میں ۱۰۰ گرام ۱۰ گرام شکر ملی ہو ”ہائی شکر پراڈکٹ“ کا نام دے رہا ہے۔ ریڈ بل کے ۸ اونس کے کین میں ۲۶ گرام شکر، ۱۳ گرام شکر موجود ہے۔ ریڈ بل عام کھانے والی غذا سے ۵ گنا زیادہ تارین کا حامل ہے۔ بل کے دو کین میں روزانہ غذا میں پائے جانے والے تارین کی مقدار سے ۵۰۰ گنا زیادہ تارین ہے۔ (جگہ کی کمی کے باعث اس کے تمام اجزاء فہرست نہیں دی جارہی)

ڈرنک پینے میں حرج نہیں۔ بلکہ پیاس نہ بھی محسوس ہو تو بھی پانی کا استعمال جاری رکھیں۔ لیکن میرا تھن دوڑ چو کہ ۲ گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہتی ہے، اس میں اٹھلیٹس کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے سے چند گھونٹ پانی یا کسی اچھے اسپورٹس ڈرنک کا پینا سودمند ثابت ہوتا ہے۔ میرا تھن دوڑ کے راستے میں تقریباً ۸ تک واٹر اسٹیشن ہوتے ہیں۔ اور اکثر اٹھلیٹس ہر اسٹیشن پر ر کے بغیر پانی یا اسپورٹس ڈرنک کا استعمال کرتے ہیں۔

کیضین والے مشروب کم سے کم چار جانبی لے چکے ہیں۔

ریڈ بل کی حقیقت اور وارننگ

حقیقت یہ ہے کہ ریڈ بل کو ویتنام جنگ میں امریکی سپاہیوں کا مورال بلند رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا تاکہ جنگ کے نتیجے میں ذہن پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو کم کیا جائے۔ لیکن اس کے استعمال کے نتیجے میں مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات جیسے مائیکرین دماغی رسولی اور جگر کے امراض پیدا ہوئے۔ اس میں وٹامنز ملا کلو کیورونولیکون جیسا انتہائی خطرناک کیمیکل استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے فرانس اور ڈنمارک اسے Cocktail of Death (موت کا مشکل مشروب) کا نام دیتے ہیں۔ اسی مشروب کو اب دوسرے اجزاء ملا کر بازار میں لایا گیا ہے جو انتہائی خطرناک اور مضر ہے۔ چنانچہ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر خالکا گیارا..... ایم ڈی، یوسی ایل اے کی تحقیق کے نتیجے میں وارننگ دی گئی کہ:

۱۔ اس کے استعمال کے بعد جسمانی مشقت نہ کی جائے، کیونکہ دل کی دھڑکن کو تیز کرتا ہے اور اچانک موت کا باعث ہو سکتا ہے۔

۲۔ اس کے استعمال کے نتیجے میں سیریرل بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ اس میں الکحل کی ملاوٹ سے یہ مشروب مرگ کا بم (death bomb) بن جاتا ہے جو براہ راست جگر پر حملہ آور ہوتا ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے ناکارہ بناتا ہے۔ ۴۔ اس میں وٹامن ب-۱۲ ہوتا ہے جو کو ماٹ جانے والے مریضوں کو دیتے ہیں اور اس کے باوجود اثرات ہائپرٹینشن اور excitement پیدا کرتے ہیں



انسان نشے کی حالت میں ہو۔

۵۔ اس کا مسلسل استعمال مستقل اور ناقابل علاج اعصابی امراض کا باعث ہو سکتا ہے۔

یہ مشروبات اپنے مردانہ قسم کے ناموں جیسے ریڈ بل، مونستر، روک اسٹار، پم جوس اور زبردست تشریح کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کھینچتے ہیں اور ایک تہائی نابالغ اور نو جوان ان تشریح سے متاثر ہو کر بلا وجہ مسلسل انرجی ڈرنک استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۶ سال سے کم عمر کے بچے بھی استعمال کرتے ہیں جو نہیں جانتے ہوتے کہ کیضین الکحل ملا مشروب رطوبت کو ختم کرتا ہے، صحت تباہ کر رہا ہے۔

انرجی مشروبات کے استعمال پر پابندی ریڈ بل کی فروخت پر فرانس میں پابندی لگائی جا چکی ہے۔

ہے۔ ترکی نے پابندی لگانے کی دھمکی دی۔ چنانچہ فوراً ریڈ بل میں کیفین کی مقدار کو نصف کر کے حکومت کو مطمئن کیا گیا۔ سویڈن، ڈنمارک اور ناروے میں اسے دوا کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ جاپان میں ماضی قریب میں ریڈ بل صرف فارمیسیز پر دستیاب تھی۔ کینیڈا نے حال ہی میں بڑی مشکل سے ریڈ بل، مونسٹر انرجی، روک اسٹار وغیرہ کو اس شرط پر فروخت کی اجازت دی ہے کہ وہ اس سال کے آخر تک کیفین کی مقدار محدود کر دیں گے۔ نیز مشروبات کے لیبل پر واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ اسے بچے، حاملہ خواتین، اور شیر خوار بچوں کی مائیں، یا وہ لوگ جن کے لئے کیفین کا استعمال ممنوع ہے، اسے استعمال نہ کریں اور ان مشروبات کو الکحل کے ساتھ ملا کر نہ استعمال کیا جائے۔ مزید یہ کہ یومیہ ۵۰۰ ملی لیٹر سے زیادہ ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

کئی برطانوی تعلیمی اداروں نے انرجی مشروبات پر

پابندی لگائے رکھی۔ میکسیکو ملٹری انسٹی ٹیوٹ نے انرجی میں انرجی ڈرنکس کی فروخت پر پابندی لگا دی ہے۔ لٹویا نے جون ۲۰۱۲ء میں ۱۸ سال سے کم بچوں کیلئے پابندی لگائی۔

ریڈ بل کمپنی کا وڈکا ریڈ بل نامی مشروب جس میں الکحل شامل ہے وہ رم اور کوک ملے مشروب سے زیادہ طاقتور ہے۔ Four Loko اور Joose میں بھی کیفین

یہ مشروب دل کے اچانک حملے، گردوں اور جگر کے تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔

کے ساتھ الکحل ملی ہوتی ہے جو صحت کے لئے مضر ہے۔ ہیومن پرفارمنس لیبارٹری کے محققین کیفین اور الکحل کو ملا کر استعمال کرنے کے خلاف ہیں۔ اسی لئے ۲۰۱۰ء کو فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن نے چار کمپنیوں: چارٹرڈ بیورج کارپوریشن، نیو سینجری بریوئنگ کمپنی، فیوڈ پروڈیکٹس اور یونائیٹڈ برانڈ کمپنی انک کو وارننگ دی کہ ان کے مالٹ الکحل مشروبات میں کیفین ملا کر استعمال کرنا غیر محفوظ ہے۔ اس کی خلاف ورزی پر ان مصنوعات ضبط کر لی جائیں گی۔

ایرانی محققین کیا کہتے ہیں

ایرانی محققین نے ریڈ بل اور ہاپ کو ورزش پہلے کھلاڑیوں کو استعمال کرایا تو آکسیجن کی انتہائی کم استعمال زیادہ تھی اور سانس پھولنے میں زیادہ دیر لگا۔ کیفین کارکردگی میں یقیناً اضافہ کرتی ہے لیکن اسپورٹس ڈرنکس میں استعمال نہیں ہوتی۔ جبکہ زیادہ انرجی ڈرنکس میں کیفین موجود ہوتی ہے۔ کیفین کا پہلی استعمال لازماً کارکردگی پر مثبت اثر ڈالتا ہے۔ دوسری



■ مصروفیات
■ مشاغل
■ کارنامے

یارانِ وطن دیارِ غیر میں

ماہِ نورِ فیصل

دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کے دل ہر وقت پاکستان کے لیے دھڑکتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آج تک پاکستان کو نہیں بھلایا، پاکستان نے بھی اور ہم نے بھی اُن کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھلایا۔ آئیے..... ۲۸ پاکستانیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سید زوہیب احمد سے ملتے ہیں۔ آپ آج کل کینیڈا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آخر میں ایک جرمن قیصل کی داستان پڑھیں، باپ کی نگاہ میں اسلام صرف کلمہ پڑھادینا ہے، لیکن صرف کلمہ کیا کچھ کر سکتا ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹ سالہ زوہیب احمد

اولیول کے ۲۸ مضامین میں A گریڈ

اور تمام ۲۸ مضامین میں اے گریڈ حاصل کر کے ”اولیول“ میں ورلڈ ریکارڈ قائم کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ ریکارڈ ابراہیم شاہد نے ۲۳ مضامین میں اے گریڈ حاصل کر کے قائم کیا تھا اور اسے سید زوہیب احمد نے ۲۸ اے گریڈ حاصل کر کے توڑا ہے۔

سید زوہیب احمد نے اے لیول کے (یونیورسٹی آف

کی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ۱۹ سالہ واہ کینٹ پاکستان کے نوجوان سید زوہیب احمد نے ”اولیول“ کا امتحان (یونیورسٹی آف کیمبرج انٹرنیشنل Edexcel لندن انٹرنیشنل) بورڈز کے تحت پاس کیا

کینیڈا

(روپے) سپارک گورنٹ (۲۵۰ ملی لیٹر۔ قیمت: روپے)، پاور آپ (۳۰۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۹۰ روپے) اسٹنگ (۵۰۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۲۵ روپے)۔ ان مشروبات کے بلا ضرورت چند ماہ تک مسلسل استعمال کی وجہ سے ذیابیطس کے مریض بن چکے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ حکومت کے ادارے نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ پی سی ایس آر کے حکام سے بار بار رابطہ کرنے پر جواب ملا ہمارے پاس معلومات ہوں بھی تو نہیں دے سکتے صرف سرکار کو بتاتے ہیں۔ پھر یہ تو اسلام آباد ادارے کا مسئلہ ہے۔ لاہور تو صوبائی حکومت کے کار میں آتا ہے۔ خدا جانے عوام کی صحت کس دائرے میں آتی ہے۔

ہم نے بڑے بڑے سٹورز کا وزٹ کیا تو ریڈ کے ڈسپلے فریج میں سب سے نمایاں جگہوں پر دیکھے ان کی فروخت کے اعداد و شمار بھی حیران کن پریشان کن تھے۔ ۲۰۰/۷۰۰ گنا تک اضافہ کیا گیا ہے۔ نوجوانوں کی بڑھتی طلب دیکھ کر گورنمنٹ فوڈز بھی اپنا انرجی ڈرنک مارکیٹ میں لے آئی ہے کتنے ہی جعلی انرجی ڈرنکس بھی دستیاب ہیں۔ ہم تو اسی صدمے سے نہیں نکل پائے تھے کہ پیپسی جیسی میں ۲۱/۲ چھچھنی کے مقابلے میں ماؤنٹین ڈیو ۱۱/۲ چھچھنی پائی جاتی ہے اور عدالت نے اسے ڈرنک کے زمرے سے نکال کر انرجی ڈرنک میں شامل کرنے کا کہا ہے۔

انرجی ڈرنک چونکہ ان دنوں فیشن میں ہیں جیسے کی زبان میں ’ان‘ کہتے ہیں۔ ایسے میں اندھے کنویں نہیں آتے۔ یہ بھی تحقیق و جستجو کے بعد دی گئی وارننگ ہے۔ امریکہ اور یورپ کی بیرونی کے بغیر سانس نہیں وہاں پابندی کی باتیں ہو رہی ہیں اور ایسی باتیں ہم سنتے پڑھتے ہیں۔

اتنا اثر نہیں ڈالتا، اور مسلسل استعمال کارکردگی پر مثبت اثرات کا حامل نہیں ہوتا۔ البتہ نفسیاتی اثر قائم رہتا ہے۔ وہاں بھی روک اسٹار، مونسٹر، ریڈ بل اور ایمپ کے خوبصورت کین اسٹورز پر نظر آتے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ انھیں اپنی اسپورٹس کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے کوچ انھیں اس کی ترغیب دیتے ہیں۔

شوگر فری ریڈ بل زیادہ نقصان دہ

ایک اور تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ اٹھلیٹس جو اس کے عادی تھے ان میں شوگر فری Red Bull جو کہ کیفین سے بھری ہوئی تھی، کارکردگی میں اضافہ نہیں کرتی۔ اور یہ پیشاب آور ہوتی ہے، اس لئے ناہیدہ کاری یعنی جسم کی رطوبت کو ختم کرنے (dehydration) کا باعث ہوتی ہے۔ جس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔

پاکستان میں اس وقت ۵ کے لگ بھگ انرجی ڈرنکس زیادہ مقبول ہیں۔ ریڈ بل، (۲۵۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۱۵۰



ان سب سے بڑے ہیں۔

سید زوہیب اسد آج کل کینیڈا کی یونیورسٹی میک گل میں زیر تعلیم ہیں اور اکنامکس و انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ میں ڈبل میجرز کر رہے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ انہیں اپنے ملک پاکستان سے بے انتہا محبت ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اپنے ملک کی معیشت کی بہتری کے لیے کام کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ اپنی ان کامیابیوں کو اپنے والدین کی دعاؤں اور اپنے اساتذہ کرام کی محنت کا صلہ قرار دیتے ہیں۔

زوہیب نے بتایا کہ ان کو کرکٹ بہت پسند ہے۔ سچا خواہ کسی بھی ٹیم کا ہو وہ اسے ضرور دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے سکول کی فٹ بال ٹیم کے کپتان اور سکول کے ہیڈ بوائے بھی رہ چکے ہیں۔

زوہیب کا کہنا تھا کہ ہم طالب علموں کو چاہیے کہ ہم صرف ریکارڈ بنانے کے لیے ہی نہیں بلکہ ملک کی ترقی اور اپنا پرچم دنیا میں سر بلند رکھنے کے لیے محنت کریں۔

کیمبرج انٹرنیشنل اور Edexcel لندن انٹرنیشنل بورڈز کے امتحانات میں بھی ۱۱ اے گریڈ حاصل کیے ہیں۔ زوہیب اسد نے میڈیسن، انجینئرنگ، اکنامکس، بزنس سوشیالوجی، ٹریول اینڈ ٹور ازم، سٹیٹسکس، جنرل پیپرز، کامرس، نفسیات، ورلڈ جیوگرافی، انوائرنمنٹل مینجمنٹ، Thinking Skills اور دیگر مضامین کا انتخاب کیا۔ سید زوہیب اسد نے اپنی تعلیم بیکن ہاؤس واہ کینٹ اور موٹر وے کیمپس، راولپنڈی سے حاصل کی۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ خاندان سے ہے۔ ان کے والد ڈاکٹر سید اسد علی جنرل فزیشن اور سونالوجسٹ جبکہ والدہ طلعت شیرازی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا ہوا ہے۔ زوہیب اسد کی ۲ بہنیں اور ایک بھائی ہے اور وہ

پاکستان کے روشن مستقبل سے پُر امید ہیں اور ان کے خیال میں اگر محنت اور ایمانداری کو اپنا وطیرہ بنالیا جائے تو پاکستان کی ترقی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی ہے۔ ہم میں سے ہر نوجوان کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے دنیا کو ثابت کر کے دکھانا ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں۔

زوہیب نے اسلام آباد میں Human & Social Biology میں ٹاپ کیا اور Cambridge Outstanding Learner ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنرل پیپر میں کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے پورے اسلام آباد میں ٹاپ کیا۔ زوہیب کا کہنا ہے ”محنت کامیابی کی علامت ہے۔ اگر انسان نیک نیتی، جذبہ اور سچی لگن سے کوئی کام کرے تو اللہ تعالیٰ اسے محنت کا اجر ضرور دیتا ہے اور کامیابیاں انسان کے قدم چومتی ہیں۔“

زوہیب کے مطابق انسان کو غرور ہرگز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی کامیابیوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ زوہیب اپنے ملک کے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے مطابق ہر بچے کو تعلیم کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں تاکہ ہر بچے کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آسکیں۔ اس کے علاوہ غیر انصافی سرگرمیوں کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ زوہیب اسد نے ناصرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کا نام فخر سے بلند کر دیا۔

Mc Gill University کے پرنسپل نے زوہیب کے نام ایک آگاہی خط لکھا جس میں انہوں نے زوہیب کو ۲۸ اے گریڈ لے کر ”اولیول“ میں ورلڈ ریکارڈ بنانے پر مبارکباد دی اور ان کو یونیورسٹی کا حصہ بننے پر خوشی کا اظہار کیا۔ The Mc Gill Tribune کی ایک رپورٹ میں زوہیب کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور سراہا گیا۔ سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی طرف سے سید زوہیب اسد کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقع پر زوہیب کی دونوں بہنیں اور بھائی سلمان حیدر اور والدین کو بھی پرائم منسٹر ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔

زوہیب کا کہنا ہے کہ ان کے والد ڈاکٹر اسد علی نے محنت اور لگن سے کام کیا اور ہمیں اس مقام تک پہنچایا۔ زوہیب کے والدین کا کہنا ہے ”اللہ کا بے حد شکر ہے کہ ہمارے بیٹے کو اس کامیابی سے نوازا اور دنیا میں زوہیب کے نام کو ہماری پہچان بنا دیا۔“

زوہیب کے نانا سید شوکت علی شیرازی اور تمام اہل خاندان زوہیب کی اس کامیابی پر بے حد خوش ہیں۔ زوہیب کے والدین زوہیب کے اساتذہ کے مشکور اور اس کی کامیابی کو ان کی محنت اور دعاؤں کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ زوہیب اسد جیسے بچے ہمارا روشن مستقبل ہیں۔ یہ جہد مسلسل اور لگن سے کام کرنے والے نوجوان ہیں، جن کے لیے اقبال کا پیغام تھا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

زوہیب کی والدہ کا کہنا ہے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

زوہیب کہتے ہیں کہ وہ اس پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

جرمنی کے مرزا بشارت حسین

وکھری ٹاپ کے پاکستانی

عطاء الحق قاسمی اپنے دورہ جرمنی کی روداد میں لکھتے ہیں: برلن میں میری ملاقات ایک ”وکھری ٹاپ“ کے پاکستانی سے بھی ہوئی۔ ان کا نام مرزا بشارت حسین ہے۔ سچی بات پوچھیں تو ان کی شخصیت ایک پورے خاکے کی مستحق ہے، تاہم اس کی ایک جھلک دکھانے کے بعد میں آپ کو وہ حیرت انگیز واقعہ سنانے میں دلچسپی رکھتا ہوں جو ان کی ۱۹ سالہ بیٹی یاسمین کے ساتھ پیش آیا۔ اس سے



حفیظ جالندھری کی باتیں

وہ اپنی خوبصورت شاعری، ترنم کے ساتھ ساتھ بے باکی، خوددستی اور صاف گوئی کے لیے بہت مشہور تھے

انھیں اپنی ذات، اشعار اور اختیار کا بہت پاس تھا
”شاہنامہ اسلام“ اور ”قومی ترانے“ کے خالق ممتاز شاعر
کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات

جمیل یوسف



طالبات میں مرزا صاحب کی بیٹی یاسمین کا نام بھی شامل تھا۔ اسرائیل کے دورے کے دوران انہیں مسجد اقصیٰ بھی لے جایا گیا۔ جب وہاں سے واپس جانے لگے تو یاسمین نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور کہا وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ اس کی ٹیچر نے اسے بہت سمجھایا لیکن جب وہ نہ مانی تو اس کے والد مرزا صاحب کو فون کیا گیا۔ مرزا صاحب نے بھی ہر ممکن طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر دوسری طرف سے ہچکیوں میں جواب ملا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ٹیچر سے کہا کہ وہ اسے مسجد اقصیٰ ہی میں چھوڑ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، وہ بجی ۳ ردن مسجد میں رہی اور جب واپس برلن پہنچی تو اپنے والد سے کہا کہ اسے کچھ پیسے چاہئیں۔ اس نے جتنے پیسے مانگے مرزا صاحب نے اسے دے دیے۔ وہ بازار گئی اور اسکا رف خرید لائی۔ اس دن کے بعد سے آج تک اس نے مغربی طرز زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور نہ صرف یہ کہ خالص اسلامی طرز زندگی اختیار کر چکی بلکہ اپنی چار پانچ جرمن سہیلیوں کو مشرف بہ اسلام بھی کر چکی ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا میں نہیں جانتا، یہ روحانی دنیا کا اسرار ہے اور ان بھیدوں سے میں واقف نہیں ہوں۔

پہلے مرزا صاحب کے بارے میں یہ جان لیں کہ اس وقت ان کی عمر ۵۸ سال ہے۔ دو، چار جرمن خواتین سے شادی کر کے انہیں چھوڑ چکے ہیں، جبکہ ان کا کہنا ہے کہ جرمن بیویاں بہت وفادار ہوتی ہیں۔ میں نے مرزا صاحب سے پوچھا ”ان دنوں آپ جس خاتون کے ساتھ رہ رہے ہیں کیا میں سمجھوں کہ یہ آپ کی آخری بیوی ہے؟“ بے ساختہ بولے ”اللہ نہ کرے“ میں نے ابھی جس واقعہ کا حوالہ دیا ہے اس کے بیان سے پہلے یہ پس منظر بتانا ضروری ہے کہ مرزا صاحب ۱۹۷۵ء میں منڈی بہاؤ الدین سے ترک وطن کر کے جرمنی میں آباد ہو گئے تھے اور یوں اب ان کے طور اطوار مکمل طور پر جرمن ہیں۔ چنانچہ ان کے بقول انہوں نے اپنے بچوں کو صرف کلمہ پڑھایا اور اس کے بعد انہیں آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو بننا چاہیں بن سکتے ہیں۔ اس آزادانہ فکر کے ماحول میں ان کے بچے پروان چڑھے اور مکمل طور پر جرمن سوسائٹی کا حصہ بن گئے۔ ایک مرتبہ ان کی بچی کے سکول والوں نے ۲۰ طلبہ و طالبات کو اسرائیل بھیجنے کا فیصلہ کیا، جن کے متعلق ان کی رپورٹ تھی کہ وہ یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں، تاکہ اس دورے سے ان کے دلوں سے یہودیوں کی نفرت ختم کی جاسکے۔ ان طلبہ و

صاحب کسی کے رعب اور دیدے میں ہرگز نہیں آتے تھے اور نہ ہی کسی پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے۔ سب بڑے بڑوں کو ڈانٹ پلا دیتے۔ سید ضمیر جعفری اور عزیز ملک نے جو حفیظ کے بہت قریب رہے ہیں، مجھے کئی واقعات سنائے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنے سے بڑا نہ سمجھتے۔ کسی کی قصیدہ گوئی اور خوشامد کرنا تو درکنار وہ کسی سے جھک کر ملنا بھی کسر شان سمجھتے۔ چاہے کوئی بہت بڑا سرکاری افسر ہو یا کوئی وزیر، وہ اپنا مقام و مرتبہ اس سے اوپر ہی سمجھتے اور اسی کے مطابق گفتگو کرتے۔ البتہ چھوٹوں سے ان کا رویہ محبت اور شفقت والا ہوتا اور عام آدمی سے برابر کی سطح پر بات کرتے۔

کس میں جرات تھی جو وزرا سے کرسیاں خالی کرواتا

جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے تو حیدر آباد میں گل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت خواجہ ناظم الدین صاحب نے کرنی تھی۔ سید ضمیر جعفری راوی ہیں کہ مشاعرہ گاہ میں جانے سے قبل سبھی شاعر دوسرے ہال میں عشائیے کی دعوت میں جمع تھے۔ کھانے کے بعد سبز قبوے کا دور چلا۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ گورنر جنرل تشریف لایا چاہتے ہیں۔ شعرائے کرام سے درخواست کی گئی کہ مشاعرہ گاہ میں تشریف لے جا کر اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ جب شعراء جناب حفیظ جالندھری کی قیادت میں مشاعرہ ہال میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جو کرسیاں سٹیج پر شعرائے کرام کے لیے

رکھی گئی ہیں، ان پر وزرائے کرام اور دوسرے سربراہان اور معززین براجمان ہیں۔ صدر مشاعرہ کی کرسی کے علاوہ اور کوئی خالی نہیں۔ شعراء تو سٹیج کے قریب پہنچ کر رُک گئے مگر حفیظ سیدھے اوپر جا پہنچے اور شعراء کی نشستوں پر قابض وزرائے کرام سے باوازی بلند فرمایا ”جناب! یہ کرسیاں خالی کر کے سٹیج سے نیچے تشریف لے جائیں۔“ وہ پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب حفیظ صاحب نے اپنا مطالبہ دہرایا اور اس اثنا میں کچھ اور شاعر بھی حفیظ صاحب کی اقتدا میں سٹیج پر جا پہنچے تو ان حضرات کو اٹھتے ہی بنی۔ نیچے ہال میں بھی کوئی نشست خالی نہ تھی۔ خیر منتظمین نے دوڑ بھاگ کر کے پہلی قطار کے آگے ایک اور صف لگائی۔ ابھی یہ اکھاڑ پچھاڑ جاری ہی تھی کہ صدر مشاعرہ جناب خواجہ ناظم الدین تشریف لے آئے۔ اس اثنا میں شعرائے کرام اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ سید ضمیر جعفری بتاتے ہیں کہ حفیظ صاحب نے سٹیج پر وزرائے کرام کو عالی جاہ یا سرجیسے الفاظ سے خطاب نہیں کیا اور نہ انھیں ہنستے مسکراتے ہوئے جھک کر سلام کہا۔ اگر وہ کرسیاں خالی نہ کرواتے تو منتظمین مشاعرہ میں سے کسی کی اتنی جرات نہ تھی جو وزیروں کو جا کر کہتا کہ کرسیاں خالی کر دیں اور پھر اس پر فوری عمل بھی کرواتا۔ منتظمین میں ہمت اور سلیقہ ہوتا تو وہ پہلے ہی کسی کو سٹیج پر نہ بیٹھنے دیتے اور وزراء کے لیے نیچے پہلی صف میں نشستیں خالی رکھتے۔

کس حکیم نے مشاعرے میں آنے کا کہا تھا؟

ستمبر ۱۹۶۸ء میں چٹاگانگ میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ میں ان دنوں چٹاگانگ میں ہی

مسلسل کھسر پھسر کرتے میان بیوی کو مخاطب کر کے بولے:

”جب مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں تو کس حکیم نے کہا تھا مشاعرے میں آؤ“

تقینات تھا اور اس مشاعرے میں موجود تھا۔ سامعین کی پہلی صف میں ایک بڑا افسر اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کیا مسئلہ تھا، وہ میاں بیوی آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ان کی کھسر پھسر مشاعرے میں خلل ڈال رہی تھی مگر وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو انھیں یہ کہتا کہ براہ کرم خاموشی اختیار کریں اور لوگوں کو مشاعرہ سننے دیں۔ بطور آخری شاعر حفیظ صاحب مائیک پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص ترنم میں مشہور غزل کا مطلع سنایا:

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

حفیظ صاحب ابھی مطلع پڑھ ہی رہے تھے کہ ان میاں بیوی کی کھسر پھسر پھر گونجی۔ حفیظ صاحب رک گئے اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا ”جب مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں تو کیا تمھیں کسی حکیم نے کہا تھا کہ مشاعرے میں آؤ۔“ یہ سن کر اس کی بیگم تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ صاحب بھی اٹھے اور سر جھکائے چپ چاپ رخصت ہو گئے۔

شاعر ہوں، سیکشن آفیسر نہیں

ایک بار حفیظ صاحب کے کسی بھی خواہ نے صدر ایوب کو یہ پٹی پڑھائی کہ اگر انھیں شاہنامہ اسلام کی تکمیل پر کسی طرح راغب کیا جائے، انھیں مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں اور وہ شاہنامہ کی چوتھی جلد سے آگے تاریخ اسلام کے بقیہ واقعات بھی نظم کر کے سلسلہ آپ (یعنی صدر ایوب) تک بھی پہنچا دیں تو یوں آپ غیر فانی ہو جائیں گے۔ چنانچہ حفیظ صاحب کو مرکزی وزارت اطلاعات میں جوائنٹ سیکرٹری کا عہدہ پیش کر دیا گیا۔ رہائش کے لیے راولپنڈی صدر میں ایک وسیع و عریض کوٹھی ملی۔ جملہ لوازمات کے ساتھ ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی خدمات سپرد کر دی گئیں، جو ۲۴ گھنٹے حاضر رہتا۔

حفیظ صاحب سیدھے سٹیج پر پہنچے اور باوازی بلند وزراء سے کرسیاں خالی کرنے کو کہا نہ یہ حوصلہ کسی میں تھا نہ سلیقہ

حفیظ صاحب کو کسی دفتر میں آنا جانا نہ ہوتا۔ شاہ نامہ اسلام لکھنے کے علاوہ کوئی سرکاری مصروفیت نہ تھی۔ حفیظ صاحب ٹھاٹھاٹ سے سرکاری کوٹھی میں براجمان ہوئے اور سرکاری دی ہوئی سہولتوں کے مزے لینے لگے۔ پانچ چھ ماہ کا عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ انھوں نے شاہ نامہ اسلام میں کسی شعر کا اضافہ نہ کیا۔ بس کبھی کبھار کوئی تازہ غزل ہو جاتی جو وہ اپنے قریبی دوستوں سید ضمیر جعفری اور عزیز ملک کو سنا کر خوش ہو لیتے۔ ادھر ادھر کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہاں چلے جاتے۔

ایک دن وزارت اطلاعات کے کسی جوائنٹ سیکرٹری کو خیال آیا کہ حفیظ صاحب نے اپنے کام کی پیش رفت سے کبھی آگاہ نہیں کیا۔ معلوم کرنا چاہیے کہ کام کہاں تک پہنچا؟ اس شامت کے مارے نے حفیظ صاحب کو فون کر دیا کہ آپ اپنے کام کی ”پراگریس رپورٹ“ بھیجیں۔ حفیظ صاحب نے استفسار کیا کہ پراگریس رپورٹ سے کیا مراد ہے؟ وضاحت ہوئی کہ اب تک جتنے اشعار لکھے ہیں ان کی نقل بھیجیں۔ یہ کام سیکرٹری صاحب کو ”اپروول“ (منظوری) کے لیے پیش کرنا ہے۔

یہ سننا تھا کہ حفیظ صاحب تیخ پا ہو گئے، کہنے لگے، ”میرے اشعار کو سیکرٹری منظور کرے گا؟ یہ کوئی دفتری ڈرافٹ ہے جو اس کی خدمت میں پیش کیا جائے؟ میں شاعر ہوں کوئی سیکشن آفیسر نہیں کہ آپ میری تحریر منظور یا نا منظور کریں۔“

جوائنٹ سیکرٹری صاحب کہنے لگے ”دیکھیں نا حفیظ

صاحب، آپ حکومت پاکستان کے ملازم ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آپ کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔“

یہ سننا تھا کہ حفیظ صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگے ”آپ کو کس بے وقوف نے بتایا کہ میں حکومت پاکستان کا ملازم ہوں۔ میں نہیں، حکومت پاکستان میری ملازم ہے۔“ یہ کہہ کر حفیظ صاحب نے فون بند کر دیا۔ عزیز ملک مرحوم بتایا کرتے تھے کہ جب یہ گفتگو ہوئی تو وہ حفیظ صاحب کے قریب بیٹھے تھے۔ بعد میں ملک صاحب نے ان سے کہا ”حکومت آپ کو تنخواہ دیتی ہے اور ڈھیر ساری سہولتیں بھی دے رکھی ہیں۔ لہذا وہ کام کے بارے میں بھی پوچھیں گے۔“ حفیظ صاحب نے گرما گرمی میں جواب دیا ”میں کوئی دفتری بابو ہوں جو فائلیں لکھ لکھ کر پیش کروں؟ مجھے شاعر رکھا گیا ہے۔ آمد ہوگی تو شعر لکھ دوں گا۔“

جنرل فاروقی کے سہرے پر ڈبکیاں
حقیقت یہ ہے کہ حفیظ فرمائش پر طبعاً لکھ ہی نہیں سکتے تھے، نہ کسی کا سہرا نہ قصیدہ۔ وہ خوشامد سے بہت دور تھے۔ کافی عرصے بعد اسی طرح کا ایک اور واقعہ راولپنڈی کلب میں پیش آیا۔ میجر جنرل فاروقی پاک فوج کی میڈیکل کور کے سربراہ تھے۔ انھوں نے اپنی ایک منظور نظر نرس سے شادی کر لی۔ ماتحت افسروں نے دولہا اور دلہن کو مبارک باد پیش کرنے کے لیے راولپنڈی کلب میں تیراکی کے تالاب کنارے ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا۔ کچھ من چلے نو جوان افسر حفیظ صاحب کے درپے ہو گئے کہ جنرل صاحب کا سہرا پڑھا جائے۔ ان لوگوں نے یوں حفیظ کا

جنرل صاحب کی اشعار پر ناراضی دیکھ کر ان کے کچھ افسروں نے حفیظ صاحب کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا

گھیراؤ کر لیا کہ انھیں محفل میں آتے ہی بنی۔ وہاں پھرونی رقصہ والی بات ہو گئی۔ حفیظ نے جو سہرا پڑھا اس میں جنرل صاحب کا مذاق اڑایا گیا۔ مجھے اس سہرے کا ایک مصرع یاد ہے۔
یہ شادی ساٹھے پاٹھے کی ہے، پختہ کار ہے سہرا

رنگ میں بھنگ پڑ گئی اور دولہا میاں کا مزاج بگڑ گیا۔ نو جوان افسر تو بے حد منت سماجت کر کے حفیظ صاحب کو اپنے جنرل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لائے تھے، اب معاملہ الٹ ہو گیا۔ ایک جرنیل کی برسر محفل جو نیر افسروں اور سیرالی مہمانوں کے سامنے بے عزتی کوئی معمولی بات نہ تھی۔

جنرل کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ افسروں نے حفیظ صاحب کو اٹھایا اور تالاب میں پھینک دیا۔ کچھ لوگ انھیں بچانے کے لیے دوڑے۔ حفیظ نے چند غوطے ہی کھائے تھے کہ انھیں نکال لیا گیا۔ وہ پانی میں شرابور تھے اور لباس تر ہوتا تھا۔ اسی عالم میں کسی صاحب نے ان کا بازو تھاما اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچایا۔

گوہر ایوب کی شادی اور سہرا لکھنے کی فرمائش

اسی زمانے کا واقعہ ہے، صدر ایوب کے بیٹے گوہر ایوب کی شادی خانہ آبادی تھی۔ سید ضمیر جعفری کا بیان ہے کہ بریگیڈیئر گلزار احمد انھیں لینے آئے اور کہا ”آئیے شاعر پاکستان حفیظ جالندھری کو بھی دیکھتے ہوئے چلیں۔ اگر وہ ابھی تک روانہ نہیں ہوئے، تو انھیں بھی لے لیں۔“ جب یہ دونوں اصحاب حفیظ صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو پتا چلا وہ آرام فرما رہے ہیں۔ جعفری صاحب اندر گئے۔ دیکھا تو نیچے قالین پر لیٹے ہیں۔ بولے ”حفیظ صاحب یہ کیا؟ ملک کے ولی عہد کی شادی ہے اور ملک اشعرا تقریب میں جانے کے لیے ابھی تیار ہی نہیں ہوئے۔“

حفیظ صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا ”میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ سہرے کی فرمائش ہے لیکن میں کہاں ان کا سہرا لکھتا پھروں؟ آپ میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا۔ طبیعت ناساز ہے۔“ چنانچہ حفیظ صاحب صدر پاکستان کے بیٹے کی شادی پر نہیں گئے۔

میں تمھارا باپ ہوں

جعفری صاحب مزید بتایا کرتے تھے کہ جنگ عظیم دوم میں جب برطانوی ہند حکومت نے ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کی ترغیب دینے کے لیے محکمہ ساگ پبلیٹی قائم کیا تو حفیظ صاحب ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ اب حفیظ صاحب اپنے آپ کو باقاعدہ جرنیل تصور کرنے لگے اور جرنیلی آن بان سے گفتگو کرتے۔ کسی بریگیڈیئر سے ملاقات ہوتی تو اسے اپنے سے جونیئر سمجھ کر تو اور تم کہہ کر مخاطب کرتے۔ مسلمانوں میں اس وقت سینئر افسر بریگیڈیئر گلزار احمد ہی تھے۔ وہ تو ویسے بھی خود کو حفیظ صاحب کا نیاز مند سمجھتے تھے۔

عزیز ملک ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک تھے اور حفیظ صاحب کے حاشیہ نشین۔ حفیظ صاحب کے اثرات ان میں بھی حلول کر گئے تھے۔ انھوں نے کسی افسر کی ڈانٹ ڈپٹ پر جواب الٹی سیدھی بات کہہ دی۔ غصے میں آ کر افسر نے ملٹری اکاؤنٹس جنرل سے شکایت کی اور کہا کہ اس دفتر میں اب یا میں رہوں گا یا عزیز ملک۔ چنانچہ عزیز ملک کا تبادلہ راولپنڈی سے کوئٹہ کر دیا گیا۔ عزیز ملک فریاد لے کر حفیظ صاحب کے دربار پہنچے۔ حفیظ صاحب نے ایم اے جی کو فون کیا اور کہا ”نقوی صاحب! مہربانی کر کے عزیز ملک کا تبادلہ منسوخ کر دیں۔ مجھے یہاں اس کی ضرورت ہے۔“

نقوی صاحب شعر و شاعری سے کوئی شغف نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انھیں حفیظ صاحب کی اہمیت کا کوئی شعور تھا۔ تنگ کر بولے ”تم کون ہوتے ہو مجھے اس طرح حکم دینے والے؟“

حفیظ صاحب نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا ”میں تمھارا باپ ہوتا ہوں۔“ اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ چند لمحے توقف کے بعد عزیز ملک سے کہا ”ممتاز حسن سے میری بات کراؤ۔“ ممتاز حسن ان دنوں سیکرٹری خزانہ تھے۔ ان کی مداخلت سے عزیز ملک کو راولپنڈی میں ہی کسی اور ذیلی دفتر میں لگا دیا گیا اور وہ کوئٹہ جانے سے بچ گئے۔

شعرو سخن کا ذوق رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ حفیظ کی مشہور نظم ”رقاصہ“ ایک والٹی ریاست کی فرمائش بلکہ حکم پر لکھی گئی۔ حفیظ صاحب ان دنوں اس ریاست کے درباری شاعر تھے۔ یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ والٹی ریاست نے حفیظ کو اپنی منظور نظر رقصہ کی شان میں نظم لکھنے کو کہا۔ حفیظ صاحب نے تعریف کرنے کے بجائے اس کی تضحیک کر دی۔ عین اس وقت جب وہ مجبور قفس تھی، حفیظ نے ترنم سے یہ اشعار سنائے۔

ہاں ناچتی جا ، گائے جا
نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا ، تڑپائے جا
او نیم عریاں نازیں!
تیرا تھرکنا خوب ہے
تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے؟
او دشمن دنیا و دیں!
تیری نظر چالاک ہے
تیری نظر بے باک ہے
شرم اور عزت والیاں
ہونی ہیں عفت والیاں
کسی قوم کی بیٹی ہے تو
تقدیر کی بیٹی ہے تو

جب وہ قفس تھم گیا اور محفل پر سکوت طاری ہو گیا، تو

نیولین کوتا جریوں اچھے نہیں لگتے تھے؟

بابونگری کاروباری بابو

کیا کاروباری بابو کا ہر قسم کی مکاری اور چال بازی پر غور ضروری ہے؟

سرکاری بابوؤں سے کبھی واقف ہیں آئیے..... اس بار آپ کو سرکاری کاروباری بابوؤں سے ملواتے ہیں

حسین احمد شیرازی



ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے گئے۔

ضیا! میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں

۱۹۸۰ء میں ایک صبح میں عزیز ملک سے

کنٹونمنٹ پبلک لائبریری، راولپنڈی پہنچا، جہاں

لائبریرین تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے پاس

صاحب بیٹھے ہیں۔ پتا چلا کہ وہ ۲۰ روپے سے راولپنڈی

ہی ہیں۔ انھیں جنرل ضیاء الحق نے باقاعدہ جہاز کا ٹکٹ

بھیج کر بلایا ہے تاکہ ان سے ملاقات کر سکیں۔ لیکن وہ

ایوان صدر کے دروازے سے استقبالیہ والوں نے انھیں

کہہ کر لوٹا دیا کہ ابھی صدر صاحب مصروف ہیں، پھر آئے

حفیظ صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ بولے ”اگر آج نہیں

ملتا تو میں واپس جاتا ہوں۔“ پھر مجھے کہنے لگے، اچھا

آپ آگئے۔ مجھے اپنی گاڑی پر ایوان صدر لے چلے

چنانچہ ہم تینوں تھوڑی دیر بعد ایوان صدر روانہ ہوئے

دروازے پر استقبالیہ پر ایک کرنل ڈیوٹی پر تھا۔ اس

کہا، ابھی تو ملنا بڑا مشکل ہے۔ کچھ ملکوں کے سفیر آ رہے

ہیں۔ شام کو پتا کیجیے۔

حفیظ صاحب نے کرنل سے کہا، مجھے مہمانوں

کتاب لا کر دو، میں اپنی حاضری تو لگاؤں۔ ایک

لے آیا۔ حفیظ صاحب نے اس میں لکھا:

”ضیاء.....! میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں

تمہارے گھر کے چکر لگاتا رہوں اور مجھے ہر بار دروازے

سے لوٹا دیا جائے۔ حفیظ“

یہ لکھ کر رجسٹر بند کیا اور ہمیں مخاطب کر کے کہنے

آپ لوگ مجھے ہوائی اڈے چھوڑ آئیں اور وہ لاہور

ہو گئے۔ بعد میں مجھے عزیز ملک نے بتایا، حفیظ صاحب

جونہی اپنے گھر ماڈل ٹاؤن پہنچے، لاہور کے کورکمانڈ

طرف سے ایک کار لینے آ گئی۔ پتا چلا کہ صدر صاحب

کر رہے ہیں۔ انھیں پھر بذریعہ جہاز راولپنڈی

گیا۔ اس مرتبہ اڈے پر ایوان صدر کی گاڑی موجود

انھیں سیدھا صدر صاحب کے پاس لے گئی۔

رقاصہ سر جھکائے نواب کے قدموں میں جا بیٹھی۔ نواب کو
حفیظ کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ حفیظ
کو جیل میں ڈال دیا جائے۔ یوں حفیظ صاحب محفل
رقص و سرود سے سیدھے جیل جا پہنچے۔ گویا رنڈی خانے
سے بندی خانے میں منتقل ہو گئے۔ تقریباً ایک مہینہ وہاں
قید رہے۔ پھر حکم ہوا کہ انھیں جیل سے نکال کر ریاست کی
حدود سے باہر پھینک دیا جائے۔ اس طرح حفیظ کی جان
بچی۔ اسی واقعہ کے باعث یہ نظم مشہور ہو گئی ورنہ یہ حفیظ کی
اچھی نظموں میں سے نہیں۔

محفل ناؤ نوش میں تازہ نظم

جن دنوں حفیظ صاحب صدرا یوب کی خواہش پر
شاہ نامہ لکھنے پر مامور تھے، افسران بالا کی ایک محفل ناؤ
نوش اور بزم رقص و سرود راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔
حفیظ صاحب کو اس تقریب میں بطور خاص مدعو کیا گیا تاکہ
جب محفل رنگ پر ہو تو ان سے ”ابھی تو میں جوان ہوں“
ان کے مخصوص دل آویز ترنم میں سنی جائے۔ حفیظ صاحب
سے جب نظم کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے کہا ”وہ نظم تو
مجھے یاد نہیں، آپ کو ایک تازہ نظم سناتا ہوں۔ وہ نظم یہ تھی۔

عورتیں ہیں، مرد ہیں، یارانہ جھانے میں ہے
اب تو ہر مستانی ہر مستانہ جھانے میں ہے
یہ ثقافت ہر کلب میں ہے شرافت کا مقام
ناچ گھر موجود ہے، مے خانہ جھانے میں ہے
ناچنے کی شرط یہ ہے مرد و زن دونوں ہوں غیر
بس وہی اپنا ہے جو بیگانہ جم خانے میں ہے
ناچنے میں مرد و زن پر حال طاری ہو اگر
ان کی خاطر خاص خلوت خانہ جھانے میں ہے
دین پر پھبتی، خدا پر طعن، ملت پر ہنسی
کیسی کیسی جرات رندانہ جھانے میں ہے
ناچتی گاتی ہوئی مٹ جانے والی قوم کا
ایک جیتا جاگتا افسانہ جھانے میں ہے
حفیظ صاحب تو یہ نظم سنا کر چل دیے اور شرکائے محفل

بابونگری

کا کاروباری بابوؤں سے بھی
گہرا تعلق ہے۔ یہ عجیب
ماجرا ہے کہ اس ملک میں
ضعیف بیمار لیکن صنعت کار

بہت صحت مند ہیں۔ دراصل اس توانائی اور صحت مندی کے پیچھے ٹیکس، بجلی، گیس کی چوری، حکومتی وسائل جیسے نجکاری اور سرکاری زمینوں کے فراڈ، بینکوں کے قرضوں کی ہیرا پھیری اور ناجائز منافع خوری جیسے عوامل شامل ہیں۔ طاقتور کاروباری بابواہم پوشوں پر اپنے منظور نظر دفتری بابوؤں کو تعینات کرواتے ہیں اور پھر طرفین خوب کھیل کھیلے ہیں۔ نیپولین نے کہا تھا کہ مجھے تاجر اچھے نہیں لگتے۔ تاجر ایک ایسا شخص ہے جو اپنے ملک کو ایک شلنگ کے عوض بیچ دے گا۔

ایک بڑے صنعت کار سے ہم نے خود سنا تھا کہ وزیراعظم کے لیے ہم جان بھی دے دیں گے کیونکہ وہ ہمارا بھائی ہے لیکن ٹیکس نہیں دے سکتے کیونکہ پیسہ ہمارا والد ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا ہے کہ کئی تجارتی بابو زیادہ برآمدات کا انعام نہیں لیتے کہ اس کے بعد اتنی بڑی رقم کے انکم ٹیکس کا حساب کون دے گا۔ ۱۹۷۳ء میں ہمیں ایک گروپ کے باباجی سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بتاتے تھے کہ انکم ٹیکس آفیسر کے دفتر میں جاتے ہوئے ہم پرانے کپڑے پہن کر جاتے ہیں، پھر قمیص کا ایک آدھ بٹن توڑ کر راستے میں سے مٹی اٹھا کر خود جوتوں پر ڈالتے ہیں اور کمرے میں جانے سے پہلے گھڑی باہر پکڑا جاتے ہیں تاکہ ٹیکس بابو سے یہ کہا جاسکے کہ جناب مجھ میں تو گھڑی خریدنے کی بھی استطاعت نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ پورا سچ یہ ہے کہ مختلف متعلقہ محکموں کی دھونس اور دھاندلی کے پیش نظر صرف اپنی بقاء کے لیے کاروباری بابو کا ہر قسم کی مخاری اور چال بازی پر عبور ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہاں ترقی وہی کرتے ہیں جو سفاکی کی حد تک اپنے مفاد کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں وفاقی بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے

مابوس کن قرار دینے والے بزنس لیڈر کے دفتر میں دن ٹیکس اہلکار پہنچ گئے چنانچہ ان کے اگلے بیان میں کے خیر مقدم کے ساتھ اس ضرورت پر زور دیا گیا کہ معاملات واضح نہیں ہیں، وہاں مذاکرات ہونے چاہئیں ماضی قریب میں پاکستان میں ارب پتیوں کی کھپ نمودار ہوئی ہے اور قیام پاکستان کے وقت کا رکی کھیل کے بیشتر بڑے مسلمان کھلاڑی یا تو میدان سے چکے ہیں یا کسی کو نے کھدرے میں پناہ گزین ہیں۔ ہی ایک پرانے کاروباری بابو سے ہم نے اس منظر نامے کی توجیہ پوچھی تو کہنے لگے ”شیرازی صاحب آج کل دھندے کے اصول بالکل بدل گئے ہیں۔ یہاں اس فلسفے پر عمل کیے بغیر بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی۔ سب کچھ لوٹ لو۔ جو راستے میں آئے پہلے پیار اور خوشامد سے رام کرو، مٹت سمجھت کر سفارش کراؤ، بولی لگاؤ ورنہ تمہیں نہیں نہیں کر دو۔ ہماری کے پیش نظر ہمارا ضمیر لوٹ مار کے لیے غارت گری تک جانے سے انکاری ہے۔“

کامیاب کاروباری بابو ہر وقت پیسہ کمانے کی باتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب اپنے ساتھی کو بتا رہے تھے کہ چینی کے ریٹ میں تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ یہ سنا کر وہ نے کتنا قرضہ لیا ہوا ہے؟

”۲۲ کروڑ“

”لیکن یہاں تو ۲۵ کروڑ لکھا ہے۔“

”باقی سود ہے۔“

۳۰ روپے سے اوپر نہیں جائے گا جبکہ میں نے ”کیا اگلے کام کرتے رہے ہو۔ اوکے۔ میں تمہارا روپے خرید کا سودا کیا ہوا ہے۔ پھر جو چنے پڑھنے کے نامزد فہرست سے نکال رہا ہوں، آئندہ خیال رکھنا۔“ سامنے رکھے تھے، انھوں نے نہ جانے کیا سوچے۔ بینکوں کے بقیہ بڑے قرض نادھندگان چند دن بعد ان کو کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ان کے رفرقار ہو گئے..... ویسے یہ بڑے بابو تھے بڑے دلیر۔ کئی چنوں کی کے ٹوچوٹی، شملہ پہاڑی بننے لگی تھی لیکن مال پہلے وہ کئی مرتبہ آدھی رات کے بعد اپسراؤں کے ریٹ ۳۰ سے اوپر نہیں جا رہا تھا۔ ہمارے بائیں اچھے ہمارے دوست کے مہمان خانے میں آتے تھے۔ بھی نرخی ہی کچھ اس طرح موضوع سخن تھے۔ ارے دوست نے اُن کے حساس عہدے کے پیش نظر الف ”دیکھو بھائی میں نے ۳۶ روپے سودا کیا نہیں احتیاط کا مشورہ دیا تو وہ بولے ”ارے بھئی جب میں ریٹ ۳۸ ہے لیکن میں کاروباری اصول کے دائرے میں ڈرتا تو تم کیوں فکر مند ہوتے ہو۔“

۲ میں دے رہا ہوں۔“
ب ”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہاں تو رینا مری ہے۔ ایک صاحب کو بریف کیس دے کر کسی کاروبار میں ترقی کے لیے نفسیات کا ماہر ہونا بہت

WWW.PAKSOCIETY.CO

طاقتور شخصیت کے پاس یہ کہہ کر بھجوا دیا گیا کہ اگر تو وہ لان میں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل رہے ہوں تو بریف کیس دے دیں اور اگر صوفے میں دھنس کر سگار پی رہے ہوں تو اپنا کام ضرور بتا دیں، پیسوں کا بہانہ کر دیں۔ (موقع واردات پر سگار پیا جا رہا تھا اس لیے پیسے بچ گئے) اسی طرح ایک حکومتی دفتر میں اپنا کام کرانے کا طریقہ یہ تھا کہ سرکاری قصبے کے ساتھ اپنا کوئی طبقی مسئلہ جوڑ کر افسر سے دم کرنے کی درخواست کی جاتی تھی، اور دم کرانے کے بعد مکمل افاقہ کے معجزہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ ایک اعلیٰ افسر کے بھائی ڈاکٹر تھے۔ مریض سے مرض کی علامات سننے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب پوچھتے کہ یہ تکلیف انھیں کب سے ہے تو وہ جواب دیتے کہ جب سے میرا یہ سرکاری کام پھنسا ہوا ہے۔ تفصیل سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب حل بتا دیتے کہ آپ کا علاج اتنے لاکھ میں ہو جائے گا۔

لیکن بعض اوقات یہ مار دھاڑ انسانی برداشت سے بڑھ بھی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے ایک جاننے والے کاروباری بابو کو بوسٹن ”ساگرہ مبارک“ کا فون کیا اور پوچھا کہ سناؤ ساگرہ کا دن کیسے گزر رہا ہے تو وہ بولے کہ ابھی بیٹے کو سکول چھوڑ کر آیا اور اب برتن دھو رہا ہوں لیکن پاکستان کی سردردی سے یہاں برتن دھونا بہتر ہے۔

منجی کاروباری بابوؤں کا تذکرہ سرکاری شعبے میں چلنے والے تجارتی اور صنعتی اداروں کے حالات بیان کیے بغیر ادھورا ہے۔ ہم ۱۹۹۲ء میں کلکٹر کسٹم کی نوکری چھوڑ کر اس طرح کی ایک کارپوریشن میں بطور ڈائریکٹر پہنچ گئے..... کیسے پہنچ گئے؟ وجوہات میں سرفہرست ہمارے چھوٹے بھائی قدوس کا اصرار تھا۔

قدوس ۴۲ سال قبل امریکا سے پاکستان منتقل ہونے کے بعد مناسب کاروبار کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہم نے اپنے خاندان کے لیے بہت محنت کر لی ہے اور اب ہم اس رعایت کے یقینی مستحق ہیں کہ بقیہ زندگی اپنی صوابدید پر آزادی سے پڑھنے لکھنے اور گھومنے پھرنے میں

ہم ”غیر ملکی سرمایہ کاری کو اس سے اور بھی بڑا دھچکا لگے گا کہ ایک ٹھیکیدار کو قانونی معاہدہ ہونے کے باوجود غنڈہ گردی کے ذریعے فیکٹری میں اپنا کام کرنے سے روکا جا رہا ہے۔“

لیڈر ”آپ کے پاس جب بھی آتے ہیں آپ اصول، اصول کی باتیں کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے صرف سرکاری دفاتر میں نوکری کی ہے، کسی کارپوریشن میں نہیں رہے۔“

اسی اثناء میں ہمارے ملحقہ کمرے سے اونچی آواز میں نازیبا گفتگو، فلک شکاف قہقہوں، لڑنے جھگڑنے، کرسیاں میز گرنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں..... استفسار پر معلوم ہوا کہ مقامی یونین کے عہدیدار ہلہ گتہ کر رہے ہیں۔ ان کا مکالمہ بھی سن لیں۔ ہم ”یہ کیا ہنگامہ ہے؟ دفتر میں ایسا طرز عمل انتہائی نامناسب ہے۔“

لیڈر ”جناب کوئی قتل تو نہیں کر دیا۔ مہمان آئے ہوئے تھے اور ہم ذرا دل پشوری کے لیے ایک دوسرے پر چائے گرا رہے تھے۔“

ہم ”دفتر بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے، آپ کو اجازت ہے کہ اپنے مہمانوں کو گھر لے جائیں۔“

لیڈر ”گھر نہیں لے جاسکتے۔“

ہم ”وجہ؟“

لیڈر ”گھرا ئیر کنڈیشن نہیں ہے۔“

اس کارپوریشن میں ہم نے مفت تعلیم بالغاں کا سکول بھی کھولا جس میں صرف ایک ڈرائیور نے داخلہ لیا۔ ہم یونین کے صدر کو شاگرد ڈھونڈ کر لانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ جب ہمارا اصرار حد سے بڑھ گیا تو ایک دن تحفے کا اعلان کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ کی فرمائش سن سن کر میرے تو کان پک گئے ہیں..... بس ایک مرتبہ ہی جواب سن لیں..... اگر یہ..... (نازیبا القاب) پڑھ گئے تو میری یونین کیسے چلے گی؟

تھمرا پش رو پولیس کا حاضر سروس ڈی آئی جی تھا، جس کے ساتھ بدتمیزی کرنے کے بعد اسے دفتر میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اس کی درج کرائی گئی ایف آئی آر پر ایک سال سے تو کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

انہی دنوں ہمارے وفاقی سیکرٹری کسی تحقیقات کے لیے لاہور آئے لیکن اسی طرح کی نعرے بازی سے ڈر کر ہوش سے ہی واپس اسلام آباد چلے گئے۔

انتظامیہ اور یونین کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو آپ بہروں کا مکالمہ بھی کہہ سکتے ہیں مثلاً:

یونین لیڈر ”ہمیں ۴ ماہ کا عید ایڈوانس چاہیے۔“

ہم ”فنڈز نہیں ہیں۔ کارپوریشن کو پچھلے سال ۶۶ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے۔“

لیڈر ”فنڈز مہیا کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔“

ہم ”تنخواہیں بھی قرضہ لے کر ادا کی جا رہی ہیں۔“

لیڈر ”کارکنوں کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

ہمارے پیش رو ٹھوکر مار کر افسروں کا دروازہ کھولتے تھے،

گالیاں دیتے تھے، ان کا کام ہو جاتا تھا، ہمارا خیال ہے کہ ہمیں بھی اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔“

ہم ”اگر ٹھوکر مارنے یا بدزبانی کرنے سے فنڈز مہیا ہوتے ہیں تو ہم بھی اس نیک کام میں آپ کے شریک کار ہونا چاہتے ہیں۔“

لیڈر ”اچھا اسے چھوڑیں، فلاں فیکٹری میں ڈبے بنانے کا ٹھیکہ ہمارے بندے کو نہیں دیا گیا۔“

ہم ”ٹھیکہ کارپوریشن کی طے کردہ پالیسی کے مطابق میرٹ پر دیا گیا ہے۔“

لیڈر ”آپ کے ٹھیکیدار کو ہم نے بھگا دیا ہے۔“

سیکڑوں مزدور احتجاج کر رہے ہیں۔ آپ کو کیوں سمجھ نہیں آ رہی کہ جی ٹی روڈ بند ہو جائے گی۔ امن وامان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا اور بیرونی سرمایہ کاری کو شدید دھچکا لگے گا۔“

اُس سال ہماری کارپوریشن نے ۶۶ کروڑ روپے کا نقصان کیا تھا لیکن اس کے باوجود ۵ کروڑ روپے کا بونس اور بہت سی خصوصی اضافی مالی ترقیاں بھی عطا کی گئیں۔ جس ڈرائیور کے ساتھ گاڑی نہیں تھی وہ بھی ۱۲ لکھنے اور ٹائم لیتا تھا اور اس طرح وہ روزانہ ۲۰ لکھنے ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔

لگتا تھا جیسے یہ کارپوریشن یا تو کسی وبائی امراض کی آئے ہوئے علاقہ میں کام کر رہی ہے یا آنے والے سالوں کے لیے ادویات خرید لی گئی ہیں لیکن جہاں کے حکم پر کارپوریشن کے کھاتے سے، اداکاراؤں کو زدگان کی امداد کے نام پر ہونے والے شو کے لیے عام لاکھوں روپے دیے جاتے ہوں، وہاں ان ضابطیوں پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔

ہوں جو دو چار شرابی تو وہ توبہ کر لیں شہر کا شہر ہے ڈوبا ہوا میخانے میں

اس کارپوریشن میں ہمارا مزدور بابوؤں سے بڑا..... جو عمومی طور پر معاشرے کا مظلوم طبقہ ہیں آپ ان کے ہتھے چڑھ جائیں تو ان جیسا ظالم نہیں۔ ہمیں نئے دفتر میں آئے ہوئے ابھی چند گزرے تھے کہ ایک دوپہر نہ صرف ہمارا دفتر علاقہ، فلک شکاف نعروں سے گونجنے لگا جن میں محترم وزیر سمیت بیشتر اعلیٰ عہدیداران کے نام کر واہیات شاعری یا تنگ بندی کی گئی تھی۔ ایک کرنے والے محکمہ کے عادی شخص کے لیے یہ ایک بلائے ناگہانی سے کم نہ تھا۔

کارپوریشن میں اپنے ریلوے کے بیچ صاحب سے پوچھا تو انھوں نے اس دن کا اخبار آگے کرتے ہوئے بتایا کہ کل ہماری ریلوے لیڈر نے ریلوے کے بہت بڑے افسر کو مچا مار کر ۲۲ دانت توڑ دیے ہیں۔ تم صرف نعرہ زنی پر گھبرا

گزاریں۔ لیکن وائے قسمت۔ ڈیڑھ سال بعد قدوس فوت ہو گیا۔ پھر مزید ۱۲ سال بعد ہم نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ پچھلے سال ہائیکورٹ کے ایک مقدمے کی بحث کی تیاری کے سلسلے میں ہم کراچی کے ہوٹل میں رات ۴ بجے تک کاغذات کی چھان پھٹک کرتے رہے۔ نیند کافی دیر تک آنکھوں کے در کھٹکھٹانے میں ناکام ہو کر کسی ناراض بچے کی طرح بہت دور جا چکی تھی اور گردن کے سر کا بوجھ مزید نہ اٹھانے کے پیغام کے بعد، بے چارہ سرکسی کی پشت پر گرا پڑا تھا کہ ہمیں محسوس ہوا کہ کسی نے ہمارا کندھا تھپتھا کر دھکی لے لے میں کہا ”افسوس بھائی جان..... آپ کو زندگی کے سفر کے لیے صرف صحرا ہی ملے.....“

معاف کیجیے یہ ایک اچھے میں دوسری ٹریجڈی کہاں سے آگئی۔ بہر کیف ان سرکاری کارپوریشنوں کی مناسب مثال اس مغویہ جیسی ہے جس کا اغوا کنندہ اپنے ظلم اور زیادتیوں کے ساتھ ساتھ اس کے لواحقین سے اس کے طعام و قیام اور دیگر مصارف کے بل بھی وصول کرتا ہے۔ اس ایک فقرے میں ان اداروں کے قومیاے جانے، ان کے چلانے اور دوبارہ نجکاری کے سارے عمل کی مکمل تصویر ہے۔ قومیاے کی پالیسی کی پہلی قسط میں صوبہ سرحد میں نوشہرہ کی ایک ایسی فیکٹری کو قومیاے کیا گیا تھا جو صرف ایک شیڈ (Shed) پر مشتمل تھی۔ ہم نے ایک متعلقہ صاحب سے وجہ پوچھی تو بولے کہ ملک کے اس حصے میں قومیاے کے لیے کوئی دوسرا یونٹ اس وقت نظر نہیں آیا تو اس پالیسی میں صوبہ سرحد کا حصہ ڈالنے کے لیے یہ کام کیا گیا۔ میڈیکل بل اور دوائیوں کی مقدار کے پیش نظر ایسا

قائد کی یاد کا نیا حوالہ

۳ سوال ۲۴ جواب

کل یہی جواب تاریخ کہلائیں گے

قائد اعظم کی کون سی خوبی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے

ملک کے معروف اخبارات کے ایڈیٹروں کی بانی پاکستان کے حوالے سے حجت بھری باتیں

اظہار بن مظہر





شخص نہیں ہے نہ ہی زندوں میں یا جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو رول ماڈل کہلا سکے۔ ان کی بہن فاطمہ جناح خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں کیونکہ خواتین کی تعداد بھی نصف یا نصف سے زیادہ ہے۔

۲۔ قائد اعظم ایک سچے انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سچ بولا اور کبھی سچ سے انحراف نہیں کیا۔ ان کی بہترین جو خوبی تھی وہ ان کا سچ بولنا تھا اسی لیے شروع شروع میں جب وہ اردو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں اور لوگ ان کی تقریر اس طرح آرام سے سنتے جیسے وہ لفظ بہ لفظ سمجھ رہے ہوں۔ وہ جو بولتے تھے وہ سچ بولتے تھے اور ہر کوئی اس کو سچ سمجھتا تھا اور وہ سچ کہتے تھے اور وہ سچ نکلتا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر حضرت قائد اعظم نہ ہوتے تو پاکستان کبھی بھی معرض وجود میں نہیں آ سکتا تھا کیونکہ ہمارے مخالفین جو ہیں وہ بہت زیادہ تعداد میں تھے اور بہت زیادہ شاطر اور چالاک تھے۔ ان کا جواب صرف اور صرف قائد اعظم ہی دے سکتے تھے۔

مجیب الرحمن شامی (مدیر اعلیٰ پاکستان)

۱۔ قائد کے حوالے سے پہلا تاثر احساسِ تشکر کا دماغ میں ابھرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ان کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

۲۔ آج ہم اپنے وطن میں آزادی سے رہ رہے ہیں تو یہ قائد اعظم محمد علی جناح کی جدوجہد اور ہمت و استحکام کی ہی وجہ سے ہے۔ آزادی سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں۔ دل تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے۔

۳۔ قائد اعظم جیسا لیڈر ان کے بعد کوئی اور نہیں آیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ صرف

و قائد اعظم کی یاد کے لیے اس ماہ ہم نے تاریخ کی کسی کتاب سے مدد لینے کے بجائے آج کے نسیاں اخبارات کے مدیروں سے ملاقات کا اہتمام کیا اور ان سے ۳ سوال پوچھے یہ رہے ان کے جوابات۔ کل یہی جواب تاریخ کہلائیں گے

سے بھی خاص تعلق ہے۔ نظامی صاحب ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ پہلا دنیا کا ملک تھا جس کے ۲۲ حصوں میں ایک ہزار سے زیادہ میل کا فاصلہ تھا۔ ایک ایسٹ پاکستان بنا اور دوسرا ویسٹ پاکستان بنا۔ پھر اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اکٹھے رہنا تو یہ دو پاکستان بن گئے۔ وہ نام بے شک بنگلہ دیش ہے مگر وہ پاکستان ہی ہے کیونکہ جس طرح ہم نے ہندوؤں کی بالادستی کو قبول نہیں کیا اس طرح بنگلہ دیش نے بھی قبول نہیں کیا۔ اب حضرت قائد اعظم کی طرف آتے ہیں۔ قائد نے پاکستان کو اسلامی، جمہوری، فلاحی مملکت قرار دیا تھا۔ ان کا یہ فرمانا تھا۔ کسی نے پوچھا ان سے کہ آپ کا مسلک کیا ہوگا یعنی پاکستان کا۔ جس طرح یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کو حضرت قائد اعظم ایک سیکولر اور ماڈرن ریاست بنانا چاہتے تھے تو اسلامی، جمہوری اور فلاحی میں بھی آجاتا ہے لیکن جہاں تک تعلق ہے سیکولر ہونے کا اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ حضرت قائد اعظم پر ایک تہمت ہے۔ قائد نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ میرا مسلک وہی ہے جو میرے حضور پاک کا تھا اور میں پاکستان کو اسی کا پاکستان دیکھنا چاہتا ہوں وہ حضور پاک کی غلامی کے قائل تھے اور ایک سے زائد بار انھوں نے پاکستان کو (پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں بھی) ایک اسلامی جمہوری مملکت قرار دیا تھا۔

۲۔ قائد اعظم کو رول ماڈل بنانے کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سوائے قائد کے کوئی بھی ایسا

محمد

علی جناح ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس کی شخصیت کا محرک ۶۴ سال کے بعد بھی قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ لوگ مخلوق خدا کی فلاح و ترقی کے لیے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں اور اپنے کام کی تکمیل کے بعد واپس بلا لیے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام تھے۔ انھوں نے پر امن جدوجہد سے وہ کر دکھایا جس کی انگریز اور ہندو توقع نہیں کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہی آزادی انھیں دلائی بلکہ انھیں ایک محفوظ اور کامیاب زندگی کے لیے ایک منفرد ملک کا تحفہ دیا۔ وہ جسمانی طور پر انتہائی کمزور اور نحیف تھے مگر اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح مضبوط اور ثابت قدم تھے۔

مجید نظامی (مدیر اعلیٰ نوائے وقت)

۱۔ حضرت قائد اعظم اور نوائے وقت کا ایک خاص تعلق ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان کے دن نوائے وقت بطور ۱۵ روزہ منصفہ شہر پر آیا۔ اس کے مدیر مجید نظامی صاحب طالب علم تھے اور ایم ایس ایف پنجاب کے بانی صدر بھی تھے۔ ۱۹۴۳ء میں قائد کے حکم پر نوائے وقت کو ”روزنامہ“ بنا دیا گیا۔ اس لحاظ سے نوائے وقت اور حضرت قائد اعظم کا ایک خاص تعلق ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ

ان کی ذات کا یہی ایک پہلو اس بات کے لیے کافی ہے کہ نوجوان رہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھیں اور ان کو اپنا رول ماڈل بنا کر ہی زندگی کو کامیاب و کامران کر سکتے ہیں اور ملکی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔

قائد اعظم کی دیانت اور صداقت مجھے زیادہ عزیز اور پسند ہے کیونکہ ایک مسلمان میں ان ۲ خوبیوں کا ہونا انتہائی اہم اور ضروری ہے اس کے بغیر مسلمان کی زندگی نامکمل ہوتی ہے۔ قائد اعظم کی ان خوبیوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان بڑے لیڈر ہیں جب تک یہ ۲ بڑی خوبیاں نہیں ہوں گی وہ قائد کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا ہے۔

سہیل وڑائچ (ایڈیٹر ایڈیٹر جگ)

۱۔ قائد اعظم کا نام سنتے ہی ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جس نے دنیا میں وہ معجزہ کر دکھایا جو دنیا کے بہت

اگر قائد اعظم نہ ہوتے تو پاکستان

کبھی معرض وجود میں نہ آتا



مجیب الرحمن شامی



مجید نظامی

قائد اعظم جیسا لیڈر پاکستان کو

دوبارہ نصیب نہیں ہو سکا



سید ذراغ

خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال جیسے لوگ موجود تھے۔ ان کے اندر Standout کرنا اور لیڈر شپ کا رول لینا بہت کمال کی بات تھی اور اُن کے اس رول کو مسلمانوں نے دل و جان سے قبول بھی کیا۔ عوام نے قائد کو مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں قبول کیا اور عوام نے آپ کو قائد اعظم مانا۔ یہ سب قائد نے جدوجہد سے حاصل کیا وہ بھی جدوجہد سے گھبرائے نہیں۔ اس جدوجہد کی بدولت قائد کامیابی پر کامیابی پاتے گئے اور آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان انگریز کی مدد سے بنا اور اگر یہ مان لیا جائے اس جھوٹی کہانی میں اگر کچھ سچ بھی ہو پھر بھی قائد اعظم نے ہی یہ پاکستان بنوایا ہے۔ وگرنہ پاکستان کونہ تو انگریز بنا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اور بنا سکتا تھا۔ یہ مسلسل جمہوری جدوجہد سے پُر امن طریقہ سے بنایا گیا ہے۔

سرفراز سید (جوائنٹ ایڈیٹر اوصاف)

۱۔ قائد اعظم اس دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ وہ اپنے مقصد میں سخت اور بے باک تھے۔ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ قائد کا ذکر آتے ہی خیال آتا ہے کہ وہ نفیس اور کھرے انسان تھے۔ وہ نفیس اور عمدہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ نفاست اُن کی ایک بڑی خوبی تھی۔ اپنے ہدف کو پانے کے لیے انھوں نے پوری جدوجہد کی۔ اُن میں نہ لالچ تھی نہ کرپشن۔ اُن کے سخت موقف اور کھرے پن ہی کی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد اور رشتہ داروں کو کوئی عہدہ یا مراعات نہیں دیں۔ پاکستان نہیں آنے دیا۔

۲۔ نوجوان نسل کے لیے قائد اعظم بالکل درست رول ماڈل ہیں۔ قائد ایک سچے انسان تھے۔ وہ ایک مخلص اور دیانت دار آدمی تھے جو رول ماڈل ہونے کے لیے

ہی کم لوگوں کو کر دکھانے کا موقع ملا۔ یہ مقام دنیا کے کم ہی لیڈروں کو نصیب ہوا ہے۔ انھوں نے ایک نیشن سٹیٹ بنائی۔ انھوں نے وہ کام کر دکھایا جس کو ۱۰ سال پہلے تک ناممکن سمجھا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے حوصلہ اور ہمت سے وہ کر دکھایا اس کو ہی معجزہ کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک صاف ستھری زندگی گزاری جس میں کوئی داغ نہیں، بہت افسوس کہ اُن کے طرز زندگی اور عمل کو فالو نہیں کیا گیا۔

۲۔ سینیٹے والپرٹ نوجوان نسل کے رول ماڈل کے حوالے سے میری نظر میں اگر پاکستانی قوم کا کوئی رول ماڈل ہے تو وہ صرف اور صرف قائد اعظم ہے۔ نئی نسل کو قائد اعظم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں قائد کے بارے میں سینیٹے والپرٹ کی کتاب ”Jinnah of Pakistan“ کو پڑھ کر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ میں نوجوان نسل کو بھی یہ تجویز دیتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نوجوانوں کو قائد کے بارے میں جاننے کا بہت موقع ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہر نوجوان اس کتاب کو ضرور پڑھے۔

۳۔ قائد اعظم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ انصاف اور قانون کے دائرے میں رہے اور اس دائرے میں رہ کر انھوں نے جمہوری جدوجہد کی۔ قائد نے شائستگی کو کبھی نہیں چھوڑا اور اپنے ذرائع روزگار کے بارے میں بہت محتاط رہے ہیں کہ اُن میں کوئی آلائش نہ آئے۔ یہ ہیں وہ نمایاں چیزیں جن کو اپنے سامنے رکھ کر ہم قائد کو اپنا رول ماڈل سمجھتے ہیں۔

قائد اعظم کے زمانہ میں لیڈر شپ اتنی زیادہ تھی، مسلمانوں کے اتنے اتنے بڑے رہنما یعنی محمد علی جوہر، ظفر علی



ضیا شاہد (مدیر اعلیٰ خبریں)

۱۔ قائد اعظم کا نام لیتے ہی پہلا تاثر جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو اصول و نظریات کے اعتبار سے ایک انتہائی مستحکم اور انتہائی بااعتماد حیثیت کی حامل تھی۔ قائد کی اصول پرستی اور اُن کا اپنے اصولوں پر اعتماد، یقین اور ایمان اس حد تک کہ وہ ہمیں گوشت پوست کا انسان نظر نہیں آتے۔ قدرت ایسے ہی کسی شخص کو ایسی عظیم حیثیت نہیں دیتی۔ اُس میں کچھ نہ کچھ خداداد خوبیاں ہوتی ہیں۔ جیسے قائد اعظم کی زندگی کا کوئی سا واقعہ لے لیں میں نے تو اُن کی زندگی پر ایک کتاب مرتب کی ہے ”قائد اعظم زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات“ اُس کا عنوان ہے۔ میں نے اُن کی روزمرہ زندگی سے چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کیے ہیں۔ میں پی ٹی وی پر روزانہ ۵ منٹ دورانیہ کے پروگرام میں قائد کی زندگی کا ایک واقعہ سناتا رہا اور جب ایک سال میں ۳۶۵ واقعات جمع ہو گئے تو اُن کو ایڈٹ کر کے میں نے وہ کتاب مرتب کی۔

قائد اعظم کے ایک ملازم اچھا سا سرٹیفکٹ بنوانے آئے تاکہ جس کو دکھا کر ملازمت حاصل کر سکیں۔ قائد نے اُس کو ایک سرٹیفکٹ ٹائپ کرا کر دستخط کر کے دیا جس میں لکھا تھا یہ شخص میرے پاس رہا ہے۔ بڑا محنتی آدمی ہے لیکن جھگڑالو بہت ہے اور اپنی جھگڑالو طبیعت کی وجہ سے

بنیادی خوبی ہے۔ قائد میں منافقت نہیں تھی۔ سیاسی طور پر وہ ایک بہترین رول ماڈل ہیں۔ اگرچہ سیاسی حوالے سے حضور اکرمؐ، صحابہ کرامؓ ہمارے رول ماڈل ہیں لیکن عہد جدید میں جو قوتیں ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہیں قائد اعظم ان کے حوالے سے ایک بہتر سیاسی رول ماڈل ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ نئی نسل کو قائد اعظم کے بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سیاستدانوں نے کوشش کر کے قائد کا امیج کم کیا۔ اُن کے خلاف لوگوں کو ابھارا گیا۔ غلط قسم کی باتیں اچھالیں۔ حالانکہ اُن کے ساتھ بہت زیادتیوں کی گئیں۔ قائد نے سٹیٹ بینک کا افتتاح کیا تو اُن کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ قائد اعظم آخری وقت جب سڑک کے کنارے ۲ گھنٹے بے بسی کی حالت میں ایسبونیٹس میں پڑے رہے۔ ہر طرف کھیاں تھیں۔ سخت گرمی کا عالم تھا۔ فاطمہ جناح اور سسر اُن کو دوپٹے اور گتے سے ہوا دیتی رہی تھیں حقیقت یہ ہے کہ قائد سے وفا نہیں کی گئی۔

۳۔ قائد اعظم جھکتے نہیں تھے۔ جھکنا اُن کو پسند نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جسے کوئی لالچ، دولت، پیشکش جھکا نہ سکی۔ یہ صفت میں نے کسی اور سیاستدان میں نہیں دیکھی۔ ایک واقعہ ہے کہ وہ باغ میں گئے۔ سب لوگوں نے پھول توڑے مگر قائد نے پھول نہیں توڑا اور کہا کہ میں پھول نہیں توڑوں گا کیونکہ اس کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔



ضیا شاہد

۵۵ قائد اعظم کی سچائی مجھے

سب سے زیادہ عزیز ہے

قائد کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان کا تصور تک نہ تھا ہماری حالت بمثل کے ہوئے مسافر جیسی کیوں ہے؟

جس قوم کا رہنما اتنا عظیم ہو وہ پھر بھی بام عروج پر نہ پہنچے،
کیا بد نصیبی کی بات نہیں ہے؟

کاشف بہزاد

مرتبہ قائد نے تصویر بنوائی۔ یہ آدھی تصویر تھی۔ قائد نے کہا کہ یہ تصویر دوبارہ بنوائیں یہ ٹھیک نہیں بنی۔ کیونکہ میں نے ایک بوٹ کے تسمے نہیں باندھے ہوئے۔ فوٹو گرافر نے کہا سر! بوٹ کے تسمے کھلے ہوں یا بندھے ہوئے تصویر پر اس کا فرق نہیں پڑے گا کیونکہ یہ آدھی تصویر ہے۔ اس پر قائد نے فرمایا کہ تسمے نہ باندھنے کی وجہ سے میرے چہرے کے تاثرات ٹھیک نہیں آئے اس لیے دوبارہ تصویر بنائیں۔ اس واقعہ سے اُن کی شخصیت میں موجود (Perfection) کھل کر سامنے آتا ہے۔ آج کل کے لوگ ہر چیز کو اتنی باریکی اور سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

۲۔ نوجوانوں کے لیے قائد بطور رول ماڈل بہترین ہیں۔ مستقل مزاجی اور محنت جیسی خوبیوں سے نوجوان مستقبل کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ قائد نے بطور وکیل اپنا کیریئر شروع کیا اور مشکل ترین حالات کا بڑی ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کیا اور ایک کامیاب وکیل اور رہنما بن گئے۔ نوجوان نسل کو قائد کو کیریئر کے حوالے سے اپنا رول ماڈل بنانا چاہیے۔ قائد کی طرح اپنا عزم اور ارادہ بلند رکھیں۔ کامیابی یقینی ہے۔ قائد کی زندگی سے سبق ملتا ہے کہ کامیابی کا آغاز ناکامی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامی کے خوف سے سفارش، رشوت اور شارٹ کٹ کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔

۳۔ قائد کی تمام خوبیوں میں اُن کا سچا اور کھرا پن اہم ترین خوبی ہے۔ یہ پسندیدہ ہے۔ ہمارے ہاں سچ اور ایمانداری کا حلف اٹھانے کے باوجود سب لوگ جھوٹ اور مکرو فریب کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لیے ہم ناکام ہیں۔ اللہ کی مدد ہونے کے باوجود ہم ذلیل اور رسوا ہیں۔ جبکہ مغربی دنیا اس کے برعکس ہے اور کامیاب ہے۔

گزار سکتا ہے۔ وہ نہ تو جھکنے نہ ہی بکنے والے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ جانتے تھے کہ عوام کو ساتھ لے کر کیسے آگے بڑھنا ہے۔ نوجوانوں کے لیے تو قائد کی زندگی سے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی، کامیابی ہے انھوں نے جو کچھ زندگی میں چاہا وہ حاصل کر لیا۔ وہ بھی کسی کام میں ناکام نہیں ہوئے۔

۳۔ قائد اعظم میں منافقت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی اور اُن کی یہ خوبی مجھے سب سے زیادہ عزیز اور پسند ہے۔ وہ بالکل Straight forward یعنی بے باک قسم کے بندے تھے۔ جو سوچتے تھے وہی کہتے تھے اور وہی کرتے بھی تھے۔ اُن کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ ہم (May be) ”شاید“ کے لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قائد کی زندگی میں یہ لفظ نہیں تھا۔ اُن کی بات میں Clarity ہوتی تھی۔ اگر مگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ دو ٹوک بات کرتے تھے۔ وہ انسان کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ اپنے روزمرہ معمولات میں اسلام کی پریکٹس کرتے تھے۔ وہ عملی مسلمان تھے۔ دکھاوے کے نہیں تھے۔ مولوی حضرات کے بہت سے کام خلاف اسلام ہوتے ہیں مگر وہ اسلام، اسلام کا شور بہت کرتے ہیں۔ قائد حقوق العباد کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہم میں بد قسمتی سے دکھاوے کا اسلام ہے۔

بلال غوری (جوائنٹ ایڈیٹر انصاف)

۱۔ قائد اعظم کا نام سنتے ہی میرے سامنے ایسی شخصیت آتی ہے جو بطور وکیل، مدبر اور قائد ایک کامیاب اور کامران آدمی تھے۔ وہ ایک جاذب نظر شخصیت تھے۔ اس خصوصیت سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں۔ ایک



بلال غوری

قائد اعظم نے پاکستان بنا کر

ایک دیوار کھڑی کر دی ہے

عالم کی طویل سیاسی تاریخ میں پاکستان کے وجود میں آنے کے حوالے سے بالخصوص ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء اس لیے

ہمیشہ خاص اہمیت اور حیثیت کا حامل رہے گا کہ اس روز براعظم ایشیا میں آزادی اظہار، آئین و قانون کی بالادستی کی پاسداری اور جمہوریت پر یقین محکم اور عوام کے جمہوری حقوق کی بہر طور سر بلندی کی علمبردار ایک بے مثال عظیم کامیاب اور انتہائی باکمال شخصیت محمد علی جناح صفحہ ہستی پر نمودار ہوئی تھی، جس نے برطانوی سامراج سے آزادی اور ہندوستان کی تقسیم کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا اس نے برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کو اتحاد و یکجہتی کی زبانی کلامی تلقین ہی نہیں کی بلکہ انہیں ذات پات، اونچ نیچ اور علاقائی و لسانی تعصبات اور مسلک اور عقائد کے اختلافات و تفرقات سے نکال کر حقیقت میں ایک متحد مسلمان قوم میں ڈھال دیا جس کا نصب العین حصول آزادی اور حصول پاکستان ٹھہرا۔ ہزار ہا مشکلات، برصغیر کی ہندو اکثریت اور انگریزوں کی سازشوں سے ہراساں ہوئے بغیر قائد اعظم نے اپنے یقین محکم اور عمل پیہم کے بل پر بے مثال کامیابی سے مسلمانوں کے اتحاد کو یقینی بنایا اور عمومی اعتبار سے مختصر ترین مدت کی جدوجہد کو عظیم المثال کامیابی سے ہمکنار کر کے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ آزاد وطن حاصل کر کے دکھا دیا جو پاکستان کی شکل میں دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی مسلمان مملکت کہلانے اور تسلیم کیے جانے کا حق دار قرار پایا۔

مسلمانان برصغیر نے قائد اعظم کی رہنمائی میں یہ مملکت عظیم تو حاصل کر لی، لیکن افسوس صد افسوس قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم کی صحت اس قابل نہ رہی کہ وہ تادیر اس قوم کی بھرپور عملی رہنمائی کر سکتے۔

☆☆

ایک فطین (Genious) اور غیر معمولی انسان، اُن کو ”جناح آف پاکستان“ کے مصنف شیلے والپورٹ نے

جو خراج تحسین (tribute) پیش کیا ہے وہ اتنا جامع حقیقی ہے کہ اُس سے بہتر الفاظ میں قائد کی شخصیت عظمت بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے:

”اگر ہم صرف زمانہ جدید کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں تو ہمیں ایسے اولوالعزم انسانوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جن کے عظیم الشان کارناموں سے اقوام عالم کی کہانی روشن و مزین ہے تاہم ایسے انسانوں کے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہوں نے واقعات عالم کا موڑ دیا۔ پھر ایسی ہستیاں تو بہت تھوڑی ہیں جنہوں نے اپنے عزم بالجزم سے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اگر ایک قدم بڑھا کر ایسے افراد کی جستجو کریں جنہوں نے



مضبوط قوت ارادی اور اٹل فیصلہ کے بل پر ایک قوم پر پاکستان کے تحفظ میں ہے۔ مسلم ہو یا غیر مسلم اُس ریاست قائم کر کے دنیا سے اپنی قیادت کا لوہا منوا لیا۔ قائد اعظم نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی ہمیں ایک اور صرف ایک نام ملتا ہے۔ یہ اعزاز صرف پاکستان قائد اعظم کے حصہ میں آیا جنہوں نے بیک وقت یہ تینوں کارنامے انجام دے کر تاریخ میں منفرد و یکتا مقام حاصل کیا۔“

جس قوم کا رہنما اتنا عظیم انسان ہو اور وہ قوم عروج پر نہ پہنچے تو یہ اُس قوم کی بد نصیبی ہی کہلائے گی۔

☆☆

آزادی کے بعد ہم نے نہ صرف اپنے قائد بتائے ہوئے سنہری اصولوں کو فراموش کر دیا بلکہ اُن

ہوئے اصولوں کو تختہ مشق بنانے سے بھی گریز کیا۔ اُن کے فرمودات کی من مانی شرح کرنی شروع کر دی اور تشریح بھی ایسی کا حاصل صرف پاکستان کی بنیادوں کو برباد کرنا ہے۔ ہم یہاں مختصراً قائد کے فرمودات کی روشنی میں عملی صورت حال کا ایک جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ

تحریک پاکستان میں جس جذبہ حریت کو اس سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی وہ دو قومی نظریہ تھا، جس میں اس بات کا واضح اعلان تھا کہ بننے والی مملکت کی بنیاد کلمہ طیبہ پر رکھی جائے گی جو اس کے بنیوں کی زندگی کا دستور اور ترقی کا منشور ہوگا۔

دو قومی نظریہ، جس کو نظریہ پاکستان بھی کہا جاتا ہے پاکستان کی بنیاد ہے۔ اگر قوم نظریہ پاکستان سے مخلص ہو تو یہ وطن عزیز کے تحفظ اور خوشحالی کی ضمانت ثابت ہوگی۔ اگر ہم نظریہ پاکستان کو حرز جاں بنالیں تو ملک کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی ترقی قابل فخر روایات کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنی قوم کے بچوں، بوڑھوں، انہوں اور خواتین میں یہ شعور بیدار کرنا ہوگا کہ ہماری بقا مضبوط قوت ارادی اور اٹل فیصلہ کے بل پر ایک قوم پر پاکستان کے تحفظ میں ہے۔ مسلم ہو یا غیر مسلم اُس ریاست قائم کر کے دنیا سے اپنی قیادت کا لوہا منوا لیا۔ قائد اعظم نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی ہمیں ایک اور صرف ایک نام ملتا ہے۔ یہ اعزاز صرف پاکستان قائد اعظم کے حصہ میں آیا جنہوں نے بیک وقت یہ تینوں کارنامے انجام دے کر تاریخ میں منفرد و یکتا مقام حاصل کیا۔“

قائد اعظم نے ۱۱ اگست کی تقریر میں یہ واضح کر دیا

جونا دان دوست یہ دلیل دے کر اہل وطن کو گمراہ کرتے ہیں ذرا کبھی کسی ہندو سے بھی کہہ کر دیکھیں کہ پاکستان بننے کے بعد تم ہندو نہیں رہے اُس کا جواب ان کی طبیعت صاف کر دے گا

کہ ہندوستان کی تقسیم ہو جانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہاں برصغیر میں ۲ بڑی قابل ذکر قومیں آباد ہیں۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں علیحدہ علیحدہ قومیں وجود میں آ جائیں گی۔ بھارت میں بھارتی قوم اور پاکستان میں پاکستانی قوم۔

پاکستانی قوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اس ملک کے باشندے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان مسلمان نہیں رہا اور ہندو ہندو نہیں رہا۔ جونا دان دوست یہ دلیل دے کر اہل وطن کو گمراہ کرتے ہیں ذرا کبھی کسی ہندو سے بھی کہہ کر دیکھیں کہ پاکستان بننے کے بعد تم ہندو نہیں رہے۔ اُس کا جواب ان کی طبیعت صاف کر دے گا۔

اسلام ہمارا دین ہے

قیام پاکستان کے ساتھ ہی ایک طبقہ کی جانب سے نظام حکومت اور مستقبل کے آئینی خاکے کے حوالے سے

آج اس تقریر کو بنیاد بنا کر پاکستان کی بنیادوں پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ قائد اعظم نے تقریر میں واضح کیا کہ اب پاکستان وجود میں آ گیا ہے۔ اگر کوئی ہندو ہے تو وہ پرانی باتیں بھول کر ایک نئے دور کا آغاز کرے جس کے مطابق وہ ایک اسلامی مملکت کا باشندہ ہے جہاں بطور ایک غیر مسلم اُس کے باقاعدہ حقوق مقرر ہیں۔ اُس کے جان و مال کا مکمل تحفظ اسلامی سلطنت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ایک پاکستانی مسلمان کے اوپر بھی ذمہ داریاں عائد ہو رہی ہیں وہ غلامی کے دور سے نکل کر اسلامی مملکت کا شہری بن رہا ہے۔ اُس کو اپنے ہر قول و فعل سے قبل یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میں ایک اسلامی مملکت کا مسلمان شہری ہونے کے ناطے اپنے ہر قسم کے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔

شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا گیا کہ اس جدید دور میں شریعت کو نئی مملکت کے آئین کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب میں قائد اعظمؒ نے اس پراپیگنڈہ کا مسکت جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

”پیغمبر اسلام جناب رسالت مآب ﷺ ایک عظیم معلم، بے مثل سٹیس مین، ایک ارفع مفقن اور حکمران تھے۔ بیشک جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام محض چند عبادات و عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں، تو بعض لوگوں کو گران گزرتا ہے۔ (لیکن یہ حقیقت ہے) کیونکہ اسلام اپنے

قائد اعظمؒ کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان کا تصور تک نہ تھا

اسلامی قوانین کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر تک ہم قائد اعظمؒ کی خواہش کے مطابق اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ نہ بنا سکے۔ قومی دباؤ کے پیش نظر ۱۹۴۹ء میں قومی ’قرار داد مقاصد‘ منظور کی۔ آج کل بہت سے شور مچا رہے ہیں کہ اس قرار داد مقاصد کی تباہ و برباد ہو گئے اس کو آئین سے نکالا جائے۔

سیکولر ازم:

قائد اعظمؒ کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولر ازم کا لفظ قائد



زبان پر کبھی نہیں آیا لیکن اسلام کا نام ہزاروں زبان سے ادا ہوا۔ قائد اعظمؒ نے قیام پاکستان ۱۰ بار اور قیام پاکستان کے بعد ۱۴ مرتبہ یہ لفظ پاکستان کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہوگی، قرآن ہمارا قانون اور اسوۂ حسنہ ﷺ ہمارے لیے رہنما حیات ہے۔ قائد اعظمؒ صرف بیانات تک ہی نہیں بلکہ انھوں نے علامہ محمد اسد مرحوم کو بلا کر کنسرکشن ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ بھی مقرر کر دیا تھا پاکستان کے قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھانچا عمر بھر پاکستان کو اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست اعلانات کرتا رہا اسے سیکولر کہنا بہتان نہیں تو

ماننے والوں کے جملہ معمولات میں خواہ وہ سیاسی اور معاشی ہی کیوں نہ ہوں، راہنمائی کرتا ہے۔ اسلام انسانوں میں تفریق نہیں کرتا، برابری۔ آزادی اور بھائی چارہ دین فطرت کے بنیادی اصول ہیں اور اسلام کے یہ اصول آج بھی اتنے ہی معزز و معتبر ہیں جتنے کہ ۱۴۰۰ برس پہلے تھے۔“ نئی نظریاتی ریاست کے سربراہ کے ان خیالات کی صدائے بازگشت پوری دنیا میں سنی گئی۔ مذہب کے نام پر ریاست کی تشکیل ہی ایک اچھے سے کم نہ تھی اس پر مستزاد یہ کہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عندیہ دیا جا رہا تھا۔ تمام دنیا کی شیطانی قوتوں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے پاکستان میں موجود اپنے گماشتوں کے ذریعے

جمہوریت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کی کامیابی مسلح جدوجہد یا کسی فوجی بغاوت نہیں بلکہ استدلال کی قوت اور طاقت کی مرہون منت تھی اور قائد اعظمؒ نے قوم اتحاد و اتفاق اور عزم و استقامت کے ذریعے انگریزوں کی مشترکہ سازشوں، ریشہ دوانیوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کا صرف مقابلہ کیا بلکہ اپنے موقف کو منوا کر ایک الگ ست کے قیام کو ممکن بنایا۔ پاکستان کا قیام اس امر کا ثبوت تھا کہ آزادی محض مسلح جدوجہد اور جان و مال کی قربانیوں کے ذریعے نہیں بلکہ رائے عامہ کی طاقت اور قوت کی قوت کے ذریعے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جمہوری اصول کی بنا پر وجود میں آنے والی مسلم ریاست کو چلانے کے لیے بھی بانی پاکستان اور ان کے رفقاء نے جمہوری پیمانی نظام کا انتخاب کیا البتہ قائد اعظمؒ نے بار بار یہ کہا کہ پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں و صورت پر رکھنی چاہئیں۔ اسلام کا سبق یہ ہے کہ مملکت امور و مسائل کے بارے میں فیصلے باہمی بحث و تحقیق مشوروں سے ہوا کریں۔“

اگر قائد کی زندگی میں دستور بن جاتا اور ایک مستحکم پوری پارلیمانی نظام کی بنیادیں رکھ دی جاتیں تو ہمیں اسانات سے دوچار نہ ہونا پڑتا جو ہماری قومی تاریخ کا یہ ہیں لیکن اس کے باوجود اس بارے میں دورائے نہیں آئیں اور قائد کے پیش نظر ایک ایسی ریاست اور سماجی جہاں جمہوری اقدار اور روایات اور اسلام کے اصول و سماجی اصولوں کی پاسداری ہوگی۔ مگر یہ کس قدر حتمی بات ہے کہ ہم آزادی کے کئی عشروں کے بعد بھی

جمہوریت کے ساتھ مذاق میں مگن ہیں۔

قائد تو اتنے محتاط تھے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو ایک موقع پر کسی نے شہنشاہ پاکستان کا نعرہ لگا دیا۔ قائد اعظمؒ نے اسے منع کیا اور کہا، پاکستان شہنشاہیت نہیں بلکہ ایک جمہوریت ہوگا۔

رشوت اور بدعنوانی:

قائد اعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا تھا ”سب سے بڑی لعنتوں میں سے ایک جس سے ہندوستان بری طرح متاثر ہوا ہے، وہ رشوت اور بدعنوانی ہے۔ یہ حقیقتاً ایک زہر ہے ہمیں اپنی باتھ کے ساتھ اسے کچل دینا چاہیے اور دوسری چیز جسے میں انتہائی برا سمجھتا ہوں وہ اقرباء پروری کی برائی ہے اسے بھی بے رحمی سے کچل دینا چاہیے۔“

بدقسمتی سے وطن عزیز نے رشوت، بدعنوانی اور اقرباء پروری میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم دنیا میں اس معاملے میں ایک بدنام ملک کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں۔ کھلم کھلا لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ سپریم کورٹ کے احکامات کی عدم تعمیل ہو رہی ہے۔ خزانہ خالی ہو رہا ہے ملک کے ڈیفالٹ ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے، لیکن لوٹ مار کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا اور صورت حال یہ ہے کہ ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے۔

پاک فوج کا مقام:

قائد اعظمؒ نے ایک جمہوری جدوجہد کے ذریعے پاکستان حاصل کیا تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے جمہوریت کا اعلان کرتے تھے، ان کا آخری دم تک یہی موقف تھا کہ آرمی کا

پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی
اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں

سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے اور اسے سول حکومت کا حکم بجالانے والا ادارہ ہونا چاہیے۔ قائد اعظم نے اپنی موت سے فقط دو اڑھائی ماہ پہلے ۱۳ جون ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ کے ملٹری سٹاف کالج میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

”آپ اور فوج کے دوسرے شعبے پاکستان کے عوام کی عزت، جائیداد اور جان و مال کے محافظ ہیں۔ دفاعی افواج کو پاکستان کی دوسری تمام ملازمتوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے آپ کے کندھوں پر بہت بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بات ضرور یاد رکھیں اور اگر آپ کے پاس کافی وقت ہو تو آپ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جس کو ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق اپنایا ہے اور جو ہمارا موجودہ آئین ہے اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ تمام ایگزیکٹو اختیارات کا منبع حکومت کا سربراہ ہے اور وہ گورنر جنرل آف پاکستان ہے۔ اس لیے آپ تک جو بھی احکام پہنچیں وہ آپ تک اس وقت تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ ان کو ایگزیکٹو ہیڈ کی منظوری حاصل نہ ہو۔“

پاکستان کی یہ بدقسمتی رہی کہ یہاں وقفوں وقفوں کے ساتھ طویل عرصہ فوج اقتدار پر چور دروازے سے آکر قابض رہی۔ یہ فوجی اقتدار ملک کے لیے سم قاتل ثابت ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں بغیر سوچے سمجھے بھارت سے لڑائی چھیڑ دی، ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں اپنے غیر دانش مندانہ اقدامات کے ذریعے ملک کو دو لخت کرا دیا اور مشرق نے پہلے کارگل برپا کر کے اور پھر افغانستان میں امریکا کا بلا سوچے سمجھے ساتھ دے کر ملک کو تباہ و برباد کر دیا۔ افسوس کسی غلطی پر کبھی پکڑ نہیں ہو سکی۔

معاشی نظام:

قائد اعظم کیونرم اور سرمایہ داری نظام کی قباحتوں سے آشنا تھے۔ کمیونسٹوں کو آپ نے باقاعدہ وارننگ دی

تھی اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب آپ نے فرمایا:

”مغرب کے معاشی نظام نے نوع انسانی قریب قریب ناقابل حل مسائل پیدا کیے ہیں اور طرح جانتے ہیں کہ دنیا کو درپیش تباہی سے کوئی بچا سکتا ہے۔ مغرب کا نظام اقتصاد، انسانوں کے انصاف کرنے اور عالمی سطح پر بد مزگی ختم کرنے میں رہا ہے، بلکہ یہ تو دونوں عالمی جنگوں کا بھی بڑی ذمہ دار ہے۔ ہمارا خیال نظر ایک آسودہ اور خوشحال کی تخلیق ہے اور ظاہر ہے، مغرب کا نظام اقتصاد میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔“



آپ خواہ کچھ بھی ہوں، اول و آخر مسلمان

ہم قائد کے ارشادات کو بھلا کر آج تک سرمایہ دارانہ نظام کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ کی بنیاد سود ہے، اور سود کو اسلام..... خدا اور خدا سے جنگ قرار دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم قوت سے جنگ میں مصروف ہے جس میں کامیابی امکان نہیں ہے۔

تعلیم کی اہمیت:

قائد اعظم تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح آپ کی نظر میں تعلیم کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ

کے درج ذیل بیان سے کر سکتے ہیں:

”تعلیم ہمارے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم تعلیم کے بارے میں لاپرواہی کا مظاہرہ کریں گے تو نہ صرف یہ کہ ہم زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ہمارا نام و نشان بھی نہ رہے گا..... ایک مشترکہ کوشش سے ہم نے مادر وطن کی تعمیر کرنی ہے۔“

آج تعلیمی میدان میں کیا آپ کو معلوم ہے ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یونیسکو کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں صرف ایک ملک ایسا ہے کہ جس کی آبادی پاکستان کے لوگوں سے زیادہ اُن پڑھ ہے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان کی آبادی میں کم از کم ۴ کروڑ ۹۵ لاکھ لوگ پڑھ اُن پڑھ یعنی مکمل طور پر غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی پرائمری سکول کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگلے ۳ سال میں یعنی ۲۰۱۵ء تک پاکستان میں اُن پڑھوں کی تعداد ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر سکتی ہے جس کی وجہ سے اسے دنیا کے سب سے زیادہ اُن پڑھ ملک ہونے کا ”اعزاز“ مل سکتا ہے۔

آج یہ جہالت خود کش بمبار، بے روزگار و بے ہنر، آسانی سے گمراہ ہو جانے والے افراد پیدا کر رہی ہے۔ قائد اعظم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تعلیم ہمارے لیے زندگی موت کا سوال ہے لیکن ہم نے ان کی بات پر کان نہ دھرا اور آج ہم سزا بھگت رہے ہیں۔

صوبائیت پرستی:

قائد اعظم نے سیاست میں شمولیت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جس بلند و عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کی وہ قومی اتحاد تھا۔ انہیں سب سے زیادہ عزیز سما جیڑھی قوم میں یہی وصف پیدا کر کے اور اسی ہتھیار کے ذریعے انہوں نے اپنی قوم کو ایک الگ اور آزاد وطن حاصل کر کے دیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ قوم کو یہی تلقین کرتے رہے کہ اتحاد ہی میں ہماری نجات ہے، اتحاد ہی ہماری عظمت اور ترقی کا نشان ہے اور اسی

کے ذریعے ہم مضبوط اور طاقتور ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر اس چیز سے نفرت کرتے تھے جو قوم کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بنے اور اس کی ایک جہتی کونقصان پہنچائے۔ انہوں نے علاقہ پرستی، صوبائیت، نسل پرستی اور لسانی اختلاف کو ہمیشہ پاکستان دشمنی قرار دیا اور ایسی سوچ کو قوم کے حق میں مضر اور نقصان دہ بتایا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ سٹیڈیم میں قائد اعظم نے فرمایا تھا:

”اسلام نے ہمیں یہی سبق دیا ہے اور آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ خواہ کچھ بھی ہوں، اول و آخر مسلمان ہیں، اب آپ ایک باقاعدہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے ایک وسیع علاقہ اپنے تسلط میں کر لیا ہے۔ یہ علاقہ پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں، پٹھانوں یا بنگالیوں کا نہیں بلکہ آپ سب کا ہے۔ اب آپ کی اپنی مرکزی حکومت ہے جس میں ان جغرافیائی وحدتوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ پس اگر آپ اپنے آپ کو ایک قوم، ایک عظیم قوم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے اس صوبائی عصبیت کو ترک کر دیجیے اور اتحاد کا مظاہرہ کیجیے۔

ہم نے قائد کے فرمان کو بھلا کر صوبائی عصبیت کے پودے کو بیج بیج کر مشرقی پاکستان کو اپنے سے علیحدہ کر کے پھینک دیا۔ اب وہی آگ موجودہ پاکستان میں بھڑکائی جا رہی ہے۔ بلوچستان میں پنجابیوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ صوبہ سندھ کے شہر کراچی میں مسلمان مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے۔ صوبہ سرحد کا نام بدل کر صوبے میں نفرت کی نئی دیواریں کھڑی کی گئیں، اب وہاں صوبے کے اندر نئے صوبے بنانے کا اعلان ہو رہا ہے۔ پنجاب میں بھی آگ لگانے کی تیاری ہو رہی ہے، پروگرام یہ ہے کہ اس صوبے کے پہلے دو ٹکڑے کیے جائیں، اور پھر چل سو چل۔

وزیرستان کے بارے میں

قائد کا دانش مندانہ فیصلہ

قائد اعظم کو معلوم تھا کہ قبائلی علاقوں کو انگریز اپنے

قائد کی دور رس شخصیت کے ساتھ مفادات کی شریک حکمرانوں نے اس مسئلہ کا حل نہ نکالا اور پھر نے نقصان بھگتا۔

☆☆

حرفِ آخر:

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے قائد کے فکر کی پاسداری نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری منزل سے بھٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے اور آج ہم مسائل میں گھرے ہوئے ہیں کہ جن کا حل ہماری بالائے۔ آج بھی ہم قائد اعظم کے ارشادات کی میں صحیح سمت میں اپنے سفر کا آغاز کر دیں تو یہ ملک کے دہانے سے باہر نکل سکتا ہے۔ جو ہر سعیدی نے درست کہا ہے:

یہ کوہ کوہ، خود سری۔ یہ کاہ کاہ، پرہمی
یہ سرد سرد، حوصلے۔ یہ گرم گرم، گمراہی!
یہ دشت دشت، وحشتیں۔ یہ شہر شہر، بے دلی
یہ داغ داغ آرزو۔ یہ زخم زخم، زندگی
دھواں دھواں، دماغ ہے
کہ فصل درد و داغ ہے

مگر یہ سب، دل حزیں۔ تمام زندگی نہیں!
ہماری آتش بقا۔ دہی تو ہے، کبھی نہیں

کرے گا چھاؤں، آسمان۔ رہے گی، پاک سر
چھپی ہوئی، حیات نو۔ ہمیں میں ہے، یہیں کہیں
رہے گی تا ابد، جواں۔ بہار، باغ ملک و دیں
نہ ہوگی خاک و خون میں گم۔ مجاہدوں کی سر زمین
چھٹے گا، یاس کا دھواں۔ جلے گی ”مشعل یقیں“
یہ وادیاں، یہ بستیاں۔ ہمارے دم سے ہیں حیاتیں
یہ جسم ہیں تو، جاں ہیں ہم
انہیں کے پاساں ہیں ہم

بے پناہ وسائل کے باوجود کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، اُن لوگوں کو پیار و محبت سے تو ساتھ رکھا جاسکتا ہے لیکن بندوق کی نالی کے ذریعے ڈرایا نہیں جاسکتا کیونکہ ہتھیار تو اُن کے بچے بچے کے پاس ہوتا ہے۔ آپ نے قبائلی علاقوں کو کنٹرول کرنے کے لیے انگریزوں کی بنائی ہوئی پالیسی مسترد کر دی اور کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام فوج کو قبائلی علاقوں سے ہٹالیا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو قبائلی جرگے سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی وفاداری کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے وزیرستان سے اپنی فوجیں ہٹالی ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم آپ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں اور آپ حضرات کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔“

آج ہمارے لاکھوں فوجی وزیرستان اور دیگر قبائلی علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ شمالی وزیرستان پر حملہ کر کے اپنی اور پورے ملک کی بربادی کا سامان کرنے کا ارادہ ہے۔ اربوں روپیہ اس جنگ میں جھونکا جا چکا اور ابھی نجانے مزید کتنا ڈبونا ہے۔

قومی زبان:

قائد اعظم کی زندگی میں ہی قومی زبان کا مسئلہ سامنے آگیا تھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان قرار دیا جاتا تو علیحدگی کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

یہ علاقہ

پنجابیوں، سندھیوں
بلوچیوں، پٹھانوں
یا بنگالیوں کا نہیں
بلکہ آپ سب
کا ہے



2012 کی بہترین

طبی ایجادات

جوتا، گھڑی، موبائل فون..... اور اسی قسم کی دیگر بہت سی اشیاء ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے، ہم دھیان ہی نہیں دیتے کہ معمولی سی ایجاد بھی جنم لینے میں کئی برس لیتی ہے۔ محقق برسوں شبانہ روز محنت کرتے ہیں تب ایک ایجاد ہمارے سامنے آتی ہے۔ دنیائے طب میں تو ایجادات مزید وقت لیتی ہیں کیونکہ انھیں ہر حال میں انسانوں کے لیے محفوظ اور موثر ہونا چاہئے۔ ذیل میں ایسی بے مثال طبی ایجادات کا تذکرہ پیش ہے جو سال رواں میں وجود میں آئیں یا تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ ان ایجادات کی خوبی یہ ہے کہ یہ انسانی علاج کے جاں گسل مراحل کو آسان بنا دیں گی

عاصم محمود

ذیابیطس کے کئی مریضوں کو باقاعدگی سے اپنا جسم چھیدنا پڑتا ہے تاکہ خون میں گلوکوز یا شکر کی سطح دیکھ سکیں۔ یہ عمل خاصا تکلیف دہ ہے کیونکہ بدن میں جگہ جگہ چھید ہو جاتے ہیں۔ مریضان ذیابیطس کی اس مشکل کو مد نظر رکھ کر کینیڈا کی ویسٹرن اونٹاریو کے محقق جن زیانگ نے ایک کرسٹاتی لینز ایجاد کیا ہے۔ جب خون میں شکر کی سطح بڑھ جائے، تو وہ سرخ ہو کر مریض کو اس امر کی اطلاع دیتا ہے۔

یہ کنٹیکٹ لینز دراصل ننھے مئے ”نینو (Nano) ذرات“ رکھتا ہے۔ یہ نینو ذرات آنسوؤں کے محلول (Tear Fluid) میں مسلسل شکر کی سطح کو چیک کرتے ہیں۔ جب بھی سطح بڑھے، تو وہ اپنا رنگ تبدیل کر کے سرخ ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران انسان کی بصارت بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ چنانچہ خون میں شکر کی سطح پر تال کرنے کے سلسلہ میں یہ بڑا سہل اور موثر جدید آلہ ہے۔ یہ واضح رہے کہ آنسوؤں کے محلول میں خون کی نسبت شکر کی سطح ۳۰ مرٹ بعد بڑھتی ہے۔ تاہم بیشتر مریض جلد چھیدنے کے دو مرحلوں کے درمیان چند گھنٹوں کا وقفہ رکھتے ہیں لہذا یہ بے ضرر کنٹیکٹ لینز انھیں جلد چھیدنے کے تکلیف دہ عمل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

نئی قسم کی ویکسین

انسانی جسم میں ویکسین سرخ کے ذریعے داخل کی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بدن انسان میں جو ”مامون“ (Immune) یا ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھنے والے خلیے ہیں، وہ تندرست و توانا ہو جائیں اور بیماری کا بخوبی مقابلہ کریں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ویکسین بہت کم مامون خلیوں تک پہنچ پاتی ہے۔ یہی مسئلہ مد نظر رکھ کر آسٹریلوی یونیورسٹی آف کوئینزلینڈ کے محقق، پروفیسر مارک نے ایسی چھپی تیار کی ہے جس پر ننھے مئے نوکیلے ابھار ہیں۔ جب ان ابھاروں پر ویکسین لگائی جائے، تو وہ اسے جلد کی بالائی سطح پر موجود مامون خلیوں تک براہ راست پہنچا دیتے ہیں۔ (انسانی جسم میں اسی جگہ سب سے زیادہ مامون خلیے ملتے ہیں۔ یوں نہ صرف ویکسین فوراً مامون خلیوں تک پہنچتی ہے بلکہ ٹیکا لگانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس چھپی کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں خشک ویکسین لگتی ہے جسے ریفریجریٹر میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ مزید برآں وہ زیادہ عرصہ چلتی ہے۔ چنانچہ اسے غریب ممالک میں بکثرت استعمال کرنا ممکن ہے جہاں شہروں میں ریفریجریٹر کم ملتے ہیں۔ نیز کسی وبا کے دوران یہ چھپیاں ہزاروں لاکھوں مریضوں کی جانیں بچا سکتی ہیں۔



نسوں کی شناخت ہوئی آسان

ایک کلینک یا ہسپتال میں تجربہ کار نرسیں یا ڈاکٹر بھی عموماً مریض کے بدن میں متعلقہ نس ڈھونڈتے ہوئے خاصے پریشان ہوتے ہیں خون لینے یا ٹیکا لگانے کے لیے۔ ایک تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ۵۰ فیصد تک پہلی کوششیں ناکامی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امریکی ماہرین نے ”نس شناخت کنندہ“ (Vein Viewer) ایجاد کیا۔ اس کے ذریعے جلد کی ۱۰ ارٹلی میٹر گہرائی



تک کسی بھی نس کو تلاش کرنا ممکن ہے۔ یہ آلہ انسانی بدن پر سبز رنگ کی ”نزد-زیریں“ سرخ (Near-Infrared) روشنی چھوڑتا ہے۔ یہ روشنی جلد کو بالکل نقصان نہیں پہنچاتی اور نہ ہی حرارت پیدا کرتی ہے۔ یوں اس انوکھے آلے نے نسوں کی تلاش کا کٹھن کام آسان بنا دیا۔ یہ آلہ امریکا اور سنگا پور کے ہسپتالوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے خصوصاً بچوں میں ٹیکا لگنے کا خوف کم ہو گیا اور وہ اس کی ٹھنڈی سبز روشنی پسند کرتے ہیں۔

نوزائیدہ بچے بچانے کا نیا طریقہ

جیسے ہی بچہ جنم لے، نرس یا دایہ آنول نال کاٹ دیتی ہے، لیکن آسٹریلیا میں وینر سنٹر فار نیو بورن سے منسلک سائنسدان ڈاکٹر ویم تارنو نے دریافت کیا ہے کہ اگر دو تین منٹ انتظار کر لیا جائے تو بچہ کمی خون (Anaemia) کے مرض سے بچ سکتا ہے۔

دراصل جب بچہ جنم لیتا ہے، تو اس کے جسم کا بیشتر خون پیچھڑوں کی نالیوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ یوں دیگر اعضائے جسم میں کمی خون کا خلل جنم لے کر مختلف خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ لیکن نرس یا دایہ بچے کی پیدائش کے بعد اُسے دو تین منٹ آنول سے نیچے تھامے رکھے، تو ماں کے جسم سے اُسے مزید خون مل جاتا ہے۔ یوں کمی خون پیدا نہیں ہوتی۔ مزید برآں اس عمل کے ذریعے بچے کے بدن میں فولاد کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ہو جاتا ہے۔



مرہم پٹی کی جدید قسم

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زخم پر روزانہ نئی مرہم پٹی ہونی چاہیے تاکہ پتا چلتا رہے کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی نئی مرہم پٹی ہو تو نہ صرف عمل صحت یابی رکتا ہے، بلکہ زخم سے نئے جراثیم بھی چب سکتے ہیں۔ یہی مسئلہ حل کرنے کی خاطر میونخ، جرمنی میں فراؤ ہوفر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار موڈلر سولڈ سٹیٹ ٹیکنالوجی کے ماہرین نے نئی قسم کی مرہم پٹی ایجاد کی ہے۔

اس مرہم پٹی کا کرشمہ یہ ہے کہ وہ چھوئے بغیر معالج یا مریض کو بتا دیتی ہے کہ اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ دراصل یہ نئی مرہم پٹی اپنا رنگ تبدیل کر کے اس امر کی اطلاع دیتی ہے۔ اس جادوئی مرہم پٹی کا راز ایسی ڈائی (Dye) میں پوشیدہ ہے جو جلد کی بدلتی پی ایچ (PH) سطح نوٹ کر کے اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ دراصل صحت مند اور مندمل شدہ زخم کی پی ایچ قدر (ویلیو) 5 سے نیچے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ قدر 5.6 اور 8.5 کے مابین ہو، تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ زخم ٹھیک نہیں ہوا۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ نئی ڈریسنگ ہونی چاہیے۔

جسم انسانی کے پرزہ جات

انسان کا کوئی عضو خراب ہو جائے، تو پھر اسے ہمیشہ کے لیے اس سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ خصوصاً آنکھ، پتہ، کان وغیرہ خراب ہو جائے تو انسان آئندہ زندگی گزارتے ہوئے بڑی تکالیف برداشت کرتا ہے لیکن اب رفتہ رفتہ صورت حال بدل رہی ہے۔ یورپی اور امریکی ماہرین طب و سائنسدان ہر سال قدم بہ قدم مشینی و مصنوعی اعضا بنانے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تک مشینی بازو، ٹانگیں، آنکھیں، کان وغیرہ ایجاد ہو چکے۔ اب اگلا مرحلہ ایسے مصنوعی اعضا بنانے کا ہے جو انسانی اعضاء جیسے نہیں تو کم از کم ان سے ملتے جلتے ضرور ہوں۔

دماغ: امریکا کی یونیورسٹی آف ساؤتھرن کیلی فورنیا نے بذریعہ نیونیکینالوجی ایسا ننھا منابرقی سرکٹ بنایا ہے جو بالکل نیورون کی طرح کام کرتا ہے۔ واضح رہے، ہمارا دماغ انہی نیورونوں کا مجموعہ ہے۔

یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ دماغ کا ایک بھی نیورون خراب ہو جائے، تو پھر اس کی مرمت نہیں ہو سکتی۔ اگر ماہرین طب مصنوعی نیورون ایجاد کر لیں، تو یوں بیشتر دماغی امراض کا علاج آسان ہو جائے گا۔

تاہم ماہرین نے ابھی کئی ٹھن مراحط طے کرنے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ۱۲ برقی سرکٹوں کو باہم کیونکر ملایا جائے کہ وہ باہمی ربط ضبط سے کام کرنے لگیں، جیسے ۱۲ دماغی نیورون اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ پھر دماغ میں نیورونوں کے مابین مسلسل نئے جوڑ بننے رہتے ہیں۔ ماہرین کو اس مشکل سے بھی عہدہ برآہ ہونا ہے۔

پتہ: امریکی سائنس دان ایسا مصنوعی پتہ بنانے کے قریب ہیں جو ذیابیطس قسم اول کا شکار لوگوں میں نظام انسولین منظم کرے گا۔ انسولین پمپ اور گلوکوز سینسروں پر مشتمل یہ مصنوعی عضو جسم میں انسولین کی درست مقدار خارج کرے گا اور خون کے مسلسل ٹیسٹوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یوں مستقبل میں ذیابیطس کے قسم اول کے لاکھوں مریضوں کو روزانہ انسولین لینے اور خون کے ٹیسٹ کرانے سے نجات مل جائے گی۔

آنکھ: آسٹریلوی سائنسدان اگلے سال تک مصنوعی آنکھ ایجاد کر لیں گے۔ یہ مصنوعی آنکھ ایک مائیکرو چپ اور برقی عینک پر مشتمل ہے۔ مائیکرو چپ پردہ چشم (Retina) پر نصب ہوگی۔ پھر بینائی سے محروم فرد برقی عینک لگائے گا۔ یہ برقی عینک جو مناظر دیکھے گی، انتہائی طاقتور ریڈیائی سنگنوں کی صورت مائیکرو چپ کو بھجوائے گی۔ چپ سنگنوں کو برقی تحریری لہروں (Impulses) میں بدلے گی۔

پردہ چشم فطری انداز میں ان برقی تحریری لہروں بذریعہ بصری عصب (Optic Nerve) دماغ تک پہنچائے گا۔ دماغ پھر انسان کو اس قابل بنادے گا کہ وہ منظر خاصی حد تک دیکھ سکے۔ ماہرین کے مطابق یہ مصنوعی آنکھ بوڑھے مردوزن کے لیے خصوصاً مفید ثابت ہوگی جن کی بینائی عمر کے باعث کمزور ہو جاتی ہے۔

جادوئی آئینہ

امریکی یونیورسٹیوں ایم آئی ٹی اور ہارورڈ کے ماہرین مل کر ایسا کرشماتی آئینہ ایجاد کر رہے ہیں جو برش کرتے انسان میں نبض کی رفتار، دل کی دھڑکن، سانس لینے کی شرح نوٹ کرے گا۔ یہ عام آئینہ کی طرح ہی ہوگا، مگر ایک ڈیجیٹل باکس کی طرح درج بالا انسانی جسم کے اشارے عیاں کرے گا۔ اس آئینے میں ایک طاقتور مائیکرو چپ ہے۔ وہ چہرے پر خون کی نالیوں میں بہاؤ کے معمولی انحراف کو بھی نوٹ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی انحراف جان کر وہ بتائے گا کہ اس وقت ہماری رفتار نبض، حرکت قلب اور رفتار تنفس کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ آئینہ میں ظاہر ہونے والا یہ ڈیٹا بذریعہ انٹرنیٹ خاندانی ڈاکٹر کو بھیجا جائے گا۔ وہ پھر روزانہ اور ماہانہ کا حساب رکھ کر اس امر پر نظر رکھے گا کہ فرد کسی مرض میں مبتلا تو نہیں ہو رہا؟

ایک تیر سے دو شکار

چند سال قبل امریکی ماہرین طب نے انبریل (Enbrel) نامی دوا ایجاد کی تھی۔ یہ ”امراض خود منج“ (Autoimmune disorders) دور کرنے میں کام آتی ہے۔ (یعنی وہ امراض جن میں انسانی بدن از خود حرکت کرنے لگتا ہے)۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ اہم دماغی مرض، الزائمر میں بھی مفید ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریض بتدریج اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے۔

یہ دوا ایک خاص پروٹین، ٹی این ایف (ٹیو مرٹیکروسیس فیکٹر) کو نشانہ بناتی ہے۔ یہ پروٹین الزائمر کے مریضوں کے دماغ میں غیر معمولی طور پر زیادہ پایا جاتا ہے۔ جب دوا بذریعہ انجکشن گردن میں داخل کی جائے، تو یہ بہت جلد پروٹین کی سطح معمول پر لے آتی ہے۔ یوں مریض کی یادداشت بہتر ہوتی اور وہ ارتکاز کی قدرت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

دماغ ٹھنڈا کرنے والا کولر

سوڈن کے طبی ادارے، کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ کے محققوں نے بعد از تجربات دریافت کیا ہے کہ اگر ہارٹ اٹیک کے فوراً بعد مریض کو تھیراپیوٹک ہائپوٹھرمیا (Therapeutic Hypothermia) فراہم کیا جائے (یعنی دانستہ اس کا دماغ و بدن ٹھنڈا کر دیں) تو وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ سکتا ہے لیکن یہی عمل بعد از وقت اپنایا جائے، تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

یہی دریافت مد نظر رکھ کر ادارے کے محققین نے ”رائنوجیل“ نامی ایک کولر ایجاد کیا ہے۔ یہ کولر ناک کے ذریعے مادہ تبرید براہ راست بدن اور دماغ تک پہنچاتا ہے۔ اگر ہارٹ اٹیک کے بعد ۱۰ منٹ کے اندر اندر مریض کو سی پی آر اور رائنوجیل کا مادہ تبرید مل جائے، تو وہ ۹۰ فیصد تک خطرہ کم کرتا ہے اور متاثرہ شخص کے دماغ کو بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ رائنوجیل بجلی کے بغیر بھی کام کرتا ہے۔

چھاتی کے سرطان کا بہتر معاینہ

دنیا میں ہر سال ہزار ہا خواتین چھاتی کے سرطان (کینسر) کا نشانہ بنتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب تک کوئی اس کینسر نہیں تھا جو ابتدا ہی میں سرطانی گٹھلی کو شناخت کر لے۔ چنانچہ جب سرطانی خلیے خاتون کے جسم میں جڑ پکڑ لیتے ہیں تو اس وقت کا علم ہوتا مگر اب یہ تکلیف رفع ہونے والی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے ”ملٹی سٹیک اریس پروسیسنگ فار ریڈیو ویو ایج ایکویزیشن“ (Multistatic Array processing for radiowave image acquisition) نامی ایک مشین ایجاد کی ہے۔ یہ مشین ریڈیائی لہروں کے ذریعے چھاتی کی گہری بافتوں میں چھپی گٹھلی کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ گویا اب خواتین کو چھاتی کا باقاعدہ معاینہ کرانے کی ضرورت نہیں، بس سال میں درج بالا مشین سے اسکریننگ کرانا کافی ہے۔

بال بچانے والی ٹوپی

اگر کوئی سرطان کا علاج بذریعہ کیموتھراپی کروائے تو عموماً سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ یوں وہ خاصا عجیب نظر آتا ہے۔ اب امریکی ماہرین نے دوران کیموتھراپی سر کے بال محفوظ کرنے والی خصوصی ٹوپی تیار کی ہے۔ یہ سر ٹھنڈا رکھ کر ۸۰۰ فیصد بال گرنے نہیں دیتی۔ ڈیگنیکپ (Dignicap) سسٹم نامی یہ سیلیکون ٹوپی ۱۲ کوانٹوں پر مشتمل ہے۔ ان میں موجود مادہ تبرید (Coolant) مسلسل سر کے ارد گرد چکر لگاتا اور اسے سرد رکھتا ہے۔ جب مریض یہ ٹوپی پہنے تو سر میں خون کی نالیاں بھنچ جاتی ہیں۔ یوں ان میں خون کا بہاؤ کم ہوتا اور کیموتھراپی کے اثرات سرطان میں مبتلا مردوزن مریضوں کے خوبصورت بال دوران علاج محفوظ رہتے ہیں۔

موبائل اسکینر

دور جدید میں الٹراساؤنڈ بڑے کام کا طبی آلہ ہے۔ اس کے ذریعے کئی بیماریوں کا بروقت پتا چل جاتا اور بذریعہ علاج انہیں ختم کرنا آسان ہوتا ہے۔ الٹراساؤنڈ کی زبردست افادیت دیکھ کر ہی جرمن سائنس دانوں نے موبائل فون جتنا الٹراساؤنڈ اسکینر ”وی اسکین“ ایجاد کر لیا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے کہیں بھی لے جانا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکا میں کئی ڈاکٹر اسے ایکوکارڈیوگرافی لیب، آؤٹ پشٹنٹ کلینک، کورونری کیئر یونٹ، ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ اور ہسپتال کے دیگر شعبہ جات میں لیے گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک ہسپانوی ڈاکٹر جو زامورانو کا کہنا ہے ”کبھی بھی شعبے میں زیر علاج مریض کو کبھی الٹراساؤنڈ کی ضرورت پڑے تو میں فوراً اپنا وی اسکین نکال لیتا ہوں۔ اس کی وجہ سے اب مریضوں کا علاج آسان ہو گیا۔“



خراٹے ختم کرنے والا تکیہ

جو لوگ نیند کی ایک بیماری آپسز کیٹوسلیپ اپنویا (Obstructive Sleep apnoea) میں مبتلا ہوں، وہ بڑے زوردار خراٹے لیتے ہیں۔ اس طبی خلل میں نہ صرف جسم میں خون کا دباؤ کم ہوتا بلکہ خون میں آکسیجن کی مقدار بھی گھٹ جاتی ہے۔ خون کا دباؤ اور آکسیجن کی مقدار جتنی کم ہوگی، فرد اتنے ہی با آواز بلند خراٹے لے گا۔ یہ خراٹے دوسروں کی بھی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ٹوکیو کی واسیدہ یونیورسٹی کے محققوں نے قطبی ریچھ نما ایک انوکھا مشینی تکیہ ایجاد کیا ہے۔ اس تکیہ میں حساس آلات (Sensors) نصب ہیں جو خراٹوں کی آواز، خون کا دباؤ اور آکسیجن کی سطح نوٹ کرتے ہیں۔ جب بھی خراٹے بلند ہوں اور خون کا دباؤ کم ہو جائے، تو تکیے کا مشینی بازو حرکت میں آتا اور ہولے سے چہرے یا سر پر ٹھوکا دیتا ہے۔ ٹھوکے کے باعث فرد کروٹ بدلتا ہے، یوں اس کی سانس معمول پر آ جاتی ہے۔



باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا حضرت علی المرتضیٰ نے (مارچ ۵۹۸ء - جنوری ۶۶۱ء)

- 1 جو حق بات کہنے سے خاموش رہتا ہے، گونگا شیطان ہے۔
- 2 شرافت اور رذالت کا پتا آزمائش کے وقت چلتا ہے۔
- 3 میں نے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے اور عقدوں کے حل ہونے سے پہچانا ہے۔
- 4 جو شخص کھانے کے سبب بیمار ہوتا ہے اس کے لیے یہ بات سخت باعث شرم ہے۔
- 5 دوسروں کے ان عیوب کی تشہیر نہ کرو جن پر اللہ پروردہ ڈال رہا ہو۔
- 6 کمینے انسان کو جب بڑا رتبہ مل جاتا ہے تو وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔
- 7 جواں مرد وہ ہے جو اپنے مال سے اپنی عزت کی حفاظت کرے اور کمینہ وہ ہے جو اپنی عزت کی قیمت پر مال حاصل کرے۔

آپ کا نام ابوالحسن تھا۔ والد کا نام ابو طالب جو کہ حضور ﷺ کے حقیقی چچا تھا۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔ آپ حضور ﷺ کے چچا بے بھائی تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲ ربیع ۳۰ عام الفیل میں خانہ کعبہ میں ہوئی۔ پہلے مرد مسلمان تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں قریش کی ایک محترم و معتبر شاخ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عثمان کی شہادت کے باوجود دن انصار و مہاجرین بہ اصرار آپ کو مسجد نبویؐ میں لائے۔ آپؐ منبر رسول ﷺ پر رونق افروز ہوئے۔ لوگ بیعت کرنے لگے۔ جنہوں نے انکار کیا ان کو مجبور نہ کیا گیا۔ ان میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، عشرہ مبشرہؓ میں سے چند اصحاب اجمعین اور دیگر لوگ شامل تھے۔ اہل مکہ نے بھی بیعت سے انکار کر دیا۔ کچھ غیر جانبدار رہے اور کچھ آپؐ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ تھے۔ آپؐ کے خلیفہ بننے ہی حضرت عثمان کے قصاص کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہی مسئلہ جنگ جمل کا باعث بنا۔ حضرت عمرؓ کا رعب و دبدبہ لوگوں پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے حلم و بردباری اور نرم مزاجی سے لوگ نرم خو ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے دوبارہ عہد فاروقی کی روش اختیار کی تو انصاف کو ترجیح دی، غیر ضروری مراعات سے احتراز کیا۔ لیکن بقول ڈاکٹر طلحہ حسین یحیویہ آپ کے دور خلافت میں لوگوں کی اداسی بدستور قائم رہی۔ باقی مدینہ کی قیوں میں دندناتے پھرتے رہے اور شورش و انتشار کا ایک نیا سلسلہ چل نکلا۔

آپؐ نہایت بلند حوصلہ، نڈر، بے باک، خدا ترس، عالم و فاضل، امین، اسلام کے سچے جاں نثار، حضورؐ سے محبت کرنے والے، اور حد درجہ سخی و پرہیزگار تھے۔ فہم قرآن میں یکتا اور منصف مزاج تھے۔ اسلامی فقہ اور قانون میں مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی اور دیگر علوم میں درجہ حاصل تھا۔ آپؐ ۳۶ سے ۴۰ تک مسند خلافت پر متمکن رہے۔ حضور ﷺ نے آپؐ کو اپنی تلوار عطا فرمائی جسے ذوالفقار کہا جاتا تھا۔ یہ تلوار ترکی کے قوط کا پی میوزیم میں موجود ہے۔ آپ کو ۲۱ رمضان ۴۰ھ میں ابن ابی بنی نے کوفہ کی مسجد میں اس وقت شہید کیا جب آپؐ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ آپ کا روضہ نجف اشرف (عراق) میں ہے۔

ہائپرٹینشن کا خاتمہ

ماہرین طب جان چکے ہیں کہ ہمارا ”شارکی نظام اعصاب“ (Sympathetic Nervous system) ہمارے بیشتر اندرونی اعضا کو کنٹرول کرتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو مرد وزن بلند فشارخون (ہائی بلڈ پریشر یا ہائپرٹینشن) کے مریض ہوں، ان میں گردوں کے نزدیک واقع شارکی اعصاب زود حساس ہو جاتے ہیں۔ یہ خرابی پھر ہائی بلڈ پریشر میں اضافہ کرتی ہے۔ ۲ سال قبل اس خرابی سے چھٹکارا پانے کی خاطر آسٹریلوی ماہرین طب نے ایک نئی قسم کا طریق آپریشن دریافت کیا۔ اس آپریشن میں بذریعہ جانگھ گردوں کے نزدیک واقع ایک شریان تک کیتھو داخل ہوتا ہے۔ اسی شریان کے نزدیک شارکی اعصاب واقع ہیں۔ بذریعہ کیتھو پھر انھیں ”سلا“ دیا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ آپریشن بہت جلد انجام پاتا ہے اور بدن میں کٹاؤ بھی بڑا نہیں لگتا۔ مزید برآں اس کی وجہ سے فوراً بلند فشارخون میں کمی آ جاتی ہے۔ اب تک ۱۰ ہزار مرد وزن یہ آپریشن کرا چکے اور ۹۰ فیصد تک کو کامیابی نصیب ہوئی۔

چل کر بے سکونی ختم کیجیے

مغرب میں ادراکی رویہ (Cognitive behavioural) علاج کے ذریعے بے سکونی یا تشویش ختم کرنے کی سعی ہوتی ہے۔ یہ طریق علاج سب پر کارگر ثابت نہیں ہوا۔ تاہم ماہرین طب نے یہ ضرور دریافت کر لیا کہ بعد از علاج اگر چہل قدمی یا تھوڑی بہت ورزش کی جائے، تو اس سے نتائج پر مثبت اثر پڑتا ہے۔

دراصل معمولی ورزش کرنے سے بھی ہمارا بدن ایک نیوروترانسمیٹر گلوٹامیٹ خارج کرتا ہے۔ یہ مادہ سکھلائی کے عمل میں ہماری مدد کرتا ہے۔ چنانچہ علاج کے بعد معتدل ورزش کی جائے، تو مریضوں کو روئے سیکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس طرح علاج بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

کام ہوا آسان

۱۵ سال قبل ہسپتالوں میں مصروف کار ڈاکٹروں کو کسی طبی مسئلہ سے پالا پڑتا، تو وہ گھنٹوں لائبریری میں رہتے اور حل کی تلاش میں سرکھپاتے لیکن اب انٹرنیٹ نے

ان کا کام بہت آسان بنا دیا۔ آج ڈاکٹر چلتے پھرتے اپنے سمارٹ فون یا لپ ٹاپ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ۱۰ منٹ میں دقیق طبی مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

سرطانی خلیے منٹوں میں ختم

آج خدا نخواستہ کوئی انسان سرطان کا نشانہ بن جائے، تو اُسے کیموتھراپی اور ریڈیو تھراپی کے جاں گسل مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن سویڈش سائنس دانوں کی سعی و مہربانی سے علاج کی مدت بہت گھٹ سکتی ہے۔ کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ نامی سویڈش طبی ادارے سے وابستہ ماہرین نے پریفرنٹیل ریڈیو۔ فریکوئنسی ابلیشن نامی طریق علاج ایجاد کیا ہے۔ اس طریقہ میں ”اہل کر“ سرطان کے تمام خلیوں کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ایک الیکٹروڈ سرطانی گٹھی کے قلب میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اُسے ۹۰ درجے سینٹی گریڈ تک گرم کیا جاتا ہے تاکہ تمام سرطانی خلیے ختم ہو جائیں۔ خاص بات یہ ہے کہ گٹھی کے ارد گرد موجود بافتوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

کہا کنفیوشس نے (۴۷۹-۵۵۱ قبل مسیح)

- 1 دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔
- 2 اگر تم کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہو تو بڑی چیز تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔
- 3 ایک اندھا دوسرے اندھے کی قیادت کرے گا تو دونوں غار میں گریں گے۔
- 4 اگر تم ایسی باتیں سنو جو تمہیں ناگوار محسوس ہوں تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کر کہ کہیں یہ باتیں صحیح تو نہیں؟
- 5 تاریکی کو کوسنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ ایک ننھا سا دیا ہی روشن کر دیا جائے۔
- 6 جس طرح مچھلی دانے کو دیکھتی ہے دام (کانٹے) پر اس کی نظر نہیں جاتی اسی طرح نادان نفع کو دیکھتا ہے، ضرر (نقصان) تک اس کی نگاہ نہیں پہنچتی۔
- 7 سب سے بڑی فتح مندی کرنے اور گر کر اٹھنے کی طاقت حاصل کرنے میں ہے

ماہ رفتہ میں رونما ہونے والے
اہم واقعات اور ان سے
وابستہ شخصیات کا اجمالی تذکرہ
جو ملک کا وقت تار بڑھنے کا
باعث ہیں

ان کے لیے خاص جنہیں پاکستان اور
پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

تحریم حنا صدیقی

۳ رگنما پاکستانی ہیروز

جن کے واقعات پڑھ کر انسان کا سرفخر سے بلند ہو جاتا اور اپنے پاکستانی ہونے پر ناز محسوس ہوتا ہے
اور دل ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے

1

قوم کے ایک بچے کی خاطر حالتِ روزہ میں جان قربان کر دی

ریلوے سٹیشن پر ریلوے پولیس کا ٹیبیل سہیل محمود ڈیوٹی
دے رہا تھا۔ بچے کو نیچے گرتے اس نے بھی دیکھا تھا۔ اس
بچے کو بچانے کے لیے سہیل محمود کے پاس صرف چند سیکنڈ
تھے۔ سہیل محمود نے اپنی جان پر فرض کو فوقیت دی اور بجلی
کی تیزی کے ساتھ اس معصوم بچے کو بچانے کے لیے آگے
بڑھا۔ ٹرین بالکل سر پر پہنچ چکی تھی کا ٹیبیل سہیل محمود نے
پلیٹ فارم کے کنارے پر لیٹ کر بچے کو جیسے ہی بازو سے
تھاما، ٹرین بالکل قریب آگئی۔ سہیل نے ایک جھٹکے سے

منج ساڑھے نو بجے کا وقت تھا، سپر ایکسپریس ٹرین
لانڈھی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ ٹرین نے جیسے ہی
سیڈ پکڑی اچانک ایک ۶ سالہ بچہ پلیٹ فارم پر کھیلنے
کھیلنے نیچے گر گیا۔ اپنے سامنے سے ٹرین کو آتے دیکھ کر
اس بچے کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے، وہ
چلتے چلتے جسم کے ساتھ رونے لگا۔ ارد گرد کھڑے لوگوں کی
توجہ اس بچے کی طرف مرکوز ہو گئی۔ ٹرین کی سپیڈ دیکھتے ہوئے کسی کی ہمت
نہ ہو رہی تھی کہ نیچے اتر کر اس بچے کی جان بچا سکے۔ اس

چینی مفکر، مصنف، سیاستدان، فلسفی کنفیوشس قدیم چین کی ریاست "نو" (Nu) میں ژو (Zu) کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کے
باپ کا نام کونگ ہی (جسے شولیاگ بھی کہتے ہیں) تھا، جو لو (Lu) کی فوج میں افسر تھا۔ کنفیوشس ۳ رسال کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ اس
کی ماں نے اُسے انتہائی غربت اور کمپرسی کی حالت میں پالا۔ اُس نے گڈریے، کلرک اور فٹنی گیری کا کام کیا۔ ۳۱ رسال کی عمر میں
اُس نے ماں کی وفات پر ۳ رسال تک اُس زمانے کی رسم کے مطابق سوگ منایا۔
اُس کی زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے۔ جنگوں اور تباہی اور بربادی کا مشاہدہ کیا۔ حکومتوں کو بننے، بگڑتے دیکھا، حکمرانوں کا
عروج و زوال دیکھا۔ اس نے اپنی عقل و دانش کی بنا پر شہرت حاصل کی اور ۵۰۱ قبل مسیح میں ایک چھوٹے قصبے کا گورنر بنا دیا گیا۔
جلد ہی وہ وزیر جرائم کے عہدے تک ترقی کر گیا۔ وہ اپنے زمانے کے حکمرانوں کے دل میں اپنا احترام پیدا کرنے میں کافی کامیاب
رہا۔ سب اُس کی پیش بینی، عملی سیاسی قابلیت اور انسان کے کردار کو سمجھنے کی صلاحیت کے قائل تھے۔ اُس نے اپنے ملک کو مضبوط
بنانے میں زبردست کردار ادا کیا مگر وہ اپنی آئیندگی اور اصلاحات کو من و عن نافذ نہ کر سکا۔ اس دوران میں ملک میں بہت سے طاقتور
لوگ اُس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ ۴۹۷ قبل مسیح میں وسکاؤنٹ جی ہوا کے رویے سے تنگ آ کر اُس نے جلاوطنی اختیار کر لی اور
وسکاؤنٹ کی زندگی میں وطن واپس نہیں آیا۔

اس نے سماجی رشتوں کی پاسداری، اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور انصاف و اخلاص کا سبق دیا۔
بہت سی کلاسیکی تحریریں جن میں ۵ کلاسکس بھی شامل ہیں اس نے منسوب کی جاتی ہیں۔ اس کے اقوال پر مشتمل "کنفیوشس" اس
کی وفات کے کئی سال بعد منظر عام پر آئی۔ بہت سی چینی روایات اور اعتقادات کی بنیاد اس کے پیش کردہ اصولوں پر ہیں۔ وہ خاندان
سے وفاداری، بزرگوں کے احترام، بیویوں کا شوہروں اور بچوں کے بزرگوں کے لیے احترام پر زور دیتا ہے۔ اس نے خاندان کو
حکومت کی بنیاد قرار دیا۔

2 سپاہی مقبول حسین پاکستان مردہ باذہبیں کہا اور زبان کٹوالی

۱۷ ستمبر ۲۰۰۵ء کو واہگہ بارڈر کے راستے بھارتی حکام نے قیدیوں کا ایک گروپ پاکستانی حکام کے حوالے کیا۔ اس گروپ میں مختلف نوعیت کے قیدی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گٹھڑیوں کی شکل میں کچھ سامان تھا جو شاید ان کے کپڑے وغیرہ تھے۔ لیکن اس گروپ میں ۶۵، ۶۰ سال کا ایک ایسا پاکستانی بھی شامل تھا۔ جس کے ہاتھوں میں کوئی گٹھڑی نہ تھی۔

جسم پر ہڈیوں اور ان ہڈیوں کے ساتھ چٹنی ہوئی اس کی کھال کے علاوہ گوشت کا کوئی نام نہیں تھا۔ اور جسم اس طرح مڑا ہوا تھا جیسے پتنگ کی اوپر والی کان مڑی ہوتی ہے۔ خود رو جھاڑیوں کی طرح سر کے بے ترتیب بال جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ طویل عرصے تک ان بالوں نے تیل یا گٹھڑی کی شکل تک نہیں دیکھی ہوگی۔ دکھ کی بات کہ پاکستان میں داخل ہونے والے اس قیدی کی زبان بھی کٹی ہوئی تھی لیکن ان سارے مصائب کے باوجود اس قیدی میں ایک چیز بڑی مختلف تھی اور وہ تھیں اس کی آنکھیں، جن میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

پاکستانی حکام کی طرف سے ابتدائی کارروائی کے بعد ان سارے قیدیوں کو فارغ کر دیا گیا۔ سارے قیدی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ بوڑھا قیدی اپنے گھر جانے کے بجائے ایک عجیب منزل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کانپٹے اور ناتواں ہاتھوں سے وہ ٹوٹے ہوئے الفاظ لکھ لکھ کر اپنی منزل کا پتا پوچھتا رہا اور ہر کوئی اسے ایک غریب سائل سمجھ کر اس کی رہنمائی کرتا رہا اور یوں ۲۰۰۵ء میں یہ بوڑھا شخص پاکستان آرمی کی آزاد کشمیر رجمنٹ تک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک عجیب دعویٰ کر دیا۔ اس دعوے کے پیش نظر اس شخص کو رجمنٹ کمانڈر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ کمانڈر کے سامنے پیش ہوتے ہی نہ جانے اس بوڑھے ناتواں شخص میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ

تیم اپریل ۱۹۷۲ء کو صوابی کے گاؤں ضرابی میں پیدائش ہوئی تھی۔ ۱۴ بھائیوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا۔ اس کے والد عبدالصبور پاک آرمی میں رہے تھے اور صوبیدار کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ صوبیدار عبدالصبور کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ گھرانہ کراچی کے علاقے قذافی ٹاؤن لاندھی، ضلع ملیر میں رہنے لگا۔ سہیل محمود نے کراچی سے انٹر میڈیٹ کا امتحان نمایاں نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اسے ایئر فورس میں جانے کا شوق تھا۔ اس نے ایئر فورس میں جی ڈی پائلٹ کے لیے قسمت آزمائی کی لیکن والد کی بیماری کی وجہ سے جوائن نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ تک اس نے کراچی کی ایک فیکٹری میں بطور سپروائزر کام کیا۔ اس دوران اس کا ۱۳ برس کا چھوٹا بھائی ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔

۱۷ نومبر ۲۰۰۱ء کو سہیل محمود بحیثیت کانٹیل ریلوے پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ریلوے پولیس میں اس کا ۱۱ برس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس کے ساتھی اور افسران اس کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔ وہ صوم و صلوة کا پابند تھا۔ ۲۵ اگست ۲۰۰۲ء کو سہیل محمود کی شادی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ۳ بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ ۲۹ مارچ ۲۰۱۱ء کو اس کا تبادلہ ریلوے پولیس لاندھی تھانہ میں ہو گیا۔ اس دوران ۱۷ اگست ۲۰۱۲ء کو اس کی شہادت کا واقعہ رونما ہو گیا۔

آئی جی ریلوے پولیس سید ابن حسین نے شہید کانٹیل سہیل محمود کی جرات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ”ریلوے پولیس کے تمام جوان اور افسران شہید کانٹیل سہیل محمود کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ شہداء اور ان کے پسماندگان کا ہم بہت خیال رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شہید ہونے والے اے ایس آئی پرویز اقبال اور کانٹیل پولیس احمد کو قائد اعظم گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سب میں شہید ہونے والے کانٹیل عمران شہید کے لواحقین کے لیے بھی امداد کا اعلان کیا گیا ہے۔ سہیل محمود کے لیے بھی ہمارے بس میں جو کچھ ہوا ہم کریں گے۔“

شہید سہیل محمود کے ۱۴ بچے ہیں۔ بڑی بیٹی کی خضرہ محمود، ۶ برس کی ہدی محمود، ۵ برس کی ایمان اور ایک برس کا بیٹا سفیان ہے۔ شہید کانٹیل کی اہلیہ کا کہنا ہے ”شہادت والے صبح جب سہیل محمود ڈیوٹی کے لیے گھر سے روانہ ہوئے انہوں نے چاروں بچوں کو خصوصی طور پر پیار کیا اور چھوٹے بیٹے سفیان سے انہیں بہت زیادہ محبت تھی۔ اسے کافی دیر تک بوسے دے کر پیار کرتے رہے۔ دوپہر کے وقت جب وہ خود چل کر گھر نہ آئے اور ان کی ہمارے گھر پہنچی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین گئی۔ بہر حال سہیل محمود کے کارنامے پر ان کی پوری ناز ہے۔ انہوں نے ایک بچے کی جان بچاتے ہوئے شہادت پائی ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے بڑے ہو کر لوگوں کو بتائیں گے کہ وہ شہید باپ کی ہیں۔“

شہید کانٹیل کے اہل خانہ نے بتایا ”سہیل محمود اس بچے کو اٹھا کر پلیٹ فارم کی طرف پھینک دیا لیکن اس دوران وہ خود ٹرین کے پاسیدان سے ٹکرایا اور پھسل کر پلیٹ فارم کے نیچے گر گیا، یوں بچے کو تو کانٹیل سہیل محمود نے بچا لیا اور خود ٹرین کے پہیوں کے نیچے آ گیا، جب ٹرین کے نیچے سے اسے نکالا گیا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اس دوران لوگوں نے پانی منگوایا، جب اسے پانی پلانے لگے تو سہیل محمود نے آنکھیں کھول دیں، اس نے کہا ”میں پانی نہیں پیوں گا، میں روزے سے ہوں، میرا روزہ مت توڑو“ اتنا کہہ کر کانٹیل سہیل محمود ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے لوگوں کے مجمع کے سامنے آخری بار کلمہ طیبہ پڑھا اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

شہید کانٹیل سہیل محمود کی اس قربانی کو دیکھ کر وہاں موجود ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جس بچے کی اس نے جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کی تھی وہ بھی اپنے محسن کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔



کانٹیل سہیل محمود شہید کے اہل خانہ

”جھپٹے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں جو لطف اس روز آیا وہ پھر زندگی بھر نہ آیا۔ وہ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح تھی۔ ۶ ستمبر کو بزدل دشمن نے بین الاقوامی سرحدوں کو عبور کر کے لاہور پر حملہ کر دیا تھا، اب امید تھی کہ وہ فضائی حملے بھی کرے گا۔ ہم اس کے استقبال کے لیے نہ صرف تیار بلکہ بے قرار تھے۔ ۷ ستمبر کی صبح ہم فضا میں بلند ہوئے۔ ایم ایم عالم آگے آگے تھے اور میں اُن کے پیچھے پیچھے۔ میں نے ایک جہاز کو نشانے پر لیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ ایک تو پاکستان ایئر فورس کی تربیت دوسرے جوانی کا نشہ اور تیسرے بھٹی خاندان کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ یہ خاندان دوستی اور دشمنی دونوں نبھانا جانتا ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا پیچھا کروں گا اور برے کے گھر تک پیچھا کروں گا اور اسے گرا کر ہی دم لوں گا مگر ایم ایم عالم جو قیادت کر رہے تھے، انہوں نے مجھے ریڈیو پر پیغام دیا کہ اسے جانے دو اور باقی تین سے ٹھٹ لیتے ہیں۔ میں سکوادرن لیڈر ایم ایم عالم کو کور فرما رہا تھا۔ عالم نے چپتے کی پھرتی کے ساتھ ایک جہاز کو گرا دیا۔ جہاز کا جلتا ہوا ملبہ دیکھ کر ہمیں وہی خوشی ہوئی جو بچوں کو آتش بازی کا دیکھ کر ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایم ایم عالم نے ہندوستانی جہازوں کی پہلی ٹکڑی کے ہی سب جہاز گرا لیے تھے، ایسا نہیں تھا۔ ابھی ہم پہلی ٹکڑی کو گھیر رہے تھے، گرا اور بھاگ رہے تھے کہ اتنے میں عالم کی نظر ایک دوسری ٹکڑی پر پڑی جو سرگودھا پر حملے کے لیے بڑھی آرہی تھی، انہیں دیکھ کر عالم کے جذبات کا عالم ہی کچھ اور ہو گیا۔ اس نے مجھے ریڈیو پر پیغام دیا نو جوان تیار رہو کوئی بچ کر نہ جائے۔ میرے خون کی بھی گردش بہت تیز ہو گئی مگر میں ایئر فورس کی تربیت کے مطابق اپنے لیڈر کی ہدایت کا پابند تھا۔

ایک یادگار پر اس کا نام بھی کندہ کر دیا گیا۔ ادھر بھارتی فوج خوبصورت اور کڑیل جسم کے مالک سپاہی مقبول حسین کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑنے لگی۔ اسے ۴×۴ فٹ کی ایک پنجرانما کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ نہ بیٹھ سکتا تھا نہ لیٹ سکتا تھا۔ دشمن انسان سوز مظالم کے باوجود اس سے کچھ اگلا نہ سکا تھا۔ سپاہی مقبول حسین کوئی راز نہیں بتاتا تو وہ اپنی تسکین کے لیے مقبول حسین کو تشدد کا نشانہ بنا کر کہتے ”کہو پاکستان مردہ باد“ اور سپاہی مقبول حسین اپنی ساری توانائی اٹھتی کر کے نعرہ مارتا ”پاکستان زندہ باد“ جو بھارتی فوجیوں کو جلا کر رکھ دیتا۔ وہ چلانے لگتے اور سپاہی مقبول کو پاگل پاگل کہنا شروع کر دیتے اور کہتے کہ یہ پاکستانی فوجی پاگل اپنی جان کا دشمن ہے اور سپاہی مقبول حسین کہتا:

”ہاں میں پاگل ہوں، ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کے ایک ایک ذرے کے لیے

ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کے کوئے کوئے کے دفاع کے لیے

ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کی عزت و وقار کے لیے

سپاہی مقبول حسین کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ دشمنوں کے ذہنوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگتے۔ آخر انہوں نے اس زبان سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے سپاہی مقبول حسین کی زبان کاٹ دی اور اسے پھر ۴×۴ فٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں ڈال کر مقفل کر دیا۔ سپاہی مقبول حسین نے ۱۹۶۵ء سے ۲۰۰۵ء تک اپنی زندگی کے بہترین ۴۰ سال اس کوٹھڑی میں گزار دیے۔ اب وہ کئی زبان سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ تو نہیں لگا سکتا تھا لیکن اپنے جسم پر لباس کے نام پر پہنے چیتھڑوں کی مدد سے ۴×۴ فٹ کوٹھڑی کی دیوار کے ایک حصے کو صاف کرتا اور اپنے جسم سے رستے ہوئے خون کی مدد سے وہاں پاکستان زندہ باد لکھ دیتا۔ یوں سپاہی مقبول حسین اپنی زندگی کے بہترین دن اپنے وطن کی محبت کے پاگل پن میں گزارتا رہا۔



”سپاہی مقبول حسین نمبر ۳۳۵۱۳۹ ڈیوٹی پر آگیا اور اپنے کمانڈر کے حکم کا منتظر ہے۔“

وائس سیٹ اٹھائے اپنے افسران کے لیے پیغام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں اٹھائی گن سے مقابلہ بھی کر رہا تھا مقابلے میں زخمی ہو گیا۔ سپاہی اسے کر واپس لانے لگے تو سپاہی مقبول حسین نے انکار کر دیا کہ بچائے اس کے کہ میں زخمی حالت میں آپ بوجھ بنوں، میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ کے محفوظ راستہ مہیا کرتا ہوں۔ ساتھیوں کا اصرار دیکھ کر حسین نے ایک چال چلی اور خود کو چھوٹی کھائی میں اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ دوست کے بعد واپس لوٹ گئے تو اس نے ایک مرتبہ پھر دشمن فوجیوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی دوران دشمن کے گولے نے سپاہی مقبول حسین کو شدید زخمی کر دیا۔ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور دشمن نے اسے گرفتار کر لیا۔ بادل چھٹے تو دونوں ملکوں کے درمیان قیدیوں فہرستوں کا تبادلہ ہوا تو بھارت نے کہیں بھی سپاہی حسین کا ذکر نہ کیا۔ اس لیے ہماری فوج نے بھی مقبول حسین کو شہید تصور کر لیا۔ بہادر شہیدوں کی

اس نے ایک نو جوان فوجی کی طرح کمانڈر کو سیلوٹ کیا اور ایک کاغذ پر ٹوٹے ہوئے الفاظ میں لکھا:

”سپاہی مقبول حسین نمبر ۳۳۵۱۳۹ ڈیوٹی پر آگیا اور اپنے کمانڈر کے حکم کا منتظر ہے۔“

کمانڈر کو کئی زبان کے اس لاغر، ناتواں اور بدحواس شخص کے اس دعوے نے چکرا کر رکھ دیا۔ کمانڈر کبھی اس تحریر کو دیکھتا اور کبھی بوڑھے شخص کو جس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک نو جوان فوجی کی طرح بھرپور سیلوٹ کیا تھا۔ کمانڈر کے حکم پر قیدی کے لکھے ہوئے نام اور نمبر کی مدد سے جب فوجی ریکارڈ کی پرانی فائلوں کی گرد جھاڑی گئی اور اس شخص کے رشتے داروں کو ڈھونڈ کر لایا گیا تو ایک دل ہلا دینے والی داستان سامنے آئی اور یہ داستان جاننے کے بعد اب پھولوں، فیتوں اور سارز والے اس لاغر شخص کو سیلوٹ مار رہے تھے۔ اس شخص کا نام سپاہی مقبول حسین تھا۔ ۶۵ء کی جنگ میں سپاہی مقبول حسین کیپٹن شیر کی قیادت میں دشمن کے علاقے میں اسلحہ کا ایک ڈپو تباہ کر کے واپس آ رہا تھا کہ دشمن سے جھڑپ ہو گئی۔ سپاہی مقبول حسین جو اپنی پشت پر

بیرون ممالک
جانے والوں کا المیہ

پُرکشش ملازمت کا وعدہ جب دھوکا نکلے

Fake

ہزاروں امیراد ہر سال لالچی ایجنٹوں کے فریب میں آکر اپنی ساری جمع پونجی لٹا بیٹھتے ہیں

شہزاد حسین علوی

ملائشیا آیا تھا۔ ایجنٹ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اُسے ملائشیا میں الیکٹرونکس کمپنی میں اچھی ملازمت مل جائے گی۔ صفی اللہ کہتا ہے ”مجھے یقین تھا کہ ملائشیا میں خوب کمائی کر کے میں اچھی خاصی رقم اپنے خاندان کو بھجوا سکوں گا۔“ لیکن کوالا لپور پہنچتے ہی اس کے سارے سہانے سنے کرچی کرچی ہو گئے۔

ملائشیا میں اس نے ایک دن بھی الیکٹرونکس کمپنی میں

سالہ صفی اللہ کو الالپور میں بڑی محتاط زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بنگلہ دیشی نوجوان خصوصاً کوشش کرتا ہے کہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے نہ ملے۔ اُسے ڈر ہے کہ پھر کوئی بھی انتظامیہ کو مطلع کر سکتا ہے کہ وہ ملائشیا میں ناجائز طور پر رہ رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ قانونی طریقے سے

دلوں سے وہ سراسیمگی دور ہی نہیں کا فور، ہو گئی جو ۱۹۶۵ء کے غیر متوقع زمینی حملے سے پیدا ہو گئی تھی۔ فضائیہ اور ایم ایم ایم عالم نے چند گھنٹوں میں قوم کو یہ دیا کہ ہم ہیں ناں! آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہمارے شاہین خوش قسمت ہیں کہ انہیں قوم بھی وہ خندقوں میں لیٹ کر اور ہاتھوں سے کانوں کو بند کر کے فضائی جنگ کا سڑکوں اور چھتوں پر کھڑے ہو کر یوں کرتی تھی جیسے نوجوان پتنگوں کے بیچ کا نظارہ کرتے ہیں بات سے بات نکلتی رہی اور اسی دوران میں اہم بات یہ نوٹ کی کہ ایئر کموڈور (ر) امتیاز احمد ستمبر ۱۹۶۵ء کو فلائٹ لیفٹیننٹ سرفراز احمد رفیقی کے چھب جوڑیاں سیکٹر کی فضاؤں میں دشمن کے ۴ جہاز چکے تھے۔ اس محاذ پر کچھ پاکستانی چھیڑ چھاڑ کے میں بھارت نے زمینی ہی نہیں فضائی حملہ بھی کر دیا تھا صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے جہاز گئے دشمن میں کامیاب ہوئے تھے۔

۷ ستمبر کی جو تاریخی کامیابی ایم ایم عالم اور کے حصے میں آئی تھی اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پاکستانی افواج کا مورال بڑھ گیا اور ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ دشمن ہم سے بھی کیوں نہ ہونچ ہماری ہے۔ بات تعداد کی نہیں اور یقین کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... بیان کرنے میں تو بہت وقت لگتا ہے، بس یوں سمجھیے کہ آن کی آن میں عالم فضاؤں میں جھپٹتا رہا اور اس نے چند منٹوں میں دشمن کے چار جنگی جہازوں کو مار گرایا۔ اس طرح ایک ہی پرواز میں پاکستان کے اس شاہین نے دشمن کے ۵ خونخوار پرندوں کو دبوچا، انہیں نشانے پر لیا اور نیست و نابود کر دیا۔“ ۱۹۶۵ء کی یادیں تازہ کر رہے تھے امتیاز احمد بھٹی جو اس وقت فلائٹ لیفٹیننٹ تھے اور ایم ایم عالم سکواڈرن لیڈر تھے۔

امتیاز احمد بھٹی ایئر کموڈور کی حیثیت سے برسوں پہلے پاکستان ایئر فورس سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کہانی اپنی زبانی سنانے پر تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنیں گے۔ شاہینوں کے شہر میں ابھی تک رہائش پذیر ایئر کموڈور (ر) امتیاز احمد بھٹی سے عرض کیا کہ وہ اپنی نہیں پاکستان ایئر فورس کی کہانی سنائیں، اپنی نہیں اپنے ساتھیوں کی داستان عزم و یقین بیان کریں۔ قوم کی طرف سے یہ ایک قرض ہے جو ان کے ذمے واجب الادا ہے۔ جواں جذبوں اور وطن کے لیے سرفروشی کے لازوال واقعات کا قرض انہیں پاکستان کی نسل کو لوٹانا ہے اور انہیں بھی عزم و یقین کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ یہ تیر کارگر ثابت ہوا اور پھر ”وہ کہیں اور سنا کرے کوئی“ والا منظر تھا، ہم ہمہ تن گوش تھے۔

۷ ستمبر ۶۵ء کو پاکستان کی فضاؤں میں دشمن کے جہازوں کے عبرت ناک انجام سے پاکستانی قوم کے

کام نہیں کیا۔ دراصل اُسے ملازمت دینے کا جھانسدے کرایجنٹوں نے لوٹ لیا تھا اور اس فریب میں آنے والا صفی اللہ تنہا نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے بھی کئی ممالک میں ہزار ہا معصوم، بے خبر اور سہانے مستقبل کا خواب دیکھنے والے ہزاروں نوجوان ہر سال اس کا نشانہ بنتے ہیں۔

پاکستان میں بھی اخبارات دیکھیے، تو بیرون ملک ملازمت دینے کا وعدہ کرنے والے کئی اشتہارات نظر آتے ہیں لیکن ان میں بعض سراسر فراڈ ہوتے ہیں۔ ان کمپنیوں کے مالک ایجنٹ دراصل اس بین الاقوامی مافیا کا حصہ ہیں جس میں عالمی کمپنیوں کے لاپچی مالکان اور حریص سرکاری افسر شامل ہیں۔ یہ لوگ ملازمتوں کے پرمٹ اور ویزے جاری کر کے سالانہ اربوں روپے کماتے ہیں۔

پھلتا پھولتا غیر قانونی کاروبار

عبدالعزیز بن اسماعیل کو الالپور کے ایک مشہور وکیل ہیں۔ انھوں نے خصوصاً ملائیشیا میں پھنسنے ایسے غیر قانونی مہاجرین کی مدد کر کے نیک نامی کمائی جو ریکورنگ ایجنٹوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں ”ملائیشیا میں ایسی کمپنیوں کے لیے بھی بیرون ممالک سے افرادی قوت منگوائی جاتی ہے جو وجود ہی نہیں رکھتیں۔ ان کے نہ کارخانے ہوتے ہیں اور نہ ہی باغات وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ ملازم کیوں منگواتی ہیں؟

دھوکے باز ایجنٹوں کے ہاتھوں
لٹنے والے بڑے دکھ و کرب
سے گزرتے ہیں۔ بعض
حساس لوگ تو اس صدمے
سے جان بھی ہار جاتے ہیں

وجہ یہ ہے کہ ان جعلی کمپنیوں کے مالکان بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان، سری لنکا اور دیگر ایشیائی ممالک میں فریبی ایجنٹوں سے ورک پرمٹ (کام کا اجازت نامہ) اور ویزے دینے پر منہ مانگی رقم وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ ملائیشیا ہی نہیں سنگاپور، تائیوان، انڈونیشیا، جنوبی کوریا اور خلیجی ممالک میں بھی جعلی کمپنیاں کھول کر بیرون ممالک سے افرادی قوت کو منگوانا کاروبار بن چکا۔ اس دھندے میں کرپٹ سرکاری افسر، ایجنٹوں و کمپنی مالکان کے شریک کار ہوتے ہیں۔

ملائیشیا میں بالعموم اصول و قانون کی پابندی کرنے والے بستے ہیں، لیکن وہاں بھی حریص افسروں کی کمی نہیں۔ جولائی ۲۰۰۸ء میں انسداد رشوت ستانی کے محکمے نے ڈائریکٹر امیگریشن کو گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ جعلی کمپنیوں اور ایجنٹوں سے بھاری رشوت لے رہا تھا تاکہ ان کا دھندا جاری رہے۔

اس واقعہ سے ملائشین حکومت کی قانون پسندی اور نیک نامی کو دھچکا لگا۔ چنانچہ حکومت نے ”ریلا“ (RELA) نامی ایک پیرامٹری فورس تشکیل دی جو جعلی کمپنیوں، فریبی ایجنٹوں اور غیر قانونی مہاجرین کی تلاش میں چھاپے مارتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مالکان کمپنی اور ایجنٹ مشکل ہی سے قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور پکڑے بھی جائیں تو اچھے وکیل کر کے رہا ہو جاتے ہیں۔ مگر پُرکشش ملازمت کی چاہ میں آنے والے نوجوان اور غیر قانونی مہاجرین در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوتے اور بے انتہا ذہنی و جسمانی دباؤ برداشت کرتے ہیں۔

اب صفی اللہ ہی کو دیکھیے۔ کو الالپور میں ملازمت دلوانے کے لیے ایجنٹ نے اس سے ۴۰۰۰ روڈالر (۳۳ لاکھ ۶۴ ہزار روپے) طلب کیے۔ صفی اللہ نے دوستوں سے قرض لیا اور بیوی کا زیور بیچ ڈالا۔ ایجنٹ کا کہنا تھا کہ مدت ملازمت ۲ سال ہوگی جبکہ وہ ماہانہ ۴۰۰ روڈالر (۳۶ ہزار ۴۳ روپے) کماسکے گا۔

لیکن اسے الیکٹرونک کمپنی میں ملازمت ملی اور نہ ہی

ڈھاکہ میں قائم ایک تربیتی مرکز جہاں
بیرون ممالک میں اچھی ملازمتوں کے
متلاشی نوجوان مختلف ہنر سیکھتے ہیں

دنیا میں اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی
اور عمدہ و آرام دہ جگہ نہیں۔ لیکن کوئی
نوجوان باہر جانا چاہتا ہے، تو وہ
ایجنٹ نما ٹھگوں سے خبردار رہے

حسب دل خواہ تنخواہ۔ وہ بتاتا ہے ”مجھ سے متفرق کمپنیوں
میں کام کرایا گیا۔ کبھی صابن اور کبھی فرنیچر کے کارخانے
میں۔ مجھے ہر ماہ ۱۵۰ روڈالر (۱۳۶۵۰ روپے) ملتے لیکن
۵۰ روڈالر سرکاری ٹیکس میں کٹ جاتے۔ لہذا ۱۰۰ روڈالر میں
اپنے خرچے ہی بمشکل پورے ہوتے، اہل خانہ کو رقم بھجوانا
تو دور کی بات ہے۔

ظلم کی ریت

۲ سال قبل صفی اللہ اور ۲۹ دیگر ساتھی پریشان اور
بد حال ہو کر ایک انہونی کر گزرے۔ وہ کمپنی چھوڑ کر فرار
ہو گئے۔ یہ ایک دلیرانہ فیصلہ تھا کیونکہ ملائیشیا پہنچتے ہی کمپنی
نے بھی کے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اب ان
کا سرکاری ایجنسی، ریلا کے کارندوں سے ٹاکرا ہوتا، تو
گرفتاری و قیدی بنی تھی۔ مگر وہ اسی لیے فرار ہوئے کہ مختلف
کمپنیوں میں کام کر کے رقم بچائیں اور اپنے اپنے
خاندانوں کو بھیج سکیں۔ ان بنگلہ دیشی، بھارتی اور پاکستانی
نوجوانوں نے پھر غلیظ ملازمتیں بھی کیں اور پیسے بچانے کی
خاطر سڑکوں و پارکوں میں بھی سوئے۔

انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والے وکیل اور
ملائشین پارلیمنٹ کے رکن، چارلس سانتیاگو کا کہنا ہے
”کارکنوں کے پاسپورٹ اپنے قبضے میں کر لینا
ظلم ہے۔ یوں انھیں موقع ملتا ہے کہ کارکنوں کا
استحصال کر سکیں۔ کارکن شکایت کرتے ہیں کہ مالکان ان

سے ۱۴ تا ۱۷ گھنٹے کام کراتے ہیں۔ میرے نزدیک
تو بیرون ممالک سے افرادی قوت منگوانے کا سارا انتظام
کرپٹ اور ظالمانہ ہے۔

منڈلاتا خطرہ

ایک دن اس کمپنی میں سرکاری عملے نے چھاپہ مارا
جہاں صفی اللہ کام کرتا تھا۔ وہ بروقت پچھلے دروازے سے
فرار ہو گیا ورنہ جیل اس کا مقدر بنتی۔ گرفت میں آنے سے
بال بال بچ کر وہ کوالالمپور میں بنگلہ دیش کے سفارت
خانے جا پہنچا۔ وہاں انکشاف ہوا کہ سیکڑوں بنگلہ دیشی
نوجوان ریکروٹمنٹ ایجنٹوں اور کمپنی مالکان کی حرص کا نشانہ
بن کر ابتر حال میں ہیں۔ ہر ایک کے پاس ظلم و ستم کی ایک
نئی اور لرزہ خیز داستان سنانے کو موجود تھی۔

دن میں پریشان حال نوجوانوں کی قطار لگ جاتی
تاکہ وہ سفارت خانے کے کسی افسر کو اپنی حالت زار بتا کر
مدد لے سکیں لیکن سفارت خانہ کیونکر مدد کرتا کہ ان کے
پاس کاغذات ہی نہیں تھے۔ بیشتر کے پاسپورٹ و
کاغذات کمپنیوں نے قبضے میں لے رکھے تھے۔ چنانچہ
بنگلہ دیشی چاہتے ہوئے بھی ملائیشیا سے نہیں جاسکتے تھے۔

سنگاپور میں پھنسا نوجوان

ادھر سنگاپور میں ۳۸ سالہ اسد مدبر ایک عجیب
مصیبت میں گرفتار ہے۔ وہ بھی اس جزیرے میں پھنسا ہوا



دل گرفتہ اسد اپنا خصوصی پاس دکھاتے ہوئے
جس پر بیسیوں مہریں لگی ہوئی ہیں



ملائیشیا میں بنگلہ دیشی سفارت خانے
کے زیر اہتمام متاثرہ نوجوانوں کے لیے
ایسی کئی پناہ گاہیں قائم ہیں



ہوا۔ اُسے پھر سانس کا رشتہ قائم رکھنے کی خاطر مختلف
معمولی ملازمتیں بھی کرنی پڑیں۔ آخر دسمبر ۲۰۱۰ء میں اسے
واپس وطن جانے کی اجازت ملی۔ یوں ناکام و نامراد ہو کر
واپس چلا آیا۔

ملازمتیں جن کا کوئی وجود نہیں

سنگاپور میں قانون کی رو سے کمپنی مالکان غیر ملکی
ملازمین کو بتائے بغیر ملازمت کا معاہدہ ختم کر سکتے ہیں۔
حریص اور مکار لوگوں نے پھر اس غیر انسانی قانون سے
فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے جعلی کمپنیاں بنائیں، اپنے ایجنٹوں
کے ذریعے ہزار ہا غیر ملکیوں کو سنگاپور بلایا، ایجنٹوں سے
کمیشن وصول کیا اور پھر رفو چکر ہو گئے۔ یوں غیر ملکی
ملازمین خلا میں ٹامک ٹائیاں مارتے رہ گئے۔

ایک سنگاپوری وکیل، جان گی بتاتا ہے ”کمپنیاں
ایسی ملازمتوں کے لیے بیرون ممالک سے لوگ منگوا
رہی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں۔ یہ مسئلہ طویل عرصے سے
چلا آرہا ہے۔“

ہے، تاہم وجہ کاغذات نہ ہونا نہیں۔ دراصل اس کا تنخواہ
کے مسئلے پر کمپنی سے اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کمپنی
کے خلاف متعلقہ محکمے میں شکایت درج کرا دی۔ جب
معاملے کی چھان بین ہوئی، تو انکشاف ہوا کہ کمپنی کا مالک
غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ لہذا کمپنی سیل کر دی
گئی۔ تاہم اسد مدبر کو سنگاپور حکومت نے روک لیا تاکہ وہ
کمپنی کے خلاف گواہی دے سکے۔

صفی اللہ کے مانند اسد بھی ایجنٹ کو لاکھوں روپے
دے کر سنگاپور آیا تھا۔ ایجنٹ نے اسے بتایا تھا کہ وہ
تعمیراتی کمپنی میں کام کرے گا لیکن یہ وعدہ جھوٹا ثابت

کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اگتے

حاید چودھری

محاورہ کچھ یوں تھا ”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اگ سکتے۔“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا ”ہم نے ترقی سے پہلے ترقی کے بارے میں ریسرچ کی تھی۔ ہم نے اندازہ لگایا تھا آپ جب تک ہاتھی کا بچہ نہیں پالتے آپ اس وقت تک ہاتھی دانت حاصل نہیں کرتے چنانچہ ہم نے انفراسٹرکچر تیار کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے پورے ملک کو سڑکوں کے ساتھ ملایا، ریلوے لائنیں بچھائیں، ہوائی اڈے اور بندرگاہیں بنائیں، تعلیم اور صحت عام کی، دنیا کی سب سے بڑی ورک فورس بنائی اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھی کے منہ میں دانت نکل آئے اور پوری دنیا ہم سے محبت کرنے لگی۔“ مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ یہ سچ ہے ترقی کا انفراسٹرکچر ضروری ہوتا ہے اور جس ملک کے پاس

اپنے محاوروں اور کہاوتوں میں بھی دنیا سے بہت آگے ہے۔ چینی محاورے اپنے اندر معانی، دانش و خیالات کی اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بیسیوں کتابیں مل کر کسی ایک چینی محاورے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ میں نے بچپن میں جو پہلا چینی محاورہ پڑھا تھا اس نے آنے والے دنوں میں میری زندگی کا سارا مسائل تبدیل کر دیا۔ میں زندگی میں جب بھی تلخ ہونے لگتا ہوں تو میں یہ محاورہ نکال کر پڑھتا اور فوراً ریلیکس ہو جاتا ہوں۔ وہ محاورہ تھا ”جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دکان نہیں کھلونی چاہیے۔“ دوسرا تاریخی محاورہ اس دورے کے دوران ملا۔ میں نے اپنے ایک میزبان سے چین کی ترقی کی وجہ پوچھی، اس نے مسکرا کر ایک چینی محاورہ سنایا۔ وہ

چین

پانچ لاکھ روپے) دیے تھے تاکہ وہ اُسے سنگاپور میں اچھی ملازمت دلوا سکے۔ لیکن سنگاپور پہنچ کر جلد ہی اُسے یہ جان لیوا احساس ہو گیا کہ کمپنی میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس کا معاہدہ ملازمت ۴ ماہ بعد انجام کو پہنچا اور اُسے خوار ہو کر واپس آنا پڑا۔

عبدالوہاب کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ والدین اور بیوی بچوں کو کیا بتائے گا۔ لیکن اس کا اُترا چہرہ اور حالت زار دیکھ کر اہل خانہ سب کچھ سمجھ گئے۔ واپس آ کر عبدالوہاب کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ وہ راتوں کو جاگنے لگا اور اُسے دل کی تکلیف چٹ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ۲۶ دن بعد وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سنگاپور جانے سے قبل عبدالوہاب ایک اچھی سرکاری ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا گھرانا اچھا کھاتا پیتا تھا لیکن عبدالوہاب کی موت کے بعد اس کی بیوی، نسرین کو ایک دفتر میں کلرکی کرنا پڑی۔ اب وہ اپنا اور اپنے ۲ بچوں کا پیٹ بمشکل پال رہی ہے۔

خاتمہ کلام

پاکستان میں بھی ایسے ایجنٹوں کی کمی نہیں جو غیر ملکی جعلی کمپنیوں کے کارندے بن کر سادہ لوح پاکستانیوں کو لوٹتے ہیں۔ چنانچہ اول تو دنیا میں اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی اور عمدہ و آرام دہ جگہ نہیں۔ لیکن کوئی نوجوان باہر جا چاہتا ہے، تو وہ ٹھگ قسم کے ایجنٹوں سے خبردار رہے، ورنہ لاکھوں روپے سے محروم ہو سکتا ہے۔



عبدالوہاب کی بدقسمت بیوی اور ۲ ننھے بچے

سنگاپور کے محکمہ افرادی قوت کا کہنا ہے کہ وہ جعلی کمپنیوں کی روک تھام کے لیے کڑے قوانین بنا رہا ہے۔ اب فراڈیے مالکان کو جیل جانا پڑے گا لیکن دھوکے بازی کا شکار غیر ملکیوں کے دکھ درد کا حکومت کوئی مداوا نہیں کر سکی۔ محکمہ افرادی قوت کا کہنا ہے کہ غیر ملکی بیرون ممالک میں ایجنٹوں کو رقم دیتے ہیں، لہذا وہ اس کی رسائی سے باہر ہیں۔ دھوکے باز ایجنٹوں کے ہاتھوں لٹنے

والے بڑے دکھ و کرب سے گزرتے ہیں۔ بعض حساس لوگ تو اس صدمے سے جان بھی ہار جاتے ہیں۔

عبدالوہاب کی داستانِ الم

جنوری ۲۰۱۱ء میں ۳۸ سالہ عبدالوہاب نے سنگاپور سے جہاز پکڑا اور واپس بنگلہ دیش چلا آیا۔ اس کی جیب میں ۳۳۰ روڈالر (۳۸ ہزار روپے) موجود تھے۔ ۴ ماہ سنگاپور میں گزار کر وہ اتنی ہی رقم بچا سکا تھا۔ ڈھاکا میں اس نے ایجنٹ کو ۶ ہزار روڈالر (ساڑھے

۲۰۰۸ء میں ایشیا میں ترسیل زر

(بحوالہ ورلڈ بینک۔ بلین ڈالر میں)

بھارت	51.6%
چین	48.5%
فلپائن	18.6%
بنگلہ دیش	9.0%
پاکستان	7.0%
انڈونیشیا	6.8%

انفراسٹرکچر نہیں ہوتا وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا اور چین اس کی سب سے بڑی اور تازہ ترین مثال ہے۔ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر چین میں ہے۔

شنگھائی چین کا دوسرا بڑا اور چین کا معاشی اور صنعتی دارالحکومت ہے۔ ہم لوگ ۲۹ مارچ کو شنگھائی پہنچے۔ شنگھائی کی آبادی اس وقت ایک کروڑ ۷۴ لاکھ ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت، جاندار اور زندہ شہر ہے۔ آپ جو بھی اس شہر میں داخل ہوتے ہیں آپ کو زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ۳۰ جولائی کو شنگھائی کے میئر شین ہونگ گوانگ نے ہمارے وفد کو لُنج دیا تھا۔ اس لُنج کے دوران مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری امتیاز احمد رانجھا نے ان سے بڑا دلچسپ سوال پوچھا۔ انھوں نے پوچھا ”شنگھائی میں کتنی غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں؟“ میئر کے جواب نے پورے وفد کو حیران کر دیا۔ انھوں نے بتایا ”اس وقت شنگھائی میں ۳۰ ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔“

میئر کا یہ جواب چین کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کا ثبوت تھا۔ شنگھائی حقیقتاً ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے۔ آپ اس کے کمرشل والیوم کا اندازہ اس میں کام کرنے والی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے لگا سکتے ہیں۔ اس وقت شنگھائی میں ۴۶ ہزار ۹ سو اشتہاری کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ پورے ملک میں ۷۹ ہزار ۴ سو اشتہاری کمپنیاں ہیں۔ ان کمپنیوں میں ۳۲۹ بین الاقوامی کمپنیاں ہیں۔ ان ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے آپ شنگھائی اور چین کے تجارتی سائز کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت ہے۔ چین کا جی ڈی پی ۸ ٹریلیون اور ۱۵۸ بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے مالیاتی ذخائر ۸۱۹ بلین ڈالر ہیں۔ چین کا گروتھ ریٹ ۹ اعشاریہ ۵ فیصد ہے۔ یہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ گروتھ ریٹ ہے۔ چین کی ذاتی بچتوں کا سائز ایک ٹریلیون اور ۷۰ بلین ڈالر ہے۔ اس وقت پوری دنیا چینی مصنوعات استعمال کر رہی ہے۔ یورپ چینی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ وہ ہر سال چین سے ۲۱۸ بلین

ڈالر کی اشیاء خریدتا ہے۔ امریکا دوسرا بڑا خریدار ہے۔ چین سے سالانہ ۲۱۲ بلین ڈالر کی اشیاء لیتا ہے جبکہ جاپان اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے وہ ہر سال چین سے ۱۸۵ بلین ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے۔ ان ممالک کے بعد یہ فہرست طویل ہوتی چلی جاتا ہے۔ عالمی ماہرین کا خیال ہے کہ آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں وہاں ”میڈان چائنا“ ملے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے وہ چین جو کل تک دنیا کا پسماندہ ترین ملک تھا اس نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا۔ چین نے یہ مقام حقیقتاً محنت اور انفراسٹرکچر سے حاصل کیا۔ اس نے ہاتھی دانت کے حصول کے لیے ہاتھی پائے شروع کیے۔ اس وقت چین میں ۴۷۲ ہوائی اڈے تھے ان میں سے ۷۵ فیصد ہوائی اڈوں پر بین الاقوامی پروازیں اترتی ہیں۔ شنگھائی نے اس سال دنیا کی سب سے بڑی کارگو پورٹ ہونے کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس پورٹ سے پچھلے سال ۴۴۳ بلین ٹن سامان دنیا کے بازاروں میں گیا۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑی ورک فورس چین میں ہے۔ چین میں ۴۸ کروڑ ہنرمند ہیں۔ یہ تمام ہنرمند اپنے اپنے کاموں کے ماہر ہیں۔ چین میں انفراسٹرکچر کو وسعت دینے کا کام ابھی تک جاری ہے۔ چین پچانگ دریا پر ۳ بڑے ڈیم بنا رہا ہے ان ڈیموں کا ۲۲ بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔ یہ ڈیم چین کو ۱۸ ہزار ۲ سو میکا واٹ بجلی دیں گے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ہائیڈل پاور پلانٹ ہوگا۔ چین ۵۹ بلین ڈالر کی مالیت سے ۱۳۰۰ کلومیٹر لمبی نہریں بھی کھود رہا ہے۔ چین ۱۸ بلین ڈالر سے ۴ ہزار کلومیٹر لمبی گیس پائپ بھی بچھا رہا ہے۔ چین ۳۳ بلین ڈالر سے ۴۴۸۰ کلومیٹر لمبے ۲۰ کلومیٹر چوڑے جنگلات لگا رہا ہے۔ چینی اس منصوبہ کو ”گریٹ گرین وال پراجیکٹ“ کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگلی ذخیرہ ہوگا۔ چینیوں کا خیال ہے جب یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو چاند سے صرف ۲ چیزیں نظر آئیں گی۔ ایک گریٹ وال اور دوسرا گریٹ گرین وال۔

چینی لوگ کہتے ہیں

اگر ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو مکئی بوؤ
اگر ۱۰ سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو درخت لگاؤ
لیکن اگر تم صدیوں کے لیے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو اور انھیں تعلیم دو

شان ڈیپ سی پورٹ“ تھی۔ یہ منصوبہ ۱۰ برس پہلے شروع ہوا۔ شنگھائی کی حکومت نے گہرے پانیوں کی بندرگاہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ان لوگوں نے سمندر کے اندر ۳۲ کلومیٹر لمبا پل اور اس پل پر ۲ روہ سڑکیں بنا دیں۔ یہ سڑک پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد منصوبہ ہے۔ آپ جب اس سڑک پر سفر کرتے ہیں تو آپ خود کو گہرے سمندر میں پاتے ہیں۔ اس سڑک کے آخر میں ۳۰ گودیوں کی ایک نئی بندرگاہ بنائی جا رہی ہے، جس سے سالانہ ۸ ہزار ۵ سو کنٹینر لائے اور لے جائے جائیں گے۔ ہم لوگ جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں اپنا گواہر بہت یاد آیا۔ مسلم لیگ



کامیابی کیا صرف پیسا کمانا ہی ہے؟

قیصر جاوید

زندگی کس طرح عمل کرتی ہے اور یہ کہ کون کون سی چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ برسوں حقیقت سے بے خبر رہنے کے بعد میں نے جان لیا تھا کہ زندگی میں کامیاب ہونے کا مطلب کیا ہے اور یہ کہ کامیابی کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ اس دریافت کے ساتھ ہی دو ایسی چیزیں مجھے حاصل ہوئیں جن کا ہمیشہ آرزو مند رہا تھا۔

اندرونی سکون کا احساس اور اپنی قدرو قیمت کا احساس۔ سب سے بڑھ کر میں نے زندگی سے ہمیشہ سے بڑھ کر لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ وہ عظیم دریافت کون سی تھی؟ کیا وہ کامیاب ہونے کا کوئی فارمولا تھا؟ مجھے اس بات کا یقین

کامیابی کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں ہے وہ بتاتے ہیں جس کی اہلیت دے کر پیدا کیا گیا ہے

زندگی کی سب سے اہم دریافت

اس وقت میری عمر ۳۹ سال تھی جب مجھے پہلی بار یہ سمجھ آئی کہ کامیاب ہونے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کیا کیا تھا؟ کیا میں کسی فارچون ۵۰۰ (Fortune 500) کی کمپنی کا سی ای او (CEO) بن گیا تھا؟ کیا میں پہلی دنیا کی بڑی کمپنی کی مینیجنگ ڈائریکٹر بن گیا تھا؟ کیا میری لائبریری ٹیلی ویژن شو "امیروں اور مشہور لوگوں کا لائف سٹائل" میں مدعو کیا گیا تھا؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک سادہ لیکن گہری دریافت کی تھی۔ میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ

پھول کاشت کیے، انھیں جوان کیا اور آج پوری قوم چین رہی ہے۔ محاوروں سے یاد آیا، پنجاب کے کیشن اور وکس کے صوبائی وزیر رانا ظہیر الدین ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ جو بھی شخص ان کی کمپنی میں بیٹھ جاتا ہے ان کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوران سفر رانا صاحب نے والد مرحوم کے وہ قول سنائے۔ یہ قول بھی سونے کے تولنے کے قابل ہیں۔ رانا صاحب نے بتایا۔ ان کے کہنا کرتے تھے کہ دنیا میں کچھ لوگ دولت مند ہوتے ہیں اور کچھ امیر۔ ہم ان سے پوچھا کرتے تھے ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے تو وہ کہتے تھے کہ دولت مند وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو جبکہ امیر وہ ہوتا ہے جو اس دولت کو مثبت کاموں میں خرچ کرے۔ لہذا اللہ تعالیٰ دولت مند کے بجائے امیر ہونے کی دعا کیا کرو۔ وہ فرم کرتے تھے انسان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کے دوستوں کو ہمیشہ آس رہے اور دشمنوں کو خوف۔ میں صاحب کے والد کے اقوال سے متاثر ہوا۔ چینی لوگ کرتے ہیں "اگر ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے تو مکی بوؤ، اگر ۱۰ سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کے لیے منصوبہ بندی چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو، انھیں تعلیم دو۔" صاحب کے والد کے اقوال تیسری کینگری میں فال کرتے ہیں لہذا میں نے پاکستان پہنچتے ہی یہ دونوں فقرے ڈائری میں لکھ لیے۔

"اپنا فرض بجالاتے رہو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔" کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ قائم کے لیے بنا ہے۔ ہمارے اقدامات اور کارنامے ثابت کر رہے ہیں کہ ہم سچائی پر ہیں اور میں آپ یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی ہمدردیاں، بالخصوص ممالک کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بھی اس کے ممنون ہیں جس نے امداد، تعاون اور دوستی کا ہماری طرف بڑھایا۔"

کے مزدور ونگ کے صدر فقیر حسین بخاری نے اس موقع پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا۔ انھوں نے کہا "ایک یہ لوگ ہیں جو سمندر کو خشک کر کے بندرگاہ بنا رہے ہیں اور ایک ہم لوگ جو قدرت کی دی ہوئی بندرگاہیں تک استعمال نہیں کر رہے۔" مجھے محسوس ہوا اس معاملے میں چین ہم سے بہت آگے ہے۔ شاید یہ چین کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام سرمایہ کار اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ چین کا رخ کر رہے ہیں۔ صرف ۲۰۰۵ء میں انٹرنیشنل سرمایہ کاروں نے چین میں ۶۰ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ چین کی یہ فتوحات حقیقتاً اس کے ویژن اور اس کے انفراسٹرکچر کا نتیجہ ہے۔

بات ہو رہی تھی چینی محاوروں اور کہاوتوں کی تو مجھے چین کی ایک اور کہاوت یاد آگئی۔ چین میں کہا جاتا ہے "انسان کو پھول اس وقت توڑنے چاہئیں جس وقت وہ توڑے جانے کے قابل ہوں۔" چین نے اپنے عمل سے یہ محاورہ سچ ثابت کر دیا۔ اس معیشت اور اقتصادیات کے

میزبانوں نے ہمیں حیران کرنے کے لیے لفٹ کے فرش پر ایک سکہ کھڑا کر دیا ہم ۸۸ روپیہ منزل سے نیچے آئے لیکن یہ سکہ اسی طرح کھڑا رہا۔ آپ اس بات سے لفٹ کے توازن کا اندازہ لگا لیجیے

کامیاب لوگ سیکھنے کی مضبوط خواہش کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ زندگی، دنیا اور خود اپنے بارے میں جاننے کے شدید آرزو مند ہوتے ہیں۔ وہ جاننے اور سیکھنے کے عمل کو ایک فریضہ نہیں بلکہ تفریح سمجھتے ہیں۔ وہ نئی باتیں سیکھ کر اور اپنے آپ کو بہتر بنا کر مسلسل اپنی زندگیوں کو باثروت بناتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دریافت کرتے ہیں، ہمیشہ ترقی کرتے ہیں۔

سیکھنے میں، جاننے میں کبھی دیر نہیں ہوتی ہوتی کے ذہن ترین لوگ وہ ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہونا ہے۔

کامیابی اور پیسا

ایسا لگتا ہے کہ ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ پیسا اچھا۔ جب کسی شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کامیاب شخص ہے تو اس سے عموماً یہی مراد ہوتی ہے کہ وہ دولت مند ہے۔ چنانچہ دولت کو لازماً اچھا ہونا چاہیے۔ دولت مند لوگ قابل قدر مقاصد کے لیے ہر سال روپے خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ دولت اچھی ہے۔ ہم نے یہ نہیں سنا کہ پیسا تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ تناظر میں پیسا برا ہے۔ جو لوگ امیر نہیں ہیں، لوگوں پر تنقید کرتے ہیں، جو امیر ہیں۔ اس کے وہ خود بھی امیر ہو جانا بے حد پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ وہی ہے کہ پیسا اچھا ہے یا برا؟

پیسا نہ اچھا ہے، نہ برا۔ تاہم چونکہ ہم ایک معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں اکثر ایسا نہیں ہے۔ پیسے کو کامیابی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے چند خیالی باتوں کی وضاحت جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے درست فہم حاصل جائے۔ میں پیسے کے حوالے سے ۲۲ نکات چاہوں گا۔

۱۔ پیسا بُرا نہیں ہے

کیا یہ بائبل میں لکھا ہے کہ پیسا تمام برائیوں کی جڑ ہے؟ نہیں۔ بائبل میں تو یہ لکھا ہے کہ پیسے کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ دونوں بیانات میں واضح فرق ہے۔ پیسے میں کوئی برائی نہیں ہے، خواہ پیسا بہت زیادہ مقدار میں کیوں نہ ہو۔ کلیدی بات یہ ہے کہ ہم اسے کس طرح لگاتے اور اس سے کیا کرتے ہیں۔ اگر پیسا دیانت داری کا لکھنا اور اچھی طرح خرچ کیا جائے تو یہ اچھائی کا پرچم بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پیسا ایک خوشی خرید سکتا ہے؟ جو شخص کہتا ہے کہ پیسا خوشی نہیں خرید سکتا، اس کے پاس زیادہ پیسا نہیں ہوگا۔ درحقیقت پیسا غربت کی نسبت زیادہ خوشی خرید سکتا ہے۔ میرا خیال ہے پرل کلنٹن نے اس بات کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ ”بہنی! میں غریب رہا ہوں اور میں امیر بھی رہا ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ امیر ہونا بہتر ہے۔“ شاید پیسا بیشتر معاملات میں بہتر ہوتا ہے۔ امیر ہونا نہ تو غیر قانونی ہے، اور نہ غیر اخلاقی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ پیسا سب کچھ نہیں ہے۔

۲۔ کامیابی کے لیے صرف پیسا ہی ضروری نہیں ہے

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں، اس میں ہمیشہ سے زیادہ امیر لوگ موجود ہیں۔ ان امیر لوگوں میں بے شمار کروڑ پتی ہیں اور بہت سے کروڑ پتی لوگ ارب پتی ہیں۔ مورخین نے بیسویں صدی کی نوویں دہائی کو ”امیر دہائی“ قرار دیا تھا۔ اس دور میں دولت کے حصول کے لیے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ”لاچ اچھا ہے۔“ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس شخص نے یہ بیان دیا تھا، چند ماہ بعد وہ کسی جرم میں عدالت کے کٹہرے میں تھا۔ ایسا تب ہوتا ہے جب ہم پیسے کے حوالے سے غلط فہم نظر کو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح زندگی مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جاتی ہے۔

تاہم صرف وہ لوگ جیل نہیں جاتے جو روپے کی ہوس میں اپنے آپ کو گنوا دیتے ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک کتاب پڑھی ہے، جس کا موضوع ایسے لوگ ہیں جو بظاہر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پاس پیسا ہے، جائیداد، طاقت اور سماجی مقام و مرتبہ ہے، تاہم وہ لوگ مایوس ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ کامیاب لوگ ہیں تو مایوس کیوں ہیں؟ وہ خوش کیوں نہیں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوش ہونا اور کامیاب ہونا، دو یکساں باتیں نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس بظاہر سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ بنیادی اہمیت کی چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر چکے ہوتے ہیں۔ وہ نشئی بن گئے ہیں۔ وہ پیسے اور اس سے حاصل ہونیوالی چیزوں کے غلام بن چکے ہیں۔ اس دوران انھوں نے نہ صرف دوسروں کو نقصان پہنچایا بلکہ اپنی زندگیاں بھی تباہ کر لی ہیں۔ کامیابی پیسا کمانے سے سوا کچھ اور بھی ہے۔ پیسے کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ پیسے کے علاوہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو زندگی کو زیادہ دلچسپ، زیادہ بامعنی اور زیادہ شمر آور بنا دیتی ہیں۔

کامیاب ہونے کے کیا معانی ہیں؟

عظیم فلسفی تھامس کارلائل نے ایک بار لکھا تھا، ”آؤ ہم سب وہ بنیں، جس کی اہلیت کے ساتھ ہمیں تخلیق کیا گیا ہے۔“ میں کامیابی کی اس سے بہتر تعریف نہیں سوچ سکتا۔ زندگی ہمیں ہر روز چیلنج دیتی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر استعمال کریں۔ ہم تب کامیاب ہوتے ہیں جب اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو اعلیٰ ترین سطح پر استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ہم تب کامیاب ہوتے ہیں جب اپنے پاس موجود بہترین چیز دیتے ہیں۔

اس باب کے آغاز میں درج قول میں کہا گیا ہے کہ کامیابی ”حاصل کرنے“ میں نہیں بلکہ ”کام کرنے“ میں ہے۔ میں اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ زندگی

ہے کہ ہاں وہ کامیاب ہونے کا فارمولا ہی تھا۔ تاہم وہ تمہیں کسی عمدہ اور صاف پیکٹ میں بند نہیں ملے گا۔ فی وی پر اس کے اشتہار بھی نہیں دکھائے جاتے۔ یہ کوئی نیا فارمولا نہیں ہے۔ یہ کوئی راز، کوئی بھید نہیں ہے۔ یہ کوئی جادو بھی نہیں ہے اس لیے یہ فروخت نہیں ہوتا۔ یہ نہایت پرانا، نہایت سادہ اور نہایت معصوم لیکن یہ کارگر ہے۔

میں کئی برس تک فلسفہ، تاریخ اور نفسیات کے مطالعے کے بعد اس حقیقت کو سمجھا ہوں کہ زندگی اور کامیابی کو چند ایسے اصولوں میں سمویا جاسکتا ہے جو کہ ہزاروں سال سے موجود ہیں۔ ”اچھی زندگی“ کی جستجو میں کئی سال مختلف راستوں پر گامزن رہنے کے بعد میں وہیں پہنچ گیا، جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ میں ان تک پہنچا، جنہیں اب میں پرانے سچ، پرانی صداقتیں کہتا ہوں۔ جیسا کہ ایڈورڈ ایلچی اپنے ڈرامے ”دی زو سٹوری“ (The Zoo Story) میں کہتا ہے، ”بعض اوقات تھوڑا سا درست فاصلہ طے کرنے کے لیے اصل راستے سے کافی دور جانا پڑتا ہے۔“

میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ اگر تم ان پرانے اصولوں پر مستقل عمل کرو گے تو تم نہ صرف کامیابی کے حقیقی معانی سے واقف ہو جاؤ گے بلکہ کامیابی حاصل بھی کر لو گے۔ ایک سویڈش ضرب المثل ہے کہ ہم بوڑھے جلد ہوتے ہیں جب کہ ذہن دیر سے ہوتے ہیں۔ شاید ایسا نہ ہو۔ میری کتاب تمہیں میری نسبت جلد ذہن ہونے میں مدد دے گی۔ اگر تم عمر میں بڑے ہو گے۔ تب بھی

سب سے فائدہ مند نصیحت

”اگر مجھے کہا جائے کہ پوری نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ فائدہ بخش واحد نصیحت کروں تو وہ یہ ہوگی ”مشکلات کو زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھو اور جب مشکلات سامنے آئیں تو اپنا سر بلند رکھتے ہوئے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھو اور کہو کہ میں تم سے بڑا ثابت ہو کر دکھاؤں گا۔ تم مجھے شکست نہیں دے سکتی۔“

(این لینڈرز)

میں نے اپنے کلاس روم میں یہ اقتباس کے ساتھ درج ذیل اقتباس چسپاں کیا ہوا ہے ”خوشخبری یہ ہے کہ تمہاری عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو اور تمہارے حالات جیسے بھی ہوں، تمہاری زندگی کا بہترین موسم آنے والا ہے، بشرطیکہ تم ایسا چاہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اپنی ۹۹ فیصد صلاحیتیں استعمال ہی نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے انہیں دریافت ہی نہیں کیا۔ یہ صرف خوشخبری نہیں بلکہ قابل یقین خبر ہے۔“ (ٹم ہینسل)

پیارا دوست ہے۔ جب ہم ۲۰ سال پہلے نفسیات پڑھایا کرتے تھے تو ہم اپنے شاگردوں کو مستقلاً تلقین کیا کرتے تھے کہ اپنے اندر جھانکو..... اپنے اندر موجود خرابیاں تلاش کرو اور یہ جانو کہ تمہارے اندر کتنی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ہم انہیں زیادہ عمل کرنیکی تلقین کرتے تھے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ ۱۸، ۱۸، ۱۸ سال کے تھے لیکن انہوں نے اس سے پہلے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔

ایک سال بعد میں نے یونیورسٹی آف سان فرانسسکو میں اپنے شاگردوں کو یہی باتیں کہنا شروع کیں۔ ان میں سے اکثر اپنی عمروں کی تیسری یا چوتھی دہائیوں میں تھے۔ بعضوں کی عمریں اس سے بھی زیادہ تھیں۔ ذرا اندازہ تو لگائیے کیا ہوا ہوگا؟ انہیں بھی کسی نے ان کی اپنی صلاحیتوں کے حوالے سے کبھی نہیں پڑھایا تھا۔ ایک شام کا ذکر ہے اس موضوع پر زوردار بحث کے انجام پذیر ہونے کے بعد ایک ۴۷ سالہ خاتون نے کہا ”آپ درست کہتے ہیں، ہمیں اپنی صلاحیتوں کا پتا نہیں ہے۔“ ہم نو جوان ہیں یا بوڑھے، خواہ ہم انڈر میٹرک ہیں یا پی ایچ ڈی، ہم ہمیشہ صلاحیتوں کے متعلق جان سکتے اور کامیاب شخص بن سکتے ہیں۔ اگر ہم اندر دیکھیں گے تو ہم حقیقی کامیابی کے درکار تمام ضروری وسائل پالیں گے کیونکہ جان لیجیے ”ہم میں جو کچھ بننے کی صلاحیت ہے، وہ بننا زندگی کا واحد مقصد ہے۔“ (این لینڈرز) (ہال اربن کی کتاب سے ماخوذ)

میں رکاوٹ ہو۔ معاشرے کی حیثیت سے ہماری مضبوطی، ہماری تخلیقی اور ہماری ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے لوگوں کی صلاحیتوں اور امکانات کو استعمال میں لائیں۔“ (جان گارڈنر)

میں نے اس اقتباس کو بڑے حروف میں لکھوا کر اپنے کلاس روم میں چسپاں کیا ہوا ہے۔ یہ مجھے اور میرے شاگردوں کو یاد دلاتا ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم میں سے بہت سوں کو جاننا ہے۔ جان گارڈنر سابق وزیر صحت، تعلیم اور بہبود عامہ ہے۔ وہ ”کامن کاؤز“ (Common Cause) نامی تنظیم کا بانی اور کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے ماحول کی وجہ سے ”اعلیٰ کارکردگی“ کا مظاہرہ کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ میں اس سے متفق ہوں۔ ہمیں بے شمار ایک ہدایات دی جاتی ہیں جن کا حقیقی کامیابی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے وسائل کے اندر دیکھنے کے بجائے مسائل کے فوری حل کو ڈھونڈنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اگر ہم نہیں دیکھیں گے تو ہم سمجھ نہیں پائیں گے اور ہماری صلاحیتیں چھپی ہی رہیں گی۔ ہمیں اپنی مجبوریوں اور مضامین کے بجائے اپنے امکانات کو دیکھنا ہوگا۔

ٹم ہینسل ایک مہم جو، مقرر، ۶ کتابوں کا مصنف اور زندگی سے ہر روز زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے والا انسان ہے۔ وہ میرا سابق رفیق کار (Colleague) اور

سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ عمل کرنے والے لوگ ہیں۔ عمل ان کی زندگیوں کی بنیاد ہوتا ہے۔ وہ محنت ڈرتے نہیں، اس لیے ہر کام سرانجام دیتے ہیں۔ ضائع نہیں کرتے۔ وہ اپنے وقت کو تعمیری انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اکٹھا ہٹ کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ نئے نئے تجربوں کو ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں۔ لیے وہ یکسانیت کا بھی شکار نہیں ہوتے۔

☆ کامیاب لوگ اپنے شخصی طرز عمل میں معیارات برقرار رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ داری اچھے شخص کے کردار کے بنیادی اوصاف ہیں۔ ایک وصف ہے۔

☆ کامیاب لوگ زندہ رہنے اور جینے کی سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ مؤخر الذکر کا انتخاب کرتے ہیں۔ زندگی سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ اس کا کہ وہ زندگی کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ کائنات اور زندگی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ ہمارے معاشرے کے لوگوں کے اپنے امکانات کو بالکل بھی استعمال نہیں کرتے۔ کہ ان کا ماحول انہیں اس کی تحریک نہ دیتا ہو۔

ہمیشہ ہم سے یہ نہیں چاہتی کہ ہم سب سے اوپر ہوں۔ زندگی صرف اتنا تقاضا کرتی ہے کہ ہم ہر شعبے میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ زندگی کے چند اہم شعبوں کے کامیاب لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ زندگی کو دوسرا ہی قبول کرتے ہیں، جیسی کہ وہ ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو اس کی ساری دشواریوں اور چیلنجوں سمیت قبول کرتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں شکایتیں نہیں کرتے بلکہ وہ اسے اپنا لیتے ہیں۔ وہ دوسروں پر الزام دھرنے اور بہانے بنانے کے بجائے اپنی زندگیوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے منفی عناصر کے باوجود اسے ”ہاں“ کہتے اور حالات جیسے بھی ہوں، اس کو بھرپور انداز میں بسر کرتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ زندگی کے حوالے سے مثبت رویہ اپناتے اور اسے برقرار رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں میں اور دنیا میں اچھائی ڈھونڈتے اور عموماً اسے پالیتے ہیں۔ وہ زندگی کو مواقع اور امکانات کا ایک سلسلہ تصور کرتے اور ہمیشہ مواقع اور امکانات پالیتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ سمت کے شعور اور مقصد کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ اہداف کا تعین کرتے، انہیں حاصل کرتے اور پھر نئے اہداف کا تعین کرتے ہیں۔ وہ چیلنج قبول کرتے اور ان

انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔
پاکستان میں اب بھی کئی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ
ایمیزن کتابیں فروخت کرتی ہے۔ لیکن پاکستانی نوجوان
نسل آگاہ ہے کہ اس ویب سائٹ کے ذریعہ دنیا بھر کی ہر
شے خریدنا ممکن ہے..... گویا یہ کمپنی انٹرنیٹ کی
بین الاقوامی سپر سٹور کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ایمیزن
کو یہ منفرد اعزاز اپنے بانی اور سی ای او، جیف بیزوس ہی
کی بدولت حاصل ہوا۔

امریکا کا نمبر 1 چیف ایگزیکٹو

جیف بیزوس

دنیا کے انٹرنیٹ میں
98 ارب ڈالر مالیت
کے حامل سب سے بڑے
سپر سٹور، ایمیزون
کے بانی سے ملیے
جو اپنے گاہکوں کو ہر
چیز پر فوقیت دیتا ہے

تنویر احمد

ماہ قبل امریکی نیٹ کمپنی،
ایمیزن ایک تاریخی سنگ
میل طے کرنے میں
کامیاب رہی۔ وہ یہ کہ
پہلے یہ کمپنی انٹرنیٹ میں صرف کتابیں اور گانوں و
فلموں کی سی ڈیز، ڈی وی ڈی فروخت کرتی تھی لیکن اب
یہ ہمہ اقسام کا سامان فروخت کر رہی ہے مثلاً ڈرل مشین،
جوتے، ٹینس ریکٹ، پھل و سبزیاں غرض ہر وہ شے جو

چند

ناسا سے
لے کر عام آدمی
تک اس کا
معترف ہے



ہمدردی کرنے سے پہلے طے کریں کہ آپ نیکی کا
کام کرنا چاہتے ہیں۔ کتنا زیادہ اور کتنا لمبا عرصہ کرنا چاہتے
ہیں۔ اگر آپ بہت معمولی کام کریں گے تو آپ کو زیادہ
حاصل نہ ہوگی اور اگر آپ بہت زیادہ کریں گے تو آپ
جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ ہفتے میں ایک بار نیکی کا
خاص بڑا کام کریں یا پھر 3 مرتبہ 5 چھوٹے

کریں۔ اگر آپ پہلے ہی اس
کا کوئی کام کر رہے ہیں
پھر روٹین سے
کر زیادہ کریں
بدل کریں۔

اس سے
مطلب
کہ
روٹین سے
اور ہمدردی
کام نہ کریں
آپ روٹین والے
بھی کریں۔ مزید کہنا

کریں تاکہ آپ بور نہ ہوں۔
اپنے نیکی، ہمدردی اور مہربانی کے کاموں کو
رہے۔ اگر پیسے نہیں دے سکتے تو وقت دیں۔ کسی کا
مشورہ دیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی کی بات
سن لیں۔ کسی سے ہمدردی کا اظہار کریں۔ کسی کا
دیں۔ مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آئیں۔ کسی
چیز مرمت کر دیں۔ دوسروں کی خدمت کریں۔ اگر
سکین تو کم از کم دوسروں کو تکلیف نہ پہنچنے دیں۔
کریں، اس کو احسان نہ جتائیں بلکہ صرف اپنے
کے لیے ایسا کریں۔

ہمدردی
اور
مہربانی
کے کاموں کو
بدلتے
رہیے

پروفیسر ارشد جاوید

ہمدردی کرنے سے خوشی
میں اضافہ ہوتا
ہے۔ مہربان
اور دوسروں کا
خیال رکھنے
والے اور
کشادہ دل
لوگ زیادہ
خوش باش ہوتے
ہیں۔ ایک اور
ریسرچ سے معلوم ہوا
ہے کہ باقاعدگی سے ہمدردی
(Kindness) کے کام کرنا فرد کو
لبے عرصے کے لیے خوشی دیتا ہے۔ جب آپ
لوگوں کی مدد کرتے ہیں، ان کے کام آتے ہیں تو لوگ آپ کو
پسند کرتے، داد دیتے، احترام کرتے، شکر گزار اور احسان مند
ہوتے ہیں جس سے آپ کی خوشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس
اچھے رویے سے آپ کو اچھے دوست بھی مل جاتے ہیں، جو
آپ کی ضرورت کے وقت مدد کرتے اور کام آتے ہیں۔

ہمدردی کئی طرح کی ہو سکتی ہے مثلاً کسی کو خون دینا،
بیمار کی خبر لینا، کسی کا شکریہ ادا کرنا، کسی کے کام آنا، کسی کا کوئی
مسئلہ حل کر دینا، کسی کی مالی امداد کرنا، کسی کو اپنی چیز اُدھار
دے دینا وغیرہ۔

ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ لوگوں کے ساتھ نیکی مثلاً
ہمدردی کرنا نہ صرف دوسرے لوگوں کے لیے بلکہ خود نیکی اور
ہمدردی کرنے والے کے لیے بھی مفید ہے۔ اگر آپ خوشی
چاہتے ہیں تو لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اپنائیں۔ لوگوں
کے کام آئیں، رضا کارانہ خدمات سرانجام دیں، خدمتِ خلق
کریں۔ حقیقی خوشی دوسروں کو خوشی دینے سے ملتی
ہے۔ دوسروں سے ہمدردی کے بغیر
حقیقی خوشی میسر نہیں ہوتی۔

ہمدردی کے رویے کو
بہتر کرنے سے خوشی
میں اضافہ ہوتا
ہے۔ مہربان
اور دوسروں کا
خیال رکھنے
والے اور
کشادہ دل
لوگ زیادہ
خوش باش ہوتے
ہیں۔ ایک اور
ریسرچ سے معلوم ہوا
ہے کہ باقاعدگی سے ہمدردی
(Kindness) کے کام کرنا فرد کو
لبے عرصے کے لیے خوشی دیتا ہے۔ جب آپ
لوگوں کی مدد کرتے ہیں، ان کے کام آتے ہیں تو لوگ آپ کو
پسند کرتے، داد دیتے، احترام کرتے، شکر گزار اور احسان مند
ہوتے ہیں جس سے آپ کی خوشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس
اچھے رویے سے آپ کو اچھے دوست بھی مل جاتے ہیں، جو
آپ کی ضرورت کے وقت مدد کرتے اور کام آتے ہیں۔

ہمدردی کئی طرح کی ہو سکتی ہے مثلاً کسی کو خون دینا،
بیمار کی خبر لینا، کسی کا شکریہ ادا کرنا، کسی کے کام آنا، کسی کا کوئی
مسئلہ حل کر دینا، کسی کی مالی امداد کرنا، کسی کو اپنی چیز اُدھار
دے دینا وغیرہ۔

یہ ۱۹۹۴ء کی بات ہے کہ ۳۰ برس کے جیف نے اپنے گھر کے گیراج میں ایمیزن کی بنیاد رکھی۔ یہ پھر جلد ہی انٹرنیٹ میں کتابیں فروخت کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ بن گئی۔ لیکن پچھلے پانچ سال کے دوران ایمیزن محض کتب و میڈیا تک محدود نہیں رہی، بلکہ ضرورت کی ہر شے اپنے گاہکوں تک پہنچانے لگی۔ آج پوری دنیا میں اس کے لاکھوں گاہک ہیں اور ایمیزن کا کاروبار خوب پھل پھول رہا ہے۔ اس امر کا اندازہ یوں لگائیے کہ پچھلے پانچ برس میں ایمیزن کے حصص کی مالیت ”۳۹۷ فیصد“ بڑھ چکی۔

آج ۴۸ برس کا جیف ۱۹ ارب ڈالر (۱۸۲۴ ارب روپے) کی دولت کا مالک ہے۔ یہ حقیقت اُسے دنیا کے ۳۰ امیر ترین افراد میں جاشامل کرتی ہے۔ اس کے باوجود جیف کا جوش و ولولہ سرد نہیں پڑا۔ آج بھی وہ اپنے دفتر میں ایسے جوش و خروش سے کام کرتا ہے جیسے اپنی نئی کمپنی شروع کر رہا ہو۔ تب وہ ایسا بچہ دکھائی دیتا ہے جو ایک رات والے کیمپ کے سارے مزے لوٹنا چاہتا ہے۔

جیف خود کہتا ہے ”میں فطری طور پر بڑا خوش باش انسان ہوں اور اس کی بیوی کا دعویٰ ہے ”اگر آپ جیف کو غمگین دیکھیں، تو صرف پانچ منٹ انتظار کریں۔“ آخر جیف خوش کیوں نہ ہو؟ آج وہ اپنی قابل رشک صلاحیتوں کے باعث امریکا کا نمبر ایک سی ای او (چیف ایگزیکٹو آفیسر) بن چکا۔

اس اعزاز کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ اُسے پانے والوں میں سٹیو جابز اور بل گیٹس جیسے بڑے نام

جیف جزئیات کی حد تک کاروبار پر دھیان دیتا ہے اسی لیے وہ مصنوعات کی جلد از جلد فراہمی کے لیے مشہور ہے

شامل ہیں۔ یہ اعزاز اسی کو ملتا ہے جو خدا داد صلاحیتوں سے اپنی کمپنی کو بام عروج پر لے جائے اور مسلسل بہترین کارکردگی دکھائے۔ اس مطلوبہ معیار پر جیف اترتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر جیف بیزنس اس لیے کامیابی ملی کہ وہ اپنے گاہکوں کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہے۔ ایک صدی قبل شکاگو میں، امریکا کے مشہور ریٹیلر (پرچون فروش) مارشل فیلڈ نے کاروبار شروع کرتے ہوئے اپنا نعرہ (موٹو) یہ رکھا تھا ”گاہک ہمیشہ صحیح کہتا ہے۔“

جیف بیزنس نے بھی شد و مد سے یہی نعرہ اپنایا اور اُسے دنیائے انٹرنیٹ میں متعارف کرا دیا۔ اسی عمل کے دوران جیف کاروبار کے بڑے معموں میں سے ایک معمو حل کرنے میں کامیاب رہا۔۔۔۔۔۔ یہ کہ کیش رجسٹر کھڑے سے قبل ہی یہ تازہ لیا جائے کہ گاہک کیا چاہتا ہے، اس کی مانگیں کیا ہیں؟

ایمیزن کے اعلیٰ افسر و مینیجر جیف کو خاصا ہیبت ناک باس سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کی زندگیوں میں اس شخصیت کے اثرات سب سے زیادہ ہیں جو دفتر میں ”خالی کرسی“ کہلائی ہے۔ دراصل ہر کانفرنس کے موقع پر جیف ایک کرسی خالی رہنے دیتا اور حاضرین کو بتاتا ہے کہ سوچ لیجیے، اس پر گاہک بیٹھا ہے۔۔۔۔۔ جیف کے الفاظ میں ”کمرے کا سب سے اہم ترین آدمی۔“

ایمیزن میں یہی ”خالی کرسی“ حقیقی باس ہے۔ اُسے واضح اور صاف آواز جیف کی بدولت ہی ملتی ہے جیف کی نظروں میں گاہک کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ



یوں لگائیے کہ ایمیزن میں کارکردگی کی جانچ کرنے والے ”۵۰۰ معیار“ (Metrics) ہیں اور ان میں سے ۸۰ فیصد گاہکوں کی ضروریات سے متعلق نہیں۔

آج ایمیزن نے گاہکوں کو ان گنت سہولیات دے رکھی ہیں۔ مثلاً ایک سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے وہ فلمیں ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ دوسری سہولت انھیں آگاہ کرتی ہے کہ نئی اشیاء سامان کون سا آیا ہے۔ ایمیزن کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہر گاہک اُسے اپنی ضروریات کے مطابق (پرسنلائز) بنا سکتا ہے۔

گاہکوں کی ناپسند کے متعلق جیف مزید سختی برتا ہے۔ مثلاً انھیں آرڈر کی تعمیل میں دیر سختی سے کھلتی ہے۔ اسی طرح وہ مصنوعہ میں نقائص نہیں چاہتے اور کوئی شے اسٹاک میں نہ ملے، تو اس پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

چنانچہ ایمیزن میں ہر ممکن سعی ہوتی ہے کہ گاہک درج بالا کسی خرابی کا سامنا نہیں کریں۔ حتیٰ کہ کمپنی کا کوئی ویب صفحہ لوڈ ہونے میں صرف ”صفر اعشاریہ ایک“ سیکنڈ دیر لگائے، تو اسے بھی بڑی غلطی سمجھا جاتا ہے۔ دراصل ایمیزن کے معیارات کی رو سے اگر صفحہ کھلنے میں ۱۰۰ سیکنڈ دیر لگے، تو گاہکوں کی ایک فیصد سرگرمیاں کم ہو جاتی ہیں۔

ایمیزن کے سابق اعلیٰ افسر و ملازم گاہکوں پر جیف کے انتہائی ارتکاز کی کئی داستانیں سناتے ہیں۔ مثلاً ۲۰ سال قبل سائمن مردوخ برطانیہ میں ایمیزن آپریشنز کا



جیف نے گاہکوں کے دل میں گھر کرنے کا خوب طریقہ سوچا ہے

انچارج تھا۔ اس زمانے میں کوئی آرڈر اگلے دن شام ۶ بجے تک تکمیل کو پہنچتا تھا۔ جیف نے سائمن پر دباؤ ڈالا کہ تکمیل کی حد شام ۴ بجے تک پہنچاؤ۔ لہذا سائمن کو تمام ممکن اقدامات کر کے باس کے حکم کو عملی جامہ پہنانا پڑا۔ آج یہ عالم ہے کہ اگر صبح آرڈر ملے، تو برطانیہ و امریکا کے تمام بڑے شہروں میں اسی دن شام کو اس کی تعمیل ہو جاتی ہے۔

اس طرح ایک اور اعلیٰ افسر، رچرڈ اسمتھ کو یاد ہے کہ جیف کی خواہش تھی کہ سارا مال عمدہ کارڈ بورڈ کے ڈبوں میں بھجوایا جائے۔ یہ دراصل گاہکوں کے دل میں گھر کر جانے کا طریق کار تھا۔ کیونکہ لوگ عمدہ کارڈ بورڈ تحفے یا دیگر سامان بھجوانے میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں وہ آرڈر دیتے وقت ایمیزن کو اولیت دینے لگے۔

گاہکوں کا از حد خیال رکھنے سے بہر حال کمپنی کو فائدہ پہنچا۔ امریکا کی مشی گن یونیورسٹی ہر سال یہ رپورٹ مرتب کرتی ہے کہ گاہکوں کو مطمئن کرنے والی چوٹی کی ۲۲۵ امریکی کمپنیاں کون سی ہیں؟ پچھلے ۱۰ برس میں شعبہ آن لائن ریٹیلنگ میں ایمیزن سرفہرست چلی آرہی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر بھی اس کا شمار ۱۰ بہترین امریکی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ فی الوقت سیئیر، کلورکس، اپیل اور کاروں کی ۳ کمپنیاں ایمیزن سے آگے ہیں۔

لیکن صرف گاہکوں کو مطمئن کرنے کا اچھوتا عمل ایمیزن کی زبردست کامیابی کا پتا نہیں دیتا۔ دیگر آن لائن ریٹیلر کمپنیاں مثلاً ٹارگٹ اور کوسٹ کو بھی اپنے گاہکوں کو

بہترین خدمات فراہم کرتی ہیں لیکن کسی بھی ایسی کمپنی نے پچھلے سال ایمیزن کے مانند ۲۸ ارب ڈالر (۲۶۰۸ ارب روپے) کا سامان فروخت نہیں کیا۔ مزید برآں کوئی بھی آن لائن ریٹیلر کمپنی ایمیزن کی طرح ۹۸ ارب ڈالر کی مارکیٹ نہیں رکھتی۔

چونکہ گاہکوں کو مطمئن کرنے کے سلسلہ میں بے حساب معیار موجود ہیں جن کی پیمائش اعداد و شمار سے کی جاتی ہے، لہذا چیف سمجھتا ہے کہ وہ جو بھی نیا قدم اٹھائے، وہ درست ہوتا ہے۔ یوں اُسے نئی اختراعات کرنے کا موقع مل گیا۔ چیف کہتا ہے: ”ہم اطمینان سے بیچ رہے ہیں اور پھر صبر سے انتظار کرتے ہیں کہ ان سے درخت نکل آئیں۔ لیکن ہم کسی ایجاد یا اختراع کے بجائے اپنے گاہکوں پر پوری توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے کاروباری کلچر میں یہ امر نایاب ہے۔“

اب ایمیزن کے کنڈل (Kindle) ای بک ریڈر ہی کا معاملہ دیکھیے۔ چیف ایسا ای ریڈر ایجاد کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعے قاری کوئی بھی ای بک ۶۰ سیکنڈز میں ڈاؤن لوڈ کر لے۔ اس نے پھر اپنے انجینئروں کو کہا کہ انھیں جتنی رقم درکار ہے، لے لیں۔ تاہم ایجاد معیاری اور بہترین ہونی چاہیے۔ کنڈل ای بک ریڈر کی تیاری میں کئی برس لگ گئے۔ اس دوران مالیات سے وابستہ ایک افسر نے چیف سے سوال کیا ”آپ اس منصوبہ پر کتنی رقم خرچ کرنے کو تیار ہیں؟“

چیف نے فوراً دریافت کیا ”ہمارے پاس کتنی رقم موجود ہے؟“

آخر ستمبر ۲۰۱۱ء میں کنڈل مارکیٹ میں آگئی اور

ایمیزن کے مستقل گاہکوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی قسم کی انقلابی سوچ نے ایمیزن کی بھی کایا پلٹ ڈالی۔ ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۰ء اور پھر ۲۰۰۳ء تا ۲۰۰۷ء تک ایمیزن کی کارکردگی سپاٹ رہی۔ اس دوران کمپنی نے بنیادی طور پر کتب اور موسیقی ہی کو ٹارگٹ بنایا۔ پھر چیف دیگر مصنوعات کی طرف متوجہ ہوا اور وہ بھی گاہکوں کو فراہم کرنے لگا۔

۲۰۰۶ء میں چیف نے ”ایمیزن ویب سروسز“ کی بنیاد رکھی۔ آج اس کمپنی کے گاہکوں میں امریکی خلائی ادارے ناسا سے لے کر عام لوگ شامل ہیں۔ گزشتہ سال کمپنی نے ایک ارب ڈالر کمائے اور اس کا منافع روز افزوں ہے۔ یہ کمپنی ”کلاؤڈ“ کے ذریعے لوگوں کو کمپیوٹر سے متعلق مختلف خدمات فراہم کرتی ہے۔

چند ماہ قبل امریکی خلائی جہاز سینی نے مشتری کی ایک لاکھ اسی ہزار تصاویر زمین پر بھجوائیں۔ ایمیزن ویب سروسز کے طاقتور کمپیوٹروں نے صرف ۵ گھنٹے میں تصاویر پروسس کر دیں اور خرچ صرف ۲۰۰ ڈالر آیا۔ اگر ناسا کے کمپیوٹر یہی کام کرتے، تو ۱۵ دن لگا دیتے اور خرچ بھی تین گنا زیادہ ہوتا۔

چیف عملی آدمی ہے اور خواب دیکھنے والا تصوراتی شخص بھی۔ ۱۹۶۴ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں حساب کتاب کا ماہر بن گیا۔ ایک بار اس نے اپنی دادی کو بتایا کہ اگر وہ یونہی سگریٹ پیتی رہیں، تو فلاں سال چل بسیں گی۔

چیف طبیعات پڑھنے پر نیشن یونیورسٹی پہنچا، لیکن وہاں سے کمپیوٹر سائنس کی ڈگری لے کر نکلا۔ بعد ازاں اُسے وال اسٹریٹ میں پُرکشش معاوضے پر ملازمت مل گئی۔ تاہم اس نے اپنا کاروبار کرنے کا خطرہ مول لیا۔



انٹرنیٹ پر سٹور ایمیزن نے گاہکوں کو بے شمار سہولیات فراہم کر دی ہیں

اور کامیاب رہا۔ جہاں تک خوابوں کا تعلق ہے، چیف (لیکن میں خلا باز بننا چاہتا تھا۔ پھر دادا کی ۲۵ ہزار ایکڑ وسیع چراگاہ میں کچھ عرصہ گزارا، تو کاؤ بوائے بننے کا فیصلہ کیا۔ تاہم قسمت نے اُسے کاروباری بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

نوجوانی ہی میں چیف اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ خود انحصاری کو اعلیٰ صفت مانتا اور اُسے اپنے ملازمین میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوران انٹرویو تمام امیدواروں سے مخصوص امتحان لیے جاتے ہیں۔ یہ امتحان امیدوار اپنی عقل اور محنت کے مطابق حل کرتے ہیں۔ جو شخص دوران امتحان ذہانت و فطانت اور تیزی کا مظاہرہ کرے، ایمیزن کی ٹیم کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایمیزن میں ”خالی کرسی“ کے بعد کارکردگی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ درحقیقت چیف کے نزدیک دونوں کا چولی دامن جیسا تعلق ہے۔ دراصل کارکردگی کے ذریعے ایمیزن میں غیر ضروری اخراجات سے چھٹکارا پایا جاتا ہے۔ مزید برآں جس ملازم کی کارکردگی عمدہ ہو، وہ معاوضہ بھی اچھا پاتا ہے۔

ایمیزن میں تقریباً ”۵۶ ہزار“ مردوزن ملازم ہیں۔ گوانیس گوگل کے ملازمین کی طرح بیسیوں سہولیات حاصل نہیں، تاہم وہ اپنے ادارے سے خوش ہیں۔ اگرچہ انھیں یہ ضرور شکایت ہے کہ چیف تنخواہیں کم دیتا اور کام زیادہ لیتا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ محض ایمیزن تک محدود نہیں بلکہ نائن انوائی ہے۔

ایمیزن جیسی بڑی کمپنی کو چلانا بچوں کا کھیل نہیں، یہ امر ۲۴ گھنٹے کی مصروفیت مانگتا ہے۔ لیکن یہ چیف کا کمال ہے کہ وہ جزئیات کی حد تک کاروبار پر دھیان دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کی بھی ای میلز پڑھتا ہے جبکہ بیشتر سی ای او اسے در دہر سمجھتے ہیں۔ دراصل ان بیانات سے اسے ہر سال درجنوں نئے خیالات و نظریات ملتے ہیں۔ ان کی بدولت پھر ایمیزن کے ہر شعبے میں بہتری لائی جاتی ہے۔

اونٹ

اونٹ بہت مضبوط جانور ہے۔ وہ ۲۵۰ کلوگرام وزن اٹھا کر ۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتا اور بغیر بوجھ کے وہ ۳۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ اسی صلاحیت کی بنا پر اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے۔ کیا اونٹ نے صحرائی حالات کی مناسبت سے اپنے جسم کو موافق بنایا ہے؟ کیا اس نے اپنی ناک کی اندرونی سطح یا اپنی کمر پر کوہان خود بنائی ہے؟ قرآن پاک میں خالق کائنات نے ایک سوال کر کے ”کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسے تخلیق کیا گیا“ خوب سمجھایا ہے کہ اللہ کیسا منفرد خالق ہے۔

چیف بیزوس کا اگلا ٹارگٹ سمارٹ فون ایجاد کرنا ہے۔ ایمیزن کی الیکٹرونکس لیبارٹری سیلی کون ویلی (سیلی فورنیا) میں واقع ہے۔ وہاں گزشتہ ۲ سال سے انجینئروں کی کھیپ ایمیزن سمارٹ فون کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ ایمیزن نے اپنی نئی ایجاد کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور اُسے خفیہ رکھا ہوا ہے۔

آج کل چیف کا مرکوز نگاہ یہ امر ہے کہ مصنوعات خریداروں کو جلد از جلد پہنچائی جائیں۔ گزشتہ دسمبر میں کرسمس کے موقع پر ایمیزن ”۹۹.۹۹ فیصد“ گاہکوں کو وقت پر سامان پہنچانے میں کامیاب رہی تھی۔

یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں، کیونکہ مصنوعات فروخت کرنے والی دیگر آن لائن کمپنیوں کو اس معاملے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن چیف اس زبردست کامیابی سے زیادہ خوش نہیں ہوا، کیونکہ بہر حال ۱۰ ہزار گاہکوں کو سامان وقت پر نہیں ملا۔ وہ کہتا ہے ”ہم حقیقی معنوں میں اسی وقت مطمئن ہوں گے جب ۱۰۰ فیصد کامیابی پالیں۔“

مشکل ترین معاشی حالات میں
بھی آخری سانسوں تک لڑنے کا
عزم رکھنے والی ایک باہمت

رشین نانی

کی زندگی کا ایک دن

دن بھر سردی، بارش اور پولیس کا مقابلہ
کرتے ہوئے بمشکل ۸۵ سینٹ (ایک ڈالر)
کسپانے والی ۶۵ سالہ انتونینا نکیشووا کی
کہانی اسے یاد نہیں کہ آسنری بارگوشت
کب کھایا تھا

انعام الحق مسرزا

روس

میں ایک معاشی بحران نے
لوگوں کو اس شدت سے
متاثر کیا کہ آن واحد میں
ان کی زندگیاں بدل گئیں۔
سب سے زیادہ عمر رسیدہ پنشنرز متاثر ہوئے۔ آئیے آپ کی
ملاقات ۶۵ سالہ ”رشین نانی“ مادام انتونینا نکیشووا
(Mrs. Antonina Nikishova) سے کراتے ہیں۔
رشین نانی کا ایک دن اس بات کا گواہ ہے کہ وہ
بحران کے بعد رونما ہونے والے ناگفتہ بہ حالات میں
جس ہمت و حوصلہ کے ساتھ زندہ رہنے کی تگ و دو کر رہی
ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس کی زندگی کا ہر روز ایک ہی ڈگر پر رواں دواں
ہے۔ وہ روزانہ علی الصبح اٹھ کر اپنے لیے دن بھر کا کھانا تیار
کرتی ہے۔ آج اُس نے آلوؤں میں چند دنوں کی بچی کچی
مشروم کی پختی اور روٹی کے چند ٹکڑے ملا کر سوپ بنایا ہے



اور اسی سوپ سے اسے دن بھر پیٹ کی آگ کو بجھا
ہوگا۔ بحران سے پہلے وہ دن گئے جب نانی کبھی قیہ
کے کوفتے اور ایک آدھ چکن پکا کر کھالیا کرتی تھی۔ تب
اس کی ماہوار پنشن ۳۳۳ روپل تقریباً ۱۰۰ امریکی ڈالر
کے مساوی ہوا کرتی تھی۔ بحران کے بعد امریکی ڈالر کے
مقابلہ میں روپل ایسا روپہ زوال ہوا کہ ایک طرف افراط
زر کی وجہ سے اس کی پنشن کی قوت خرید گھٹ کر تقریباً
۳۶ ڈالر کے برابر ہو گئی اور دوسری جانب اشیائے
خور و نوش کی قیمتیں روز بروز آسمان کو چھونے لگیں۔ یہ جتنی
ہوئی اس بے لگام مہنگائی نے ناصرف نانی جان کو بلک اس
جیسے دیگر لاتعداد پنشنروں کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ لوگ
غربت کی آخری حدوں کو چھو دینے والے محاذ پر اپنے آپ
کو زندہ رکھنے کی جنگ مردانہ وار لڑ رہے ہیں۔

ماضی کو یاد کرتے ہوئے نانی جان کہتی ہیں کہ مجھے
جنگ عظیم دوم کا وہ نازک دور اب بھی یاد ہے جب جرمن

افواج ہم پر تازی توڑ حملے کر رہی تھیں،
لیکن یہ یاد نہیں پڑتا کہ زندگی جیسی اب
بھیا تک ہے تب بھی ایسی ہی مہیب اور
تکلیف دہ تھی۔ لوگ فاقہ کش ہیں اور
بھوک سے مرے جا رہے ہیں مگر پھر بھی
زندہ ہیں۔ ان کی ہمت اور حوصلہ کو داد
دیتی ہوں۔

موجودہ پنشن سے نانی جان کی
زندگی کا پہیا نہیں چل رہا اور اسے چلانے
کے لیے ہر صبح وہ اپنے گھر کے قریب
شہر ڈیمٹروو (Dmitrov) جو ماسکو سے

تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے وہاں سے سستی
شراب ”رشین واڈکا“ کی سات آٹھ بوتلیں خرید کر ایک تھیلے
میں ڈال لیتی ہے اور پھر اس بھاری بھر کم تھیلے کو اٹھائے
مسافروں سے بھری ایک بس میں سفر کر کے قریبی مقامی
ریلوے اسٹیشن جاتی ہے، جہاں سے وہ بذریعہ ٹرین ۳ گھنٹے
کی مسافت کے بعد ماسکو پہنچتی ہے۔ ماسکو میں
Kievskaya نامی زیر زمین ریلوے اسٹیشن کے باہر
جانے والے راستہ کے قریب فٹ پاتھ پر سارا دن ایک
ہاتھ میں ”واڈکا“ کی بوتل لیے ٹرین سے آنے جانے
والے لوگوں کو آوازیں لگا کر متوجہ کرتی ہے۔ گاہک مل
جائے تو ایک بوتل ۱۲ روپل تقریباً ایک ڈالر کی بک جاتی
ہے۔ اگر تمام بوتلیں فروخت ہو جائیں تو اسے تقریباً ۸۵
سینٹ یعنی ایک ڈالر سے بھی کم منافع ہوتا ہے اور یہ برائے
ہم نفع بعوض دن بھر سردی، بارش اور پولیس سے آنکھ مچولی
کھیلنے کے بمشکل حاصل ہوتا ہے۔ پولیس سے اس لیے بچنا
پڑتا ہے کہ اس کے پاس شراب بیچنے کا پرمٹ نہیں ہے۔
اگر ادھر ادھر پڑی کہیں سے کچھ خالی بیڑ کی بوتلیں بھی اکٹھی
کر لیتی ہے تو اس سے اضافی آمدن تقریباً ۳۰ سینٹ ہو
جاتی ہے۔

نانی جان نے انکشاف کرتے ہوئے کہا ”پہلے وہ
بھی اس طرح روزانہ ماسکو نہیں گئی۔ اب اسے ہر روز

وہ اس پیرانہ سالی
میں کئی گھنٹوں تک
فٹ پاتھ پر کھڑی
رہ کر اپنی روزی
کماتی ہے



لازمًا جانا پڑتا ہے اس لیے کہ وہاں جا کر ’واڈکا‘ شراب کی
بوتلیں نہ بیچیں تو اس کا مطلب بھوکا رہ کر دن کاٹنا ہوگا۔
اس مشقت کے لیے دن بھر اسے فٹ پاتھ پر کھڑا رہنا
پڑتا ہے۔ یہ کوئی زندگی تو نہیں؟ بھوک زدہ ہوں اس لیے
ہر حال میں ماسکو جانا پڑتا ہے۔“

نانی جان درمیانے قد و قامت والی بیوہ خاتون
ہیں۔ خاوند کو راجی ملک عدم ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔
وقت کی چیرہ دستیوں نے اس کے خوبصورت چہرے کو
جھریوں سے بھر دیا ہے۔ اپنے چاندی جیسے سفید بالوں کو
ایک رنگ برنگے سکارف کے نیچے ڈھک لیتی ہے۔ تن
بدن پر ایک سویٹر اوپر ڈھیلا ڈھالانیلے رنگ کا معمولی
کوٹ، موٹی جرابیں اور پچھے پرانے بوٹ پہنے ہوتے
ہیں۔ اس کے سامنے کے دانت بھی گر گئے ہیں اور ان کی
جگہ نئے دانت لگوانے کے لیے ڈینٹسٹ کی فیس جو
۳۵۰ روپل بنتی ہے ادا کرنے کی سکت نہیں اور گزشتہ کئی
برسوں سے بنادانتوں کے ہی کام چلا رہی ہے۔

اُسے اپنی جسمانی قوت پر بھروسہ ہی نہیں بلکہ فخر
بھی ہے کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ فٹ پاتھ پر کئی
گھنٹوں کھڑی رہ سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا
بھی اندیشہ ہے کہ جب اس کی ہمت جواب دے جائے
گی اور پاؤں لڑکھڑانے لگیں گے تو تب کیا ہوگا؟ وہ پہلے

جو افغانستان سے
چلے جانے کے
بعد بھی کئی برس
تک امریکیوں
کے لیے جاسوسی
کرتے رہیں گے



تنہا منہ

امریکی جاسوس

ارشاد لاشاری

اور دیگر مشینی آلات چلائیں گی۔ انھیں بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ بیٹریاں ۲۰ برس تک کام دیں گی۔ روایتی طور پر جب افواج باہم ٹکرائیں، تو وہ اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی خوفناک نشانیاں چھوڑ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر زیر زمین بارودی سرنگیں جو جنگ ختم ہونے کے کئی برس بعد بھی معصوم شہریوں کا لہو پیتی ہیں۔ اگرچہ یہ ننھے امریکی جاسوس افغانستان میں ایسی آفت نہیں مچائیں گے جنھیں عسکری ماہرین نے ”دیکھ بھال سے بے پروا ارضی حثاے“ (Unattended ground sensors) کا نام دیا ہے۔

تاہم ان جاسوسوں کو بے وقعت نہ سمجھیے کیونکہ انہی کی بدولت امریکی فوج کو یہ سنہرا موقع ملے گا کہ میدان جنگ چھوڑنے کے باوجود وہ طویل عرصہ اس پر نظر رکھ سکے۔ گویا امریکی افغانستان سے چلے جانے کے بعد بھی افغانوں کی جان نہیں چھوڑیں گے۔

لاک ہینڈ مارٹن دنیا میں سب سے بڑی اسلحہ ساز امریکی کمپنی ہے۔ اس کا ایک اعلیٰ افسر، میٹ پلے برن کہتا ہے ”ہم افغانستان میں اپنے پیچھے سیکڑوں ”سپیشل آپریٹرز“ چھوڑ جائیں گے۔ ان آپریٹروں کو خاص صلاحیتیں دی گئی

صدر، باراک اوباما نے اعلان کر رکھا ہے کہ ۲۰۱۳ء کے آخر تک امریکی فوج افغانستان کو خیر باد کہہ دے گی۔ لیکن عسکری ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے بعد امریکی حکومت کئی برس تک افغانوں کی جاسوسی کرتی رہے گی۔ جاسوسی کا یہ عمل ننھے مشینی جاسوسوں کے ذریعے انجام پائے گا۔ یہ مشینی جاسوس امریکا کی جدید ترین سائنس و ٹیکنالوجی کی حامل عسکری کمپنیوں نے امریکی فوج کے لیے تیار کیے ہیں۔ ان جاسوسوں کی جسامت ہاتھ جتنی ہوگی اور امریکی فوج افغانستان سے رخصت ہوتے ہوئے ایسے کئی جاسوس سرزمین افغانستان کے طول و عرض میں چھوڑ جائیں گے۔ جب بھی کوئی ان کے نزدیک آیا، تو یہ جاسوس اسے شناخت کر کے اس کی خبر اپنے ہیڈ کوارٹر بھجوائیں گے۔ بیشتر ایسے جاسوس چٹانوں، درختوں یا مٹی کے اندر ہائیڈ ہوں گے۔ لہذا آنے جانے والے ان سے بے خبر رہیں گے۔ پھر کچھ جاسوس دیکھنے میں بالکل پتھر لگیں گے۔ ان میں کسی تو انسانی سے چارج ہونے والی بیٹریاں نصب ہوں گی۔ وہی جاسوسوں کے حثاے (Sensors)

امریکی

فٹ پاتھ پر کئی گھنٹے کھڑا نہیں رہنا پڑا اور گھر واپس راستے میں پڑا ایک استعمال شدہ کافی جار بھی مل گیا جو کسی گھریلو استعمال میں لاسکتی ہے۔

برے دن وہ ہوتے ہیں جب اسے انتہائی بھوک ہوتی ہے اور بنا کھائے کئی گھنٹے فٹ پاتھ پر کھڑا رہنا پڑتا ہے گا بھوک کو متوجہ کرنے کے لیے ”واڈکا“ کی آوازیں دے پڑتی ہیں اور بعد میں بھوک مٹانے کے لیے دن بھر کا مناجا یعنی ۱۸ روپل چقندر اور گوشت سے بنے سوپ کے ایک پیالے پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ سب سے بدترین ایام ہوتے ہیں جب ماسکو پولیس کا رویہ انتہائی جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کی طرح اور پنشنرز جو فٹ پاتھ پر سگریٹ اور ”واڈکا“ بیچ رہے ہوتے ہیں ان میں کسی کے پاس بھی یہ سب کچھ فروخت کرنے کا پرمٹ نہیں ہوتا اس لیے پولیس کو آتے دیکھ کر ڈرے ہوئے چوہوں کی طرح بھاگ جاتے ہیں۔ پولیس گشت کر کے چلی جاتی ہے تو واپس آ کر پھر سے اپنی اہلی

چیزیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ نانی جان کچھلی مرتبہ جب ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں تو ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ کسی قدر جسمانی طور پر مضبوط ہے اور اب تک اپنے پاؤں پر ہمت و حوصلہ کے ساتھ کھڑی ہے۔

نانی جان نے کہا کہ وہ ایک باہمت خاتون ہیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر کھانے کو کچھ نہ ہوا تب بھی وہ پانی انہیں نمکین روٹی کے ٹکڑوں پر زندہ رہ سکتی ہیں۔ حالات یہ بھی کیوں نہ ہوں زندگی کی آخری سانسوں تک لڑوں گی۔ انھوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے حالات پر جلد قابو نہ پایا تو ممکن ہے کہ بہت سے لوگ زندہ نہ رہیں۔ سبھی میری طرح تو نہیں۔

ایک ماہ گزر جانے کے بعد پہلی بار اس نے کوئنگ اہل کی ۲ بوتلیں جن کی قیمت ۱۲ روپل سے بڑھ کر ۲۳ روپل ہو گئی ہے، خریدی ہیں۔ چینی اس لیے نہیں خرید پائی کہ اس کی قیمت پہلے سے ۳ گنا بڑھ گئی ہے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آخری بار اس نے گوشت کب کھایا تھا۔

ماہوار پنشن نانی جان کو ہمیشہ تاخیر سے ملتی ہے۔ پہلے اس کی بیٹی جو ایک سکول ٹیچر ہے اور داماد کچھ مالی امداد کر دیتے تھے مگر جب سے اس کی بیٹی کو گزشتہ کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تب سے یہ آسرا بھی جاتا رہا۔

اس کی زندگی میں برے دن تو رہتے ہی ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ اچھے دن نہیں آتے۔ کل اس کا بہت اچھا دن تھا جب اس کی تمام کی تمام بوتلیں فوراً بک گئیں اور اُسے

ہی دے اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ آمدن کا ایک کثیر حصہ اس کی دوائیوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔

کئی برس سوویت ہسپتالوں میں نرسنگ اور جزوقتی سکولوں میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے کے باوجود اس کی غربت اپنی جگہ قائم رہی۔ تاہم ٹیلی ویژن اور فریج وغیرہ خریدنے کی سکت رکھتی تھی۔ آج وہ بلند و بالا عمارت میں ایک چھوٹے کمرے کے اپارٹمنٹ میں اکیلی رہائش پذیر ہے۔ اس کا برسوں پرانا ٹی وی اور فریج دونوں کام نہیں کرتے اور بند پڑے ہیں۔ بلڈنگ میں گرم پانی کی سپلائی

بھی نہیں ہے۔ اسے اس بات کی چھین محسوس ہوتی ہے کہ ملک میں کتنی غربت ہے۔ اس کا اندازہ اسے تب ہوا جب اس کے کچھ عزیز واقارب یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے تو تدفین کے اخراجات ان کے لواحقین کے بس میں نہ تھے اور مجبوراً انہیں دفنانے کی بجائے شمشان بھومی میں لاش سوزی کرنا پڑی۔ وہ بتاتی ہے پہلے ایک غریب ترین آدمی بھی پانچ روپل کے عوض کفن و دفن کر سکتا تھا۔

ایک ماہ گزر جانے کے بعد پہلی بار اس نے کوئنگ اہل کی ۲ بوتلیں جن کی قیمت ۱۲ روپل سے بڑھ کر ۲۳ روپل ہو گئی ہے، خریدی ہیں۔ چینی اس لیے نہیں خرید پائی کہ اس کی قیمت پہلے سے ۳ گنا بڑھ گئی ہے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آخری بار اس نے گوشت کب کھایا تھا۔

ماہوار پنشن نانی جان کو ہمیشہ تاخیر سے ملتی ہے۔ پہلے اس کی بیٹی جو ایک سکول ٹیچر ہے اور داماد کچھ مالی امداد کر دیتے تھے مگر جب سے اس کی بیٹی کو گزشتہ کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تب سے یہ آسرا بھی جاتا رہا۔

اس کی زندگی میں برے دن تو رہتے ہی ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ اچھے دن نہیں آتے۔ کل اس کا بہت اچھا دن تھا جب اس کی تمام کی تمام بوتلیں فوراً بک گئیں اور اُسے

ہیں تاکہ وہ خفیہ طریقہ سے کسی بھی گاؤں کی نگرانی کر سکیں۔ یوں امریکی فوج کو یہ سہولت ہوگی کہ وہ سڑکوں اور راستوں پر جاسوسی کرنے والے عیاں آلات رکھنے سے بچ جائیں۔“

یہ واضح رہے کہ امریکی فوج ۱۹۶۶ء سے کسی نہ کسی طور دیکھ بھال سے بے پروا ارضی حواسے استعمال کر رہی ہے۔ پہلے پہل امریکیوں نے ویت نام میں آواز ریکارڈ کرنے والے نئے جاسوس گرائے۔ ان کا مقصد ہو چکی منہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ حال ہی میں ہزار ہا یہ نئے جاسوس عراق اور افغانستان میں استعمال کیے گئے۔



”ہم افغانستان میں اپنے پیچھے سیکڑوں ”سپیشل آپریٹرز“ چھوڑ جائیں گے۔ ان آپریٹروں کو خاص صلاحیتیں دی گئی ہیں تاکہ وہ خفیہ طریقے سے کسی بھی گاؤں کی نگرانی کر سکیں“

نئے جاسوس

یہ نئے جاسوس کرکٹ کی گیند سے بھی چھوٹے ہیں۔ ہر ایک پر چار انچ لمبا اینٹا نصب ہے۔ وہ مسلسل ۳ ماہ تک کام کرتے ہوئے کسی گاڑی کے پہیوں یا انسانی قدموں کے نشان ہیڈ کوآرڈر بھجواتے ہیں۔ گویا مشرقی افغانستان کے دور دراز علاقوں میں یہ جاسوسی کرنے والے بہترین امریکی اوزار ہیں۔

ان نئے جاسوسوں نے دونوں ممالک میں امریکی افواج کی چوکیوں کے گرد خفیہ دفاعی حصار قائم کر دیا۔ یہ تھا کہ دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر رہا جائے۔ امریکیوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ننھی بھر فوجیوں ذریعے ہی خاصے وسیع علاقے پر نظر رکھ سکیں۔ امریکی افواج میں بریگیڈیئر میٹ رسل ان نئے جاسوسوں کا کمانڈر ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کتنے تعینات کیا جائے۔ بریگیڈیئر رسل کہتا ہے ”ہم انھیں ”مردہ“ علاقہ کی نگرانی کرنے میں وسیع پیمانے پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ مردہ علاقہ سے مراد وہ اہم جگہیں ہیں جہاں کی نگرانی ہم انسانوں یا ڈرونوں سے نہیں کر سکتے۔“

قابل ذکر بات یہ ہے کہ دیکھ بھال سے ہزاروں حواسے صرف ۱۰ سال قبل تک بہت بڑے، بد نما اور ہوتے تھے۔ وہ اکثر غلط الارم بجا دیتے اور ان کی عمر محض دن یا ہفتے ہوتی۔ رفتہ رفتہ انھیں جدید بنایا گیا۔ اب افواج کو جدید ترین بنانے کے لیے ۲۰۰۰ مارب (۱۹۰ کھرب ۲۰۰ روپے) خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔ مزید ترقی یافتہ نئے جاسوس منصفہ شہر پر آئیں گے۔ امریکی انھیں بیرون ممالک ہی نہیں اندرون بھی کام میں لا رہے ہیں مثلاً میکسیکو کی سرحد پر ۵۰۰ دیکھ بھال سے ہزاروں حواسے تعینات ہیں۔ غیر قانونی مہاجروں پر نظر رکھی جائے۔ اسی لیے

سرحدی کمپنیوں کو یقین ہے کہ آنے والے جدید ترین نئے جاسوسوں کی بڑی تعداد اپنے وطن ہی میں کھپے گی۔ مثال کے طور پر ملٹی نیشنل کارپوریشنیں اور دیگر بڑے ادارے بھی انھیں نگرانی کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

جنوری ۲۰۱۱ء میں افغانستان میں موجود امریکی فوج کے کمانڈروں نے اپنے ہیڈ کوآرڈر یہ پیغام بھجوایا کہ انھیں بہتر نئے جاسوس درکار ہیں۔ جواباً امریکی فوج نے انھیں جدید ترین ۱۵۰۰ نئے جاسوس بھجوادیے۔

مستقبل کے نئے جاسوس

آج کل لاک ہیڈ مارٹن کی لیبارٹریوں میں نئی قسم کے دیکھ بھال سے مبرا ارضی حواسیوں پر تجربات جاری ہیں۔ ایک ایسا ارضی حواسیہ تقریباً پچاس حواسے رکھتا ہے جنھیں مخصوص علاقہ میں جال کی طرح بچھایا جاتا ہے۔ جب ایک حواسیہ کسی آدمی یا گاڑی کو شناخت کرے، تو خفیہ ریڈیائی فریکوئنسی کے ذریعے اس امر کی اطلاع اگلے حواسیہ کو دیتا ہے۔ یوں حواسیوں کے درمیان اطلاع کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ آخر یہ اطلاع مواصلاتی سیارے، خفیہ ریڈیو نیٹ ورک یا وائی۔ فائی (Wi-fi) کے ذریعے کمانڈ اینڈ کنٹرول سنٹر تک پہنچتی ہے۔ ان حواسیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ٹویٹر جیسا پیغام انٹیلی جنس افسر کے فون یا ٹیبلیٹ کو بھی بھجوا سکتے ہیں۔ جب یہ حواسیہ کوئی سنگل نہ پکڑیں اور نہ ہی امریکیوں کو اطلاعات بھجوائیں، تو وہ نیم مردہ ہو جاتے اور بہت کم توانائی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ انھیں مٹی میں دبا کر کئی ماہ محفوظ رکھا جائے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں مصنوعی پتھروں کے اندر پوشیدہ رکھنا بھی ممکن ہے۔ چنانچہ قریب سے دیکھنے پر وہ پتھر

میکسیکو کی سرحد پر ۵۰۰ دیکھ بھال سے مبرا ارضی حواسیہ تعینات ہیں تاکہ غیر قانونی مہاجروں پر نظر رکھی جائے

ہی لگتے ہیں۔ تاہم ان میں نئے منہ شمشیں پینل لگے ہوں گے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ دھوپ میں تیزی سے چارج ہونے والے یہ شمشیں پینل نئے جاسوسوں کو اس قابل بنادیں گے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی سیکڑوں رات دن تک ”زندہ“ رہیں۔

لاک ہیڈ مارٹن کمپنی کا دعویٰ ہے کہ درج بالا حواسیوں کی بیٹری ڈاک ٹکٹ جتنی ہوگی۔ نیز یہ ممکن ہوگا کہ اُسے ”۸۰ ہزار“ بار چارج کیا جاسکے۔ واضح رہے، عام ”تھیم۔ آئن بیٹری کو چند سو بار ہی چارج کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ حواسیہ معمول کے مطابق بھی کام کریں، تو ان کی بیٹریاں انھیں کم از کم ۲۰ سال تک چالو رکھیں گی۔

بعض عسکری ماہرین کو کمپنی کے دعویٰ پر شک ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بیٹری جتنی بڑی ہو، اس کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس اعتراض کے باوجود امریکی فوج یہ ارضی حواسیہ خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک وجہ ان کا سستا ہونا بھی ہے۔ حواسیوں کا ایک نیٹ ورک صرف ۱۰۰۰ ڈالر میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ ایسی فوج کے لیے خاصا سستا ہے جو توپ کے ایک گائیڈ ڈگولے پر ۸۰ ہزار ڈالر (تقریباً ۷ لاکھ روپے) خرچ کر ڈالتی ہے۔

لاک ہیڈ مارٹن کے علاوہ کمپنیاں مائیکروسسٹرن نامی کمپیوٹر کمپنی کے ماہرین بھی نئے جاسوس کی تیاری پر جتے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں امریکی فوج نے اُسے

میدان جنگ میں چھوڑو اور بھول جاؤ

نئے نئے جاسوس ڈرامائی طور پر بہت چھوٹے اور انتہائی کم توانائی استعمال کرتے ہیں۔ یوں ممکن ہو گیا کہ وہ ۱۰۰ فیصد حد تک نظروں میں آئے بغیر کئی ماہ بلکہ برسوں تک اپنا کام کر سکیں۔ اسی لیے لاک ہیڈ مارٹن کے ماہرین کی ”یہ نئے جاسوس مسلسل جاسوسی کرنے والے ایسے سپاہی ہیں کہ انھیں میدان جنگ میں چھوڑو اور پھر بھول جاؤ۔“

اپنی جان سے پیاروں کے بعد بھی جینے والوں کے نام

پریشانی کیسے ختم ہوتی ہے

ایک پریشان حال بیٹی کے دل کا ماجرا

وہ اپنی ماں کی محبت سے بھرا تھا مگر اس کے باوجود ماں لمحہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی

خدیجہ نین تارا

بٹھا کر لے گئی تو انتظار گاہ میں دیگر تمام مریضوں کی جھکی نڈھال گردنوں کو دیکھ کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کیونکہ میری امی کی گردن سیدھی تھی (اس وقت تک) اور وہ مجھ سے بات چیت کر رہی تھیں۔

بیماری و تکلیف کی شدت اپنے عروج پر تھی، علاج معالجہ ہو رہا تھا اور ہماری دعاؤں کی شدت بھی اپنے عروج پر تھی، بے بسی سے چور مگر انتہائی پُر امید آنسو دن رات روح کو اجال رہے تھے کیونکہ اللہ کا فرمان ذہن میں تھا کہ مجھ سے جیسی امید رکھو گے میں ویسا ہی معاملہ فرماتا ہوں۔ اس لیے اپنے گمان کو ہمیشہ امید کے تابع رکھا لیکن کبھی انجانے میں یہ خیال گزرتا کہ جو مانگ رہے ہیں ویسا نہ ہوا تو..... بس اس کے بعد اندھیرا چھا جاتا تھا اور حلق سے سانس لینا مشکل ہو جاتی تھی۔ پھر میں خود سے خود کو الگ کر کے سوچتی تھی کہ کہیں امید کی شدت (برعکس نتائج کی صورت میں) مجھے بہا کر نہ لے جائے، ہم ڈوب نہ جائیں لیکن جس پالن ہار کو پکارا جاتا ہے ناں وہی پار بھی لگاتا ہے۔

ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جس کی ماں کی تکلیف اسے کینسر ہسپتال لے گئی، آپ شاید حیران ہوں کہ میں نے خود کو خوش نصیب کیوں کہا؟ کوشش کروں گی کہ میری یہ تحریر یہ ثابت کر سکے اور آپ کے اندر بھی خوش نصیبی کے احساس کی خوشبو مہک گئی۔ ہم بھی محافل میں ہنستے بولتے، کھاتے پیتے، بازاروں میں آتے جاتے، رونق ہستی کا لطف اٹھاتے زندگی بسر کر رہے تھے کہ دستک ہوئی..... دروازہ کھولا..... تو کوئی نہ تھا ایک لمبی چپ تھی اور تیز ہوا کا شور تھا، اسی شور کے پیچھے چلتے چلتے ہم کینسر ہسپتال چاہنچے۔ امی جان کو میسٹ کینسر (درجہ دوم کے اواخر میں) تشخیص ہوا تھا۔ خبر تو بڑی تھی لیکن امی کی دوستی اللہ سے بڑی پرانی تھی اور ہمیشہ سے اللہ ہمارے گھر میں لازمی فرد کی طرح رہتا تھا اس لیے ہم روئے نہیں، بوکھلائے نہیں۔ امی جان نے اہل خانہ کے سوا سب کو اس بارے میں بتانے سے گریز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتی تھیں کہ معاشرہ میں کینسر کا دوسرا نام موت لیا جاتا ہے اور وہ کہتی تھیں کہ لوگ میرے بچوں کا حوصلہ پست کر دیں گے۔ ہمارا پختہ یقین تھا کہ اللہ ہمارے اختیار سے، زندگی کا کوئی طوفان ہو خواہ کینسر ہی ہو ”اُس“ کے ایک ”گمن“ کی دیر ہے، ساری الجھن سلجھ جائے گی۔ امی کی تکلیف کے مراحل بے حد تکلیف دہ تھے۔ سب اس سے واقف ہیں۔ ہم ساری ساری رات ان کے ہمراہ جاگتے اور وظائف کرتے۔ ایک دوسرے کی ہمت دیتے گزر جاتی تھی (ہم جو نیند کے رسیا تھے)۔ امی کو جب پہلی بار کیمو تھراپی کے لیے لے جایا گیا تو وہ اتنی زار و قطار رو رہی تھیں، نرس نے ہمت دینی تو انہوں نے جواب دیا ”نہیں میں اپنی تکلیف پر کیمو تھراپی میں تو یہاں موجود باقی لوگوں کی تکلیف دیکھ کر اپنے رب کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ میں ان سے کم تکلیف میں ہوں۔“

میں جب پہلی بار امی کو ڈاکٹر کے پاس وہیل چیئر پر

میں



ٹیکسٹرون کے ننھے منہ

۲۰۰۸ء سے امریکی اسلحہ ساز کمپنی، ٹیکسٹرون (Textron) بھی دشمن پر نظر رکھنے والے ننھے مشینی آلات تیار کر رہی ہے۔ یہ ننھے منہ مگر افغانستان کے علاوہ اسرائیل میں مستعمل ہیں۔ اسرائیلیوں نے انہیں اپنی سرحدوں پر نصب کر رکھا ہے تاکہ کوئی فلسطینی مجاہد آئے، تو دیکھ لیا جائے۔

یہ ننھے منہ بھی زیر زمین پوشیدہ رہتے اور کئی ماہ تک دشمن کی جاسوسی کرتے ہیں۔ ان کے جدید ورژن ۸۰۰ میٹر دور سے انسان اور ۲۱۰۰ میٹر یعنی ۲ کلومیٹر دور سے گاڑیوں کو شناخت کر سکتے ہیں۔ تاہم امریکی فوج یہ فاصلہ بڑھانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اسلحہ ساز کمپنیاں مزید ترقی یافتہ ننھا جاسوس ایجاد کرنے پر جتنی ہوئی ہیں۔ لگتا ہے کہ مستقبل میں امریکی فوج دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے انسانوں کے بجائے مشینوں ہی سے استفادہ کرنا چاہتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ امریکی اپنے فوجیوں کو مرتا نہیں دیکھ سکتے۔

۱۲ لاکھ ڈالر بھی دیے ہیں تاکہ وہ اس کے لیے جدید ترین ارضی حساسیے ایجاد کر سکے۔

کمپنیاں مائیکروسسٹم انفرادی ننھا جاسوس بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ نیٹ ورک کی صورت کام نہیں کریں گے، بلکہ ہر جاسوس اس قابل ہوگا کہ اطلاع براہ راست مواصلاتی سیارے یا فوجی افسر کے فون تک بھجوا سکے۔ یوں نہ صرف اطلاع بروقت پہنچے گی بلکہ توانائی بھی کم استعمال ہوگی۔

مزید برآں ہر ننھے جاسوس میں محض آواز دھمک والا شناخت کنندہ ہی نہیں بلکہ چاروں طرف گھومنے کی صلاحیت رکھنے والا ریڈار بھی نصب ہوگا۔ یوں یہ جاسوس زیادہ بہتر طور پر انسانوں اور گاڑیوں کی شناخت کرے گا۔ یہ ننھا جاسوس بھی جدید ترین شمسی سیل رکھے گا۔ وہ شمسی سیل ”۵ لاکھ“ مرتبہ چارج ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایک ننھا جاسوس پندرہ بیس سال تک کارگر رہے گا۔

امریکی فوج کے نزدیک ان مشینی جاسوسوں کی اور خصوصیت بڑی اہم ہے۔ چونکہ یہ چھوٹے ہوتے باوجود بڑے مضبوط ہیں لہذا ڈرونوں کے ذریعے پورے افغانستان میں جہاں مرضی چاہے گرانما ممکن ہے افغان مہم سے باخبر بعض امریکی ماہرین عسکریات دعویٰ ہے کہ ڈرون سیکڑوں ننھے جاسوس افغانستان کے دراز علاقوں میں گرا چکے ہیں۔

ایک عسکری ماہر، ایڈورڈ کارپیزہ کہتا ہے ”اب دشمن کی کھوج لگانے کے لیے فوجی دستے بھیجنے کا زمانہ نہ اب ہم ڈرونوں یا ننھے منے جاسوسوں کی مدد سے ان کا لگاتے ہیں۔ جب ان کی شناخت ہو جائے، تو ہمارے حرکت میں آتے اور منٹوں میں ان کا صفایا کر ڈالتے ہیں۔“

۱۲ لاکھ ڈالر بھی دیے ہیں تاکہ وہ اس کے لیے جدید ترین ارضی حساسیے ایجاد کر سکے۔

کمپنیاں مائیکروسسٹم انفرادی ننھا جاسوس بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ نیٹ ورک کی صورت کام نہیں کریں گے، بلکہ ہر جاسوس اس قابل ہوگا کہ اطلاع براہ راست مواصلاتی سیارے یا فوجی افسر کے فون تک بھجوا سکے۔ یوں نہ صرف اطلاع بروقت پہنچے گی بلکہ توانائی بھی کم استعمال ہوگی۔

مزید برآں ہر ننھے جاسوس میں محض آواز دھمک والا شناخت کنندہ ہی نہیں بلکہ چاروں طرف گھومنے کی صلاحیت رکھنے والا ریڈار بھی نصب ہوگا۔ یوں یہ جاسوس زیادہ بہتر طور پر انسانوں اور گاڑیوں کی شناخت کرے گا۔ یہ ننھا جاسوس بھی جدید ترین شمسی سیل رکھے گا۔ وہ شمسی سیل ”۵ لاکھ“ مرتبہ چارج ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایک ننھا جاسوس پندرہ بیس سال تک کارگر رہے گا۔

اللہ آپ کے، ہمارے، ہم سب کے قریب ہے، آس پاس ہے۔ اسے پکارنے کے لیے دلدوز چنیں ہی نہیں ہلکی سی شبنمی سرگوشی بھی کام کرتی ہے

ہے۔ جس درد کو کمزوری بنا لیا جائے تو وہ مار دیتا ہے اور جس درد کو اپنی طاقت بنا لیا جائے تو انسان ”جی“ جاتا ہے۔ شوکت خانم کینسر ہسپتال، ہسپتال کا نہیں، عمران خان کے درد کا نام ہے۔ اسی طرح سے کئی اور فلجی ادارے کسی درد کو اپنی طاقت بنانے سے بنے ہیں۔

امی کی وفات کے بعد جب بہنیں رورہی تھیں تو میں نے انہیں کہا تھا کہ ”مت روؤ، یہ درد بھی نبی ﷺ کی سنت ہے اور ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں، یہ ہماری خوش نصیبی ہے، رب رحمن کی عطا ہے۔ آپ ﷺ پیدا ہوئے تو والد وفات پا چکے تھے۔ ذرا سوچئے! ہم اپنے بچے، بھانجے یا بھتیجے کے لیے یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ پیدا ہو اور یتیم ہو؟ نہیں ناں تو دیکھیں یہ کتنا بڑا نعم ہے اور پھر ایسا یتیم جب صرف ۶ برس کا ہو تو دوران سفر والدہ وفات پا جائیں، راستہ میں دفنا دی جائیں اور واپسی اکیلے ہو؟ اور پھر دادا کے سایہ شفقت میں پناہ لیں تو ۲ برس۔ محض ۲ برس کے بعد وہ بھی وفات پا جائیں اور تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب دادا کا جنازہ جا رہا تھا تو آپ ﷺ پیچھے پیچھے روتے جاتے تھے۔

سوچئے! کائنات کے والی، اللہ کے محبوب اور نبیوں کے سردار پر کیا کیا غم ٹوٹے تو ہماری اوقات کیا ہے؟ یہی غم پیارے نبی ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بناتا ہے اور پھر یہ غم جب بھی کسی کے دل پر دستک دیتا ہے تو رحمت بن کر دیتا ہے۔ رحمت عالم ﷺ کی سنت بن کر دیتا ہے۔ اگر ہم اعلیٰ ظرف و احترام سے اسے اپنا لیں تو یہ

ہی نہیں، ہلکی سی شبنمی سرگوشی بھی کام کرتی ہے۔ روز اول سے تا امروز میں اپنے رب کی انہی نعمتوں سے فیض یاب ہوتی آرہی ہوں، آپ بھی ہو رہے ہیں اور مزید ہو سکتے ہیں۔ ذرا اللہ کی محبت کو Practice تو کر کے دیکھیں۔

میں آج بھی حیران ہوں کہ میں نے ڈاکٹر کے Sorry کہنے پر کس طرح سے یہ کہہ دیا کہ ہم اپنے اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ میں جو دعا کرتے ہوئے اس لمحہ کے بارے میں سوچنے سے بھی گریزاں تھی اور ڈرتی تھی کہ اگر ایسا ہوا تو میں ڈوب نہ جاؤں لیکن ڈوبنا تو دور کی بات میں تو کھڑائی بھی نہیں۔ میں **یا حییٰ یا قیوم برحمتک استغیث** کا جو ورد کرتی آئی تھی وہ امی کی وفات کے بعد بھی جاری رہا شاید اسی کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں۔ آج بھی جب ان مناظر کے بارے میں سوچتی ہوں تو برملا کہتی ہوں کہ میرے رب کی رحمت نے مجھے پکڑ لیا تھا، جذبات کی شدت میں کوئی کلمہ ناشکری بھی نکل سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اپنی امی جیسی زندگی جینے کی ہمت اور ظرف مجھ میں نہیں اس لیے اس بارے میں نصیحت کرنا میں اپنا حق نہیں سمجھتی مگر عزیزان من جان لیجئے! جس جس گھر میں دل میں غم ہے وہ بہت خوش قسمت ہے کیونکہ یہ بڑی دولت ہے جو قرب الہی کا ذریعہ ہے۔ اگر غم ”دولت“ نہ ہوتا تو اللہ اپنے نبیوں اور ولیوں کو یہ نہ دیا کرتا۔ غور کیجئے آپ بھی اس دولت کے امین بنائے گئے کیا آپ نے اس خوش قسمتی پر اپنے اللہ کا شکر ادا کیا؟ قسمت آپ کو کینسر ہسپتال لے گئی۔ زندگی کے نئے زاوے کو دیکھا..... زندگی کی نعمتوں کی وہ قدر محسوس کرنے کو ملی جو اس سے پہلے نہ تھی، کیا آپ نے اس شعور اور عرفان حیات پر اللہ کا شکر ادا کیا؟

وہ ہسپتال جو اتنی بڑی بیماری کے علاج کے لیے آپ کے معاون رہے، مددگار و غم خوار رہے۔ کیا آپ نے ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے؟

آپ اپنے پیارے کے مرنے کے غم میں مرنا تو چاہتے تھے لیکن کیا آپ نے غور کیا کہ درد تو جینا سکھا دیتا

دل کی حضوری سے، شرف باریابی سے ہے۔

اب نیند کے انجکشن کے سوا چارہ نہ تھا، تاکہ درد کی شدت کو کم سے کم محسوس کرے لہذا آخری روز یہی معمول رہا کہ انجکشن لگا کر سلا دیا جاتا۔ سونے کے دوران انھیں تو میری بہن نے ازراہ ہنسنے بھلکے انداز میں پوچھا ”امی! خواب میں کیا دیکھتیں؟“ تو جواب فرمایا بیٹا! آج تو سارا وقت مدینہ میں گزرا ہے۔ پھر آنکھیں بند کر لیں..... پھر رات لیکن آنکھیں نہ کھلیں۔ میں نے جگایا امی! تو ایک طرف آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر بند۔ طبیعت تھی۔ ایسبولینس آئی۔ سارا سفر **یا حییٰ یا قیوم برحمتک استغیث** اور **حسن اللہ نعم الوکیل** پڑھتے گزرا..... امی آئی ہی نہیں اور میں باہر اللہ کو یاد کر رہی تھی، امی کو دیکھ رہی تھی ہی دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آکر ”Sorry“ کہا تو میں آنسوؤں کو روکتے ہوئے، کپکپاتے ہونٹوں سے کہنے لگی کہ بات نہیں ڈاکٹر صاحب ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات انتہائی حیرانی تھے۔ میں نے اپنا جملہ دہرایا..... ہسپتال کے کالڈکس دستخط کیے۔ باقی ہوش و حواس گھر فون کر کے بہن کو گھر سمیٹنے اور چھوٹی بہن کو سنبھالنے کے لیے کہا کہ بعد فون اپنے بھائی کو پکڑا دیا کہ اب کچھ اور مجھ میں تاب نہ تھی جو کچھ کہہ رہے تھے میرے آنسوؤں کے کہنے سے بڑھ کر امی کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ جی ہاں مسکراہٹ۔ یہ سی جسے میں نے تصویر میں بند کرنا چاہا مگر نہ ہو سکی (دنیا کی آلائشوں سے پاکی کے لیے) پھر غسل کی محبت کا لباس) پھر دفن (ازلی آرام گاہ میں)۔

اس سب کے بعد وہی زندگی کا گورکھ منظر مقصد اپنی والدہ کی کہانی سنانا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ کو بتا سکوں کہ اللہ آپ کے، ہمارے، ہم سب کے لیے ہے، آس پاس ہے۔ اسے پکارنے کے لیے دل کی حضوری سے، شرف باریابی سے ہے۔

دوران بیماری و علاج امی نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا، کبھی کلمہ ناشکری ادا نہیں کیا، حتیٰ کہ کبھی موڈ بھی خراب نہیں ہوا، بس ہر دم اللہ کی یاد ہوتی تھی یا ہماری فکر، ہمیشہ ہمارے ہر کام میں دلچسپی لیتی رہیں کیا پکایا کیا پکانا چاہیے، کیا کھایا یا کیا کھانا چاہیے، کس سے ملے یا کس سے ملنا چاہیے اور بازار سے کیا لائے یا کیا لانا چاہیے وغیرہ وغیرہ..... معجزانہ حد تک بڑی بات تھی کیونکہ زندگی ان سے روٹھ رہی تھی لیکن وہ زندگی سے راضی تھیں بلکہ موت سے بھی سے راضی تھیں، کیونکہ اللہ سے راضی تھیں۔ یہاں میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ کینسر ان کی زندگی میں پہلی آزمائش نہیں تھا بلکہ بلا مبالغہ ان کی زندگی کی تاریخ میں چند ایک خوشیوں کے علاوہ سارا عرصہ حیات آزمائش ہی تھا، سب تاریک تھا لیکن اللہ کی محبت نے ہر دور کو روشنی دی۔

پھر کینسر دوسری سے آخری سیج کی طرف سفر کرتا گیا۔ جب امی کے سر کے سارے بال جھڑ گئے تو دل درد سے چور ہو گیا تھا کیونکہ یوں تو ہر ماں ہی اپنی زندگی بچوں پر نچھاور کرتی ہے لیکن ہم اسے ایک تلخ حقیقت کی طرح لمحہ بہ لمحہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ہر خطرناک رپورٹ کے بعد بھی امی کا صبر و استحکام اپنی مددگار نے میں سفر کر رہا تھا کہ ایک رات ہاتھ روم سے واپسی پر وہ گر پڑیں اور کندھے کی ہڈی میں کریک (Crack) آگیا، ڈاکٹر نے ہاتھ لگانے سے معذرت کر لی کیونکہ کینسر کا اثر ہڈیوں میں بھی نفوذ کر چکا تھا۔ دائیں جانب کینسر اور بائیں جانب چوٹ، کمر میں بیڈ سوز..... ”دکھ“ جیسے چھوٹے لفظ کی مکمل تفسیر ہم پڑھ رہے تھے اور ”درد“ جیسے بھاری لفظ کی مکمل تصویر ”ہماری ماں“ کو ہم دیکھ رہے تھے۔ یونہی دیکھتے دیکھتے میں پوچھ ہی بیٹھی، امی! آپ اس سب سے پریشان تو نہیں؟ بستر مرگ پر تصویر درد نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور جواب دیا نہیں بیٹا میں بہت مطمئن ہوں، ان کا یہ اطمینان مجھے عمر بھر کے لیے مطمئن کر گیا اور یہ سبق دے گیا کہ اطمینان کا تعلق جسمانی آرام و آسائش سے نہیں بلکہ

۳۱ افراد کی کہانی
ایک دن وہ دنیا کے بادشاہ بن گئے تھے.....



امریکا کے ایک مستقبل بین
فسانہ طراز رے براڈبری کی تحریر
تحفہ خاص

ترجمہ: عالیہ اخلاق

رحمت تاحیات بلکہ بعد از ممات بھی ہمارے ساتھ چلتی ہے۔
امی کی بیماری کے دوران ایک رات میری بہن نے
خواب میں دیکھا کہ جیسے ہمارے گھر میں پیارے نبی ﷺ
کرسی پر تشریف فرما ہیں اور امی ان کے قدموں میں بیٹھی
اپنا تمام دکھ اور حال بیان کر رہی ہیں اس کے بعد پیارے
نبی ﷺ میرے چچا کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اس کو
بلاؤ..... یہ خواب سن کر بے حد خوشی تو ہوئی لیکن چچا کے
ذکر کی سمجھ نہ آئی (کیونکہ اس وقت تک چچا بھی امی کی
بیماری سے آگاہ نہیں تھے) بعد ازاں یہی چچا امی کے لیے
۲۰ ربیگ صحت مند خون کا بندوبست کرنے کا ذریعہ بنے تو
ہمیں خواب کے دوسرے حصہ کی تعبیر سمجھ میں آئی۔

معزز قارئین! یہ سب بتانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں
کہ آپ کو بھی خواب ہی دکھائی دیں یا آپ بھی ڈاکٹر سے
کہیں کہ ہم راضی ہیں۔ بلکہ مقصد رویوں کی تبدیلی سے
ہے، خوشیوں اور غموں کو نئے زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔
جب اللہ ہمیں لاتعداد نعمتیں اور خوشیاں دیتا ہے تو کیا ہم
لاتعداد بار شکر ادا کرتے ہیں؟ نہیں ناں پھر جب کبھی اللہ
ہمیں آزماتا ہے تو ہم ناشکری پر، مایوسی پر اتر آئیں؟ یہ
رویہ خود کو Justify نہیں کر سکتا۔ ذرا سوچئے کہ اس غم کے
ذریعے اور اس آزمائش کو وسیلہ بنا کر اب کائنات نے آپ
کے اکاؤنٹ میں کس قدر کثیر تعداد میں خالص دعائیں
شامل کر دیں کہ جن کی بابت اس کا وعدہ ہے کہ روز
قیامت وہ ان کا ایسا نعم البدل عطا کرے گا کہ بندہ کہے گا
کاش! زندگی میں میری کوئی بھی دعا قبول نہ ہوتی۔ تو کیا
آپ نے اپنے اس اکاؤنٹ پر اللہ کا شکر ادا کیا؟
مجھے اندازہ ہے کہ بعض لوگوں کو میری اس تحریر پر

”اگر غم“ دولت“ نہ ہوتا تو اللہ اپنے
نبیوں اور ولیوں کو یہ نہ دیا کرتا“

ایک تروتازہ دن تھا۔ اتنا ہی تروتازہ جتنا خوش رنگ گھاس اور نیلے آسمان پر تیرنے والے بادل اور رنگ برنگی تتلیاں کسی عام دن کو بنا سکتی ہیں۔

نضا میں سناٹا تھا، ایک عجیب سناٹا جس میں سمندر کی، زمین کی اور شہد کی مکھیوں کی بھین بھناہٹ اور پودے سرسراہٹ کی آوازیں شامل تھیں۔ زمین ساکت تھی مگر ساکت نہیں تھی۔ سمندر خاموش تھا مگر خاموش نہیں تھا۔ ہر سراپ کسی دوسرے سراپ میں ملتا محسوس ہوتا تھا۔ ہر چپ ایک اور چپ میں مدغم ہوتی نظر آتی تھی۔ ہر آواز کسی نئی آواز سے ہم آغوش ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

یہاں ایک جانب پہاڑی سلسلہ تھا، دوسری جانب سمندر اور ان کے درمیان ریل کی ایک پرانی، زنگ آلودہ پٹری تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے یہ پٹری کسی نے استعمال نہیں کی۔ چھوٹی چھوٹی گھاس نے جگہ جگہ پٹری ڈھانپ لی تھی۔

پٹری اچانک لرزنے لگی، شاید برسوں بعد اس پر کوئی ریل آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد، بہت دور، پٹری پر ایک انجن نمودار ہوا۔ صرف انجن۔ اس کے پیچھے کوئی ڈبا نہیں تھا۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے انجن نے بریک لگانے شروع کیے۔ زنگ آلود پٹری لرزنے لگی۔ انجن کی رفتار کم ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انجن رک گیا۔ پھر کسی نے انجن کا سوچ آف کر دیا۔

ہر جانب پھر وہی گہری خاموشی چھا گئی۔ انجن سے ایک مرد پہلے کود کر اترتا پھر ایک عورت اتری پھر ایک ۷۰ سالہ بچہ نیچے اترتا۔ انھوں نے اتر کر ادھر ادھر دیکھا، پہاڑی سلسلے پر اور دوسری جانب پھیلے ہوئے نیلے سمندر پر نگاہ کی۔

”سمندر اچھا لگ رہا ہے۔“ عورت نے کہا۔ ”کیوں جارح؟“

”مجھے بھی اچھا لگ رہا ہے۔“ بچے نے کہا۔ جارح نے دُور بین سے آگے کا منظر دیکھا۔ ”کیا

خیال ہے مارتھا.....! یہیں پکنک منائیں؟“

”ہاں، یہ اچھی جگہ ہے۔“ مارتھا نے مسکراتے کی کوشش کی پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”جارح! آج ہم نے کتنا سفر کیا ہے؟“

”۹۰ میل۔“ جارح نے بتایا۔ ”بہت زیادہ سفر کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ آدمی فطرت کے رنگ غور سے نہیں دیکھ پاتا، لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ کل تک ہم ماٹی رے پہنچ جائیں گے اور پرسوں پالو آلو۔ میں نہیں چاہتا کہ ننھا جونی تھک جائے۔“

ان تینوں نے وہیں پکنک کا آغاز کر دیا۔ جارح نے سبز گھاس پر چادر بچھائی اور ننھا جونی انجن سے سامان نکال نکال کر لانے لگا۔ مارتھا نے سینڈوچز اور کافی کے پیالے سلیقے سے سجا دیے اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے ارد گرد خاموشی تھی مگر اس خاموشی میں سمندر کی گرج تھی اور پرندوں کے چہچہے تھے۔ پنیر کا سینڈوچ کھاتے کھاتے ننھے جونی نے اچانک کہا ”پاپا! کیا ہم لوگ اکیلے رہ گئے ہیں؟“

مارتھا اور جارح نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر جارح نے جواب دیا ”ہاں بیٹا!“

جونی نے پوچھا ”کیا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے؟ کہیں بھی نہیں ہے؟“

”ہاں، بیٹا! دنیا میں کہیں کوئی نہیں ہے۔“ ”کیا پہلے دنیا میں لوگ رہتے تھے؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو جونی! بار بار تم ایک ہی جیسے سوالات کرتے ہو۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی کی بات ہے۔ تمہیں یاد ہو گا بیٹا!“

”یاد تو ہے۔“ جونی نے ننھے ہاتھوں سے اپنا منہ صاف کیا۔

”مگر میں بار بار بھول جاتا ہوں۔ اچھا، پاپا، یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟“

جارح نے سرگھما کر سمندر کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ”پتا نہیں جونی!“ اور یہ بالکل سچ تھا۔ وہ ایک صبح بیدار

ہوئے تو دنیا لوگوں سے خالی ہو چکی تھی۔

پڑوسیوں کے عقبی باغیچے میں دھلے ہوئے کپڑے اسی طرح لٹک رہے تھے۔ گھروں کے سامنے کاریں اسی طرح کھڑی تھیں مگر کہیں، کوئی نہیں تھا۔ دنیا انسانوں اور ان کی آوازوں سے خالی ہو چکی تھی۔ سارا ہنگامہ، سارا شور، ساری بھاگ دوڑ ایک سناٹے میں بدل چکی تھی۔

اس واقعہ سے صرف ایک دن پہلے جارج اور مارتھا اپنے پورچ میں سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ باکر نے شام کا اخبار ان کی طرف اچھالا اور اپنی موٹر سائیکل پر زن سے آگے نکل گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اخبار وہی خبریں لایا ہوگا۔ جاہلی کی، بربادی کی، غارت گری کی خبریں۔ جارج اور مارتھا، دونوں اخبار کھولنے اور اس کی سرخیاں دیکھنے سے گریزاں تھے۔ معاً جارج نے کہا ”نہ جانے خدا کب انسان سے تنگ آئے گا اور کب اسے فنا کرنے، روئے زمین سے غائب کرنے کا فیصلہ کرے گا۔“

”واقعی!“ مارتھا نے کہا۔ ”انسان کی درندگی کب تک، کہاں تک چلتی رہے گی؟ ہم انسان کس قدر نادان، کس قدر بے وقوف ہیں، ہے نا؟“

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں.....“ جارج بولتے بولتے رک کر پائپ سلگانے لگا۔

”کیا سوچتے ہو؟“ مارتھا نے سوال کیا۔

پائپ کا طویل کش لے کر جارج نے کہا۔ ”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر ہم کل صبح بیدار ہوں اور ہمیں پتا چلے کہ دنیا سے انسان غائب ہو گیا ہے اور اب جیسے انسانی زندگی کا پہیا تڑپنے سے چلانا ہو۔“

مارتھا مسکرائی۔ ”اچھا، فرض کرو، اگر تمہیں ایسا کرنے کے لیے صرف ایک بٹن دبانا ہو تو کیا تم وہ بٹن دبا دو گے؟“

”شاید دبا دوں گا۔“ جارج نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بشرطیکہ ایسا کرنا کوئی قتل عام نہ ہو۔ انسان، بس غائب ہو جائیں۔ دنیا اسی طرح رہے۔ زمین، سمندر، پھل پھول اور جانور سب کچھ اسی طرح رہیں بس انسان نہ رہیں۔ یہ وحشی انسان صفحہ ہستی سے مٹ جائے جو بھوکا نہ ہو تو بھی

شکار کرتا ہے، شکم سیر ہو چکا ہو پھر بھی کھاتا ہے، کسی کے ہاتھوں پریشان نہ ہو پھر بھی کمیנגلی سے باز نہیں آتا۔“

مارتھا پھر مسکرائی۔ ”واقعی، بڑا مزہ آئے۔ بس ہم لوگ زندہ رہیں۔ میں اور تم اور جونی۔“

”کیا زبردست زندگی ہوگی۔“ جارج ہنسا۔ ”وقت ہی وقت ہوگا۔ تاریخ کی طویل ترین چھٹیاں ہوں گی۔ کائنات کی سب سے لمبی پلنگ منائیں گے ہم۔ ہمیں نہ وقت پر کہیں پہنچنا ہوگا، نہ کہیں سے تھک ہار کر واپس آنا ہو گا۔ نہ دولت مندی میں کسی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہ کوئی خوبصورت، خوش رنگ کار رکھنی ہوگی۔ ہم خوب سیر کریں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک۔ سینڈویچز، کافی اور سیر و سیاحت۔“

وہ بہت دیر تک پورچ میں خاموش بیٹھے رہے۔ اخباریوں ہی تہہ کیا ہوا پڑا رہا۔ لمبے وقفے کے بعد مارتھا نے صرف اتنا کہا ”جارج، ہم تنہائی تو محسوس نہیں کریں گے؟“ جارج نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اگلی صبح ان کی نظروں نے وہ منظر دیکھا جو ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا۔ ان کی آنکھ کھلی تو دنیا بدل چکی تھی۔ انسانوں کی آوازیں، انسانوں کا ہنگامہ، سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ جارج نے بیدار ہوتے ہی یہ خاموشی محسوس کر لی۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا ”سب کچھ ختم ہو گیا۔“

دونوں نے حیرت انگیز، ناقابل یقین واقعہ پورے حوصلے، پورے ہوش سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ دیر تک میز پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ آخر جارج نے کہا ”میرا خیال ہے اب مجھے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ مارتھا نے پوچھا۔ ”کیا تم نوکری چھوڑ دو گے؟“

جارج ہنسا۔ ”تم شاید اب تک بے یقینی کا شکار ہو۔ جان من! اب مجھے ہر صبح دفتر جانے کے لیے طوفان کی طرح روانہ نہیں ہونا، جونی کو اسکول نہیں جانا۔ پڑھائی،

نوری، باس کی ناراضی..... سب ختم۔ بالکل ختم۔“
انہوں نے باہر نکل کر ویران سڑکیں اور سنان
مارتیں دیکھیں ہر جانب گہرا سناٹا تھا۔ ”لوگ مرے نہیں
جس۔“ جارج نے کہا۔ ”بس..... غائب ہو گئے ہیں۔“
پس چلے گئے ہیں۔“

مارتھا نے پوچھا۔ ”کیا ہر جگہ؟ ہر شہر میں؟“
انہوں نے ایک ٹیلی فون بوتھ سے دوسرے شہروں
میں آباد اپنے عزیزوں کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔
ڈاکو، نیویارک، سان فرانسسکو۔ خاموشی، ہر جگہ خاموشی،
گہری، بے انت خاموشی۔ جارج نے رسیور کریڈل پر لٹکا
دیا اور بوتھ سے نکل آیا۔

”میں..... میں احساس جرم کا شکار ہو رہی ہوں۔“
مارتھا نے کہا۔ ”انسان ختم ہو گیا اور ہم بچ گئے ہیں اور اس
پہلو میں خوش ہو رہی ہوں۔ کیوں؟ مجھے تو ناخوش ہونا چاہیے۔“
کیا احمقانہ بات ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”یہ کوئی المیہ
تو نہیں ہے۔ انہیں قتل نہیں کیا گیا، دھماکے سے نہیں اڑا دیا
گیا، جلایا نہیں گیا۔ وہ بس، خاموشی سے رخصت ہو گئے۔
ہم پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔ ہماری ذمہ داری اب
صرف یہ ہے کہ ہم خوش رہیں۔ ۲۰، ۳۰، ۴۰ سال خوش
رہیں۔ اتنی طویل خوشی کے سوا آدمی کیا آرزو کر سکتا ہے۔“
”لیکن.....“ مارتھا نے کہا۔ ”ہمارے اور بھی بچے
پیدا ہونے چاہئیں۔“

”تا کہ دنیا دوبارہ آباد ہو سکے؟“ جارج نے تلخی
سے کہا۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔ مارتھا جونی اس دنیا کا آخری
انسان ہو گا اور اس کے بعد اس دنیا پر صرف پرندے،
جانور اور درخت حکمرانی کریں گے۔ پھر شاید کروڑوں،
ارہوں سال بعد کوئی دوسری، کوئی مختلف نسل اس زمین
پر جنم لے جو ایسے شہر بسائے جہاں خوشیاں ہوں اور
انسان ہو۔ انسان کو اس دنیا میں دوبارہ آباد ہونے کا حق
نہیں ملنا چاہیے۔ اچھا اٹھو، اب ہمیں تاریخ کی طویل ترین
چٹیاں گزرنی ہیں۔ دنیا کی سب سے لمبی کینک کا آغاز
کرنا ہے۔ تیاری شروع کر دو۔“

وہ سر سبز گھاس پر چادر بچھائے بیٹھے تھے۔ ایک
جانب بلند پہاڑ تھے، دوسری جانب شور مچاتا سمندر تھا اور
ان کے درمیان وہ پرانی پنڑی تھی جس پر ان کا انجن کھڑا
تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ساحل کی طرف آگئے۔ ننھا
جونی رنگین سپیاں جمع کرتا رہا، جھاگ اڑاتی لہریں ساحل
کی طرف آتی اور دم توڑ کر واپس جاتی دیکھتا رہا پھر وہ ایک
درخت کے سائے میں سو گیا۔

دوپہر ڈھلنے لگی تو وہ درختوں کے سائے سے نکل کر
پہاڑ کی طرف چلے گئے۔

۱۵، ۴ ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ مسلسل سفر کر رہے
تھے۔ ہر روز ۵۰ یا ۱۰۰ میل کا سفر۔ نئی جگہیں، نئے
علاقے، نئے مرغزار، نئی وادیاں۔ انہوں نے مل کرنے
راستے ڈھونڈے، نئے پودے دیکھے، نئے پھول تلاش کیے
اور نئے پرندے پرواز کرتے دیکھے۔

آج وہ جس جگہ رُکے تھے، یہ بھی بہت حسین جگہ
تھی۔ شام ڈھلنے لگی تو جارج نے لکڑیاں جمع کر کے آگ
جلائی۔ ”اب میں تم دونوں کو قدیم عہد کے انسان کی طرح
چائے بنا کر پلاتا ہوں۔“

اس نے چائے بنائی۔ ننھا جونی بہت دلچسپی سے سب
کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ مزید سپیاں چننے کے لیے ساحل کی
طرف چلا گیا۔

جارج نے مارتھا کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی پھر انجن
میں جا گھسا اور کچھ ہی دیر میں ایک بڑا ساقشہ نکال لایا۔
زمین پر نقشہ بچھا کر وہ اس پر جھک گیا۔ یہ پورے
امریکا کا جہازی سائز کا نقشہ تھا جس میں شہر، گاؤں، دریا،
ندیاں اور پہاڑ ہر چیز کی تفصیل درج تھی، ریل کی ان
پنڑیوں کی بھی جو ایک شہر سے دوسرا شہر ملاتی تھیں اور جن
پر وہ گزشتہ ۱۵، ۴ ہفتوں سے محو سفر تھے۔

بہت دیر تک نقشے پر غور کرنے کے بعد جارج نے سر
اٹھایا مارتھا..... اگلے ماہ ہم سیکرامونٹو کی طرف چلیں گے۔
پھر ممفی آجائے گا اور ہم سائل کے علاقے میں داخل ہو
جائیں گے۔ جولائی تک پورے علاقے کی سیر کرنے کے

ترقی کا راز

اشفاق احمد لکھتے ہیں:

”روم (اٹلی) میں میرا ٹریفک چالان ہوا۔ مصروفیت کی وجہ سے چالان فیس وقت پر ادا نہ کر سکا تو مجبوراً کورٹ جانا پڑا۔ جج کے سامنے پیش ہوا تو اُس نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ ٹیچر ہوں، اس لیے کچھ دن سے مصروف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا، جج نے کہا ”A Teacher is in the Court“ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جج صاحب بھی کھڑے ہو گئے اور مجھ سے معافی مانگ کر چالان کینسل کر دیا۔ میں اپنی غلطی پر بہت شرمسار ہوا مگر اُس روز میں نے قوم کی ترقی کا راز جان لیا۔“

(صائمہ وہاب، لاہور)

پہلے کی طرح دنیا میں بسنے والے لوگ واپس آ جائیں۔ ساری بے وقوفی، سارا شور، ساری نفرت، ساری ہولناکی چیزیں، سارے ڈراؤنے خواب سارے عیار لوگ، ساری گڑبڑ، ساری امیدیں، ضرورتیں، محبتیں واپس آ جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو، ہے نا؟“ مارتھا نے لمحے بھر سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت ایک ہلکی سی آہٹ نے اُنہیں چونکا دیا۔ ننھا جونی ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کس وقت دبے پاؤں آیا اور نہ جانے کب سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے باپ کو غور سے دیکھا پھر اپنا ننھا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا، آنسوؤں کی نمی اب تک چمک رہی تھی۔ ”پاپا!“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”آپ بھی رو رہے ہیں؟ میری طرح آپ کے ساتھ بھی کھیلنے والا نہیں رہا ناں۔“

مارتھا اور جارج، دنیا کے سب سے تنہا لوگ، دم بخود بیٹھے رہ گئے۔

بعد ہم واشنگٹن پہنچ جائیں گے۔ وہاں گرمی کا موسم اچھا ہوتا ہے۔ موسم ذرا اور بہتر ہوگا تو ہم یلو اسٹون کے علاقے کی طرف نکل جائیں گے، مچھلیوں کا شکار کریں گے۔“

مارتھا خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ جارج نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”سردی ہمیں یک سن کے علاقے میں گزارنی چاہیے اور یہاں سے ہوتے ہوئے ہم فلوریڈا میں داخل ہو جائیں گے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم بہار کا موسم گزاریں گے اور میرا خیال ہے، اگلے سال کی گرمی ہم شکاگو میں گزار سکتے ہیں اور ۲ سال بعد کی سردی..... کیا خیال ہے، میکسیکوٹی میں نہ گزاریں؟ جہاں جہاں یہ پٹری ہمیں لے جائے، جس طرف بھی لے جائے، ہم چلتے چلے جائیں گے۔ ابھی تو نہ جانے کتنے علاقے ہیں، ہزاروں، لاکھوں شہر ہیں جنہیں ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے اور شاید پھر کسی سال ہم دریائے مسیسیپی میں کشتی رانی کر سکیں۔ نہ جانے کب سے میری آرزو ہے کہ میں اس شاندار دریا میں کشتی چلاؤں۔ زندگی کی سب خواہشیں پوری کرنے کو دل چاہتا ہے اور اب تو پوری زندگی سامنے پڑی ہے کہ.....“ بولتے بولتے اس کی آواز دھیمی پڑنے لگی پھر وہ چپ ہو گیا۔ وہ نقشہ سمیٹ کر واپس رکھنا چاہتا تھا کہ اچانک نقشے کے سخت کاغذ پر کوئی چیز گری۔

مارتھا نے چونک کر دیکھا۔ نقشے پر نمی کے آثار تھے۔ یہ ۲۲ آنسو تھے جو اس کے شوہر کی آنکھوں سے نکلے اور کالوں پر لکیریں بناتے ہوئے نیچے نقشے پر جا گرے تھے۔ مارتھا نے جارج کا ہاتھ تھام لیا۔

جارج نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر دکھ کے آثار تھے۔ اس نے پوری قوت سے مارتھا کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”مارتھا.....“ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے آہستہ سے کہا ”میں ایک عجیب بات سوچ رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں..... کتنا اچھا ہو، اگر ہم آج رات جب سو جائیں تو رات کو کسی وقت، کسی طرح پھر سب کچھ واپس آ جائے،

چلی سے ایک ہسپانوی داستان

دام دام

ایک ڈاکو اور دہشت گرد کی کہانی
اُس کے ستارے ایک عورت کے قبضے میں تھے
اور اُسے یہ حقیقت ماننے میں بہت وقت لگا

از ائیل آسندے
ترجمہ: سید کاشف رضا

لیے ضروری تھا کہ وہ عورتوں سے پرہیز کرے۔ دنیا کی یہ
سب سے لطیف اور زندہ نعمت اس پر حرام تھی، جیسے
پروانے کے لیے شمع اور بھونرے کے لیے پھول ممنوع ہو۔
یہ گویا اس کی پیدائشی محرومی تھی کیونکہ جس دن وہ پیدا ہوا

ایک تندرست اور معقول شکل و صورت
کا آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر دو
آنکھیں بھی تھیں اور سینے میں ایک دل
بھی دھڑکتا تھا مگر بد قسمتی سے اس کے

۵۵

تھا، گاؤں کی کاہنہ نے اسی دن یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس بچے کی موت ایک عورت کے باعث واقع ہوگی۔ اس کا نام نکولس ووال تھا۔ ووال نے ہوش سنبھالا اور کچھ سوچہ بوجھ پیدا ہوئی تو یہ پیشین گوئی اس نے سنی۔ وہ سخت ہراساں ہوا اور سوہان روح میں مبتلا ہو گیا۔

گاؤں سے کوسوں دور ایک قصبے میں ملک کی مشہور کاہنہ رہتی تھی۔ ووال کسی نہ کسی طرح لمبا سفر کر کے اپنا مستقبل معلوم کرنے کے لیے اس کاہنہ کے پاس پہنچا۔ کاہنہ نے ووال کی ہتھیلی کا غور سے جائزہ لیا اور صاف گوئی سے اس امر کی تصدیق کر دی ”تمہاری موت ایک عورت کے باعث واقع ہوگی۔“

ودال نے خود کو تقدیر کے سامنے بے بس مان کے اپنی امانتیں اور خواہشیں بالائے طاق رکھ دیں اور عورتوں سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کر لیا۔ وہ اس معاملے میں نہایت محتاط رہا۔ شروع میں اسے کچھ دشواری ضروری ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل پتھر ہو گیا، اسے رفاقت اور محبت کی ضرورت ہی نہ رہی۔

اس چیز نے اسے ایک عام آدمی کی طرح معمول کی زندگی گزارنے کے قابل نہیں چھوڑا، اس نے مجرمانہ روش اختیار کر لی اور ایک لئیرا بن گیا۔ وہ لوٹ مار کرنے اور اگلے ڈالنے لگا۔

اسی قصبے میں ہڈانگو نامی ایک معزز آدمی بھی رہتا تھا۔ وہ جج تھا اور عدالتی اختیارات کے ساتھ ساتھ اُسے قصبے کے انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ جج ہڈانگو کی شادی جوانی کی بہار گزر جانے کے بعد ہوئی تھی مگر بیوی اسے اچھی ملی، حسین و جمیل، نوخیز اور ذہین، اس کا نام کاسلا تھا۔ نہ صرف قصبے، بلکہ اردگرد کے علاقوں میں بھی جج ہڈانگو کی انصاف پسندی اور سخت مزاجی کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مرغی کی چوری جیسی معمولی غلطی کو بھی قتل جیسی سنگین واردات سمجھتا تھا۔ اپنے سیاہ لباس کی وجہ سے وہ لوگوں کو موت کا فرشتہ معلوم ہوتا، سبھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ جوتے بھی کالے پہنتا تھا۔

جج کی ۳۳ سالہ ازدواجی زندگی میں اس کی بیوی کا سلا ۳۳ مرتبہ امید سے ہوئی۔ وہ ایک نرم و نازک عورت تھی مگر زچگی کے جان لیوا مراحل سے زندہ بچ گئی۔

ہڈانگو اور کاسلا میں قابل رشک یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات نے ہڈانگو کے مزاج پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ اس کی سنگ دلی نرمی میں بدل گئی تھی اور لوگوں میں یہ مشہور ہوتا جا رہا تھا کہ جج ہڈانگو پہلے فولاد تھا، اب موم ہو گیا ہے اور یہ قلب ماہیت اس کی بیوی کاسلا کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ جج ہڈانگو مختلف مقدمات کے فیصلوں کے متعلق بھی اپنی بیوی سے مشورے کرنے لگا ہے۔

بہر حال جج ہڈانگو کی یہ مبینہ نرمی نکولس ووال کے لیے کسی خوشی اور خوش فہمی کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے معاملے میں جج ہڈانگو بدستور سخت اور اٹل تھا، اس لیٹرے کے لیے اس کے دل میں رعایت کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ جج کے لیے یہ بات خفت کا باعث تھی کہ اُسی کے گاؤں کا ایک شخص گاؤں گاؤں ڈاکے ڈال رہا ہے اور قانون کی گرفت میں نہیں آ رہا۔ ووال جج کی بدنامی کا باعث تھا۔

ودال ۳۰ برس پہلے جوانا ترستی نام کی ایک عورت کے گھر پیدا ہوا تھا، اس کا باپ نامعلوم تھا۔ ماں نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ ہاں، ایک بار شاید بے خیالی میں، وہ اسے یہ ضرور بتا بیٹھی کہ اس کی پیدائش میں ماں کی کوئی خواہش یا پسند شامل نہیں تھی بلکہ حمل کے دوران وہ چاہتی تھی کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ اس نے اسقاط کی غرض سے کئی دوائیں کھائیں، کئی ترکیبیں استعمال کیں لیکن ووال کو دنیا میں آنے سے نہ روک سکی۔ ووال آدھمکا۔ پیدائش کے بعد بھی وہ بہت سخت جان ثابت ہوا اور ہر قسم کی تکلیفیں بے پروائی سے جھیلتا چلا گیا۔ پیار اور چھاؤں سے محروم ایک لڑکے کا بگڑ جانا حیرت کی بات نہیں۔ بے گھری کے عالم میں اس بد نصیب کو عورت کی محبت بھی نہیں ملی اور اس محرومی کا ذمے دار وہ تھا کیونکہ اس

کے سر پر کاہنہ کی منحوس پیشین گوئی سوار تھی۔ وہ جانتے بوجھتے کسی عورت کے، یعنی اپنی موت کے قریب کیسے پہنچتا۔ ۱۰ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وصال اپنی عمر سے بڑے لڑکوں کو پیٹنے لگا تھا۔ آئے دن کی مار دھاڑ کی وجہ سے اس کے چہرے پر چاقو کے نشان بھی پڑ گئے تھے۔ ۲۰ سال کی عمر میں اس نے مفروز اور پوشیدہ زندگی شروع کر دی اور اپنے جیسے مایوس نوجوانوں کا باقاعدہ ایک گروہ بنالیا۔ بس پھر کیا تھا، جگہ جگہ مختلف وارداتیں ہونے لگیں۔ بدنامی بڑھی تو قصبے میں ہونے والا ہر جرم اسی کے ہاتھ میں ڈالا جانے لگا۔ اس سے وہ واقعات بھی منسوب کر دیے گئے جو اس نے نہیں کیے تھے۔ ہر طرف اس کے نام کی دہشت بیٹھ گئی۔ ارد گرد کے زمیندار اُسے اپنی جویلوں سے دُور رکھنے کے لیے نذرانے اور بھتے بھجوانے لگے۔

جج ہڈانگو برابر اس کی تاک میں رہا۔ اسے پکڑنے کا ہر طریقہ استعمال کیا اور قصبے بھر کے سرکاری اہل کار اس کام پر لگا دیے مگر وصال بھی کسی چھلاوے سے کم نہ تھا۔ جج صاحب کو مایوسی اور جھلاہٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تھک ہار کے ہڈانگو نے مرکزی حکومت سے درخواست کی کہ وصال اور اس کے گروہ کی گرفتاری کے لیے فوجی دستہ روانہ کیا جائے۔ آخر فوجی دستہ آیا، متعدد چھاپے مارے گئے، مستقل ناکا بندی کی گئی لیکن ناکامی ہی ہوئی۔

جج آکے جج نے وصال کو پھانسنے کے لیے ایک اور پھندا تیار کیا۔ اس نے وصال کی بوڑھی ماں جوانا کو پکڑوا کے ایک بڑے سے پنجرے میں بند کیا اور پنجرہ اپنے دفتر کے سامنے عام شاہراہ پر رکھوا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وصال، ماں کی تکلیف اور بے حرمتی پر تمللا کے خود کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔ جج کی ہدایت کے مطابق پنجرے میں قید بڑھیا بھوکی پیاسی رکھی گئی، اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا۔

جج کو معلوم تھا کہ اس اقدام سے وہ انصاف کے نام پر خود ایک سنگین جرم کر رہا ہے لیکن اس کی دانست میں

ودال کی گرفتاری کا کوئی اور طریقہ نہیں بچا تھا۔

ودال کو ماں سے بچھڑے ہوئے ایک طویل مدت ہو گئی تھی اور اسے ماں سے کوئی خاص محبت بھی نہیں تھی لیکن اب محبت سے زیادہ اس کی عزت اور شان کا سوال تھا۔ اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ ان کا سردار جج کی یہ مذموم حرکت برداشت نہیں کرے گا، انہوں نے متوقع مقابلے کے لیے اپنے ہتھیار تیز کرنے شروع کر دیے لیکن وصال نے غصے کے بجائے محل کا مظاہرہ کیا اور یہ اعلان کر کے انہیں حیرت زدہ کر دیا کہ ہم کوئی جواب کارروائی نہیں کریں گے۔

وقت گزر رہا تھا۔ وصال کے گروہ میں بے چینی بڑھتی گئی لیکن وصال خود ہر رات سکون کی نیند سوتا۔ اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وصال کوئی بہترین منصوبہ سوچ رہا ہے۔ انہیں یہ خیال بھی آیا کہ سخت جانی کے باوجود ممکن ہے، وصال ڈر گیا ہو لیکن یہ امکان انہوں نے خود رد کر دیا کیونکہ وصال کئی مرتبہ حیرت انگیز جرأت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ ایک مناسب موقع پر گروہ والوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”سردار! کیا حکم ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وصال نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”انہوں نے تمہاری ماں کو قید کر دیا ہے۔“ ”کر دینے دو، دیکھنا یہ ہے کہ حوصلہ کس میں زیادہ ہے، جج میں یا مجھ میں۔“

۳ روز کی قید کے بعد جوانا میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ رو رو کر روٹی مانگ سکے۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پیڑیاں جم گئی تھیں اور زبان چمڑے کی ہو گئی تھی۔ پنجرے کے باہر ۴ مسلح سپاہی پہرا دے رہے تھے تاکہ قصبے کے لوگ جوانا کو روٹی یا پانی نہ دے سکیں۔

قصبے میں بے چینی بڑھ گئی اور جج کے خلاف مظاہرے ہونے لگے، سرکاری ملازموں نے بھی اس ظلم کے خلاف ہڑتال کر دی لیکن جج ٹس سے مس نہ ہوا۔ قصبے کے سب سے بڑے پادری نے اسے حضرت مسیح کا واسطہ بھی دیا مگر جج نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اُسے یقین تھا کہ

ودال کی قوت برداشت آخر ختم ہو جائے گی اور جلد ہی وہ اپنی ماں کو بچانے آجائے گا اور پکڑ لیا جائے گا۔

قصبے کے مظاہرین نے جج سے مایوس ہو کے اس کی بیوی کا سلا سے ملاقات کی۔ جج ۳ روز سے گھر نہیں آیا تھا، وہ اپنے دفتر میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور ودال کا منتظر تھا۔ کا سلا ان ۳ دنوں میں گھر سے باہر نہیں نکلی تھی، پھر بھی اسے سب کچھ معلوم تھا۔

مظاہرین کی درخواست سن کر کا سلا نے اپنے بچوں کو اچھے کپڑے پہنائے اور ان کے ساتھ قیدی عورت کے پاس روانہ ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا جگ۔ پہرے داروں نے اسے دیکھا تو سمجھ گئے کہ وہ کس مقصد سے آئی ہے لیکن جج نے انہیں سختی سے حکم دیا تھا کہ کسی کو پنجرے کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ انہوں نے کا سلا کو روکنے کی کوشش کی تو کا سلا نے اصرار کیا، اس کے بچے بھی رو رو کر اس کا ساتھ دینے لگے۔

جج بدستور دفتر میں بیٹھا تھا۔ اگر اسے ودال کے کھوڑوں کی ٹاپیں سننے کا اشتیاق نہ ہوتا تو وہ اپنے کانوں میں موم بھر لیتا۔ ۳ روز سے وہ جوana کی چیخیں، آہیں، مظاہرین کے نعرے اور بددعائیں سن رہا تھا اور بے فکر تھا لیکن جب اس نے اپنے بچوں کا رونا سنا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دفتر سے باہر نکلا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکا۔ کا سلا کی خاموشی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے اتنی شدت سے کبھی اپنے شوہر کو نہیں گھورا تھا اور وہ بھی پورے قصبے کے سامنے۔ ہڈانگو نے مغلوب ہو کر بیوی سے پھلوں کی ٹوکری اور پانی کا جگ لے لیا اور پنجرے کا دروازہ کھول کر یہ ممنوعہ چیزیں خود جوana تک پہنچا دیں، اس کے بعد جوana رہا کر دی گئی۔

ودال کو یہ خبر ملی تو وہ جھوم اٹھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”دیکھا، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جج ہار جائے گا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں، جتنا مجھ میں ہے۔“

لیکن دوسرے ہی روز اس کی خوشی کا فور ہو گئی۔ اسے بتایا گیا کہ اس کی بوڑھی ماں نے اپنے گھر میں سچے سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔ ماں سے یہ ذلت اور یہ بے توجہی برداشت نہیں ہو سکی کہ اس کے اکلوتے بیٹے نے اسے پنجرے میں بھوکا پیاسا بند رہنے دیا جب کہ پورا قصبہ اس کی حمایت میں چیخ پکار کر رہا تھا۔ ودال، ماں کی خودکشی کی خبر سن کر غصے سے سرخ ہو گیا اور غضب ناک لہجے میں بولا ”جج کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔“

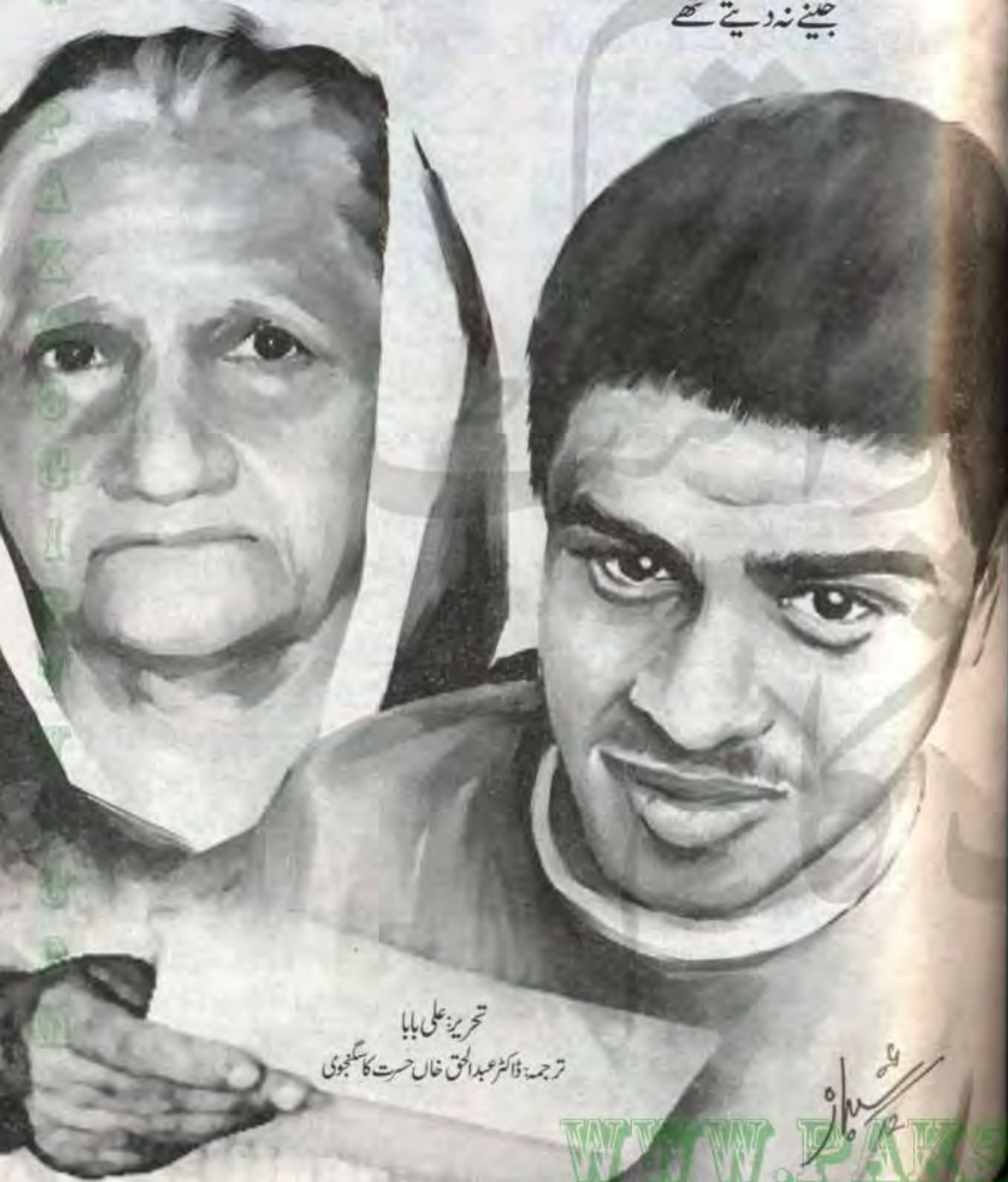
وہ جج سے انتقام لینے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جج کو قید کر کے اسی پنجرے میں بند کر دے گا جس میں اس کی ماں بند کی گئی تھی۔ ایک دن اسے اچانک معلوم ہوا کہ جج چھٹیاں منانے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ساحل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔

جج ہڈانگو، ساحلی قصبے کی طرف جا رہا تھا، ایک سرائے میں مخبروں نے اطلاع دی کہ ودال اس سے انتقام لینے کے لیے چل پڑا ہے۔ سرائے میں جج کے ساتھ اتنے سپاہی نہیں تھے جو ودال کے گروہ کا مقابلہ کر سکتے البتہ جج کی کار بہت تیز رفتار تھی، وہ ودال کی آمد سے قبل اگلے قصبے تک پہنچ سکتی تھی اور شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن افسوس، جج کے دن پورے ہو چکے تھے۔ جج اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے شب و روز جاگتا رہا تھا، قصبے کے مظاہرین کی آہ و زاری، سرکاری ملازموں کی ہڑتال اور جوana کی خودکشی سے اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ڈرائیونگ کے دوران اس کی حرکت قلب بند ہو گئی اور وہ راستے ہی میں چل بسا۔

کار تھوڑی دُور جا کر سڑک سے نیچے اتری اور ایک گڑھے میں پھنس گئی۔ جج کی بیوی کا سلا حواس باختہ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر جلد ہی اسے صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا شوہر اس سے کافی بڑا تھا اور کا سلا کو خدشہ تھا کہ وہ کہیں جلد بیوہ نہ ہو جائے لیکن اسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ سانحہ اس طرح اچانک پیش آجائے گا۔

نظامو

ایک نور چشم کا ماحبرا
وہ عزت سے جینا چاہتا تھا
اور اس کے اپنے اسے
جینے نہ دیتے تھے



تحریر: علی بابا
ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی

www.PAKSOCIETY.COM

کاسلا کی مترنم آواز نے اسے چونکایا۔ ”ودال! تمہارا دشمن
مر چکا ہے، میں اس کی بیوہ ہوں۔“ اس نے کچھ توقف
سے کہا ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہاری ماں کو
بچانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

”کیوں کی تھی؟“ ودال نے پوچھا۔
”اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ کاسلا
بے خونی سے ودال کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ دشمن کی
بیوی سے یہ الفاظ سن کر ودال کے اندر کی دنیا زیر و زبر
ہو گئی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت نے اس سے
اظہار محبت کیا تھا لیکن ودال کو فوراً کاہنہ کی پیشین گوئی یاد
آگئی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

کاسلا نے ودال کی آنکھوں میں شک کے سائے
دیکھے۔ اس نے فیصلہ کیا وہ اپنے بچوں کی حفاظت اور
ودال کو گرفتار کروانے کے لیے آج تمام حدیں عبور کر
جائے گی۔ ایک دم آگے بڑھ کے اس نے ودال کا گریبان
پکڑ لیا۔ ”ودال! میں تمہیں چاہتی ہوں۔ دیکھو، میرا بڑھا
شوہر مردہ پڑا ہے۔ میں اس کی لاش کے سامنے تم سے
محبت کا اقرار کر رہی ہوں۔ ودال! ودال! میرا اعتبار کرو۔“
وہ ایک پری چہرہ، حسین و جمیل عورت تھی۔

آخر ودال نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے
لگا لیا۔ اتنے میں کاسلا کو گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔
کمک پہنچ گئی تھی۔ کاسلا نے لمحے بھر کے لیے اپنے متونی
شوہر سے ودال کا موازنہ کیا۔ اسے دل میں ودال کے لیے
رحم کی ایک لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے بولی۔
”ودال! ودال! وہ لوگ آگئے۔ جاؤ، تم چلے جاؤ۔“
مگر اب جانے کا وقت نہیں تھا۔

ودال نے چہرہ اوپر اٹھایا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ
تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ اس نے کہا ”کاسلا! آہ...“
وہ عورت تم ہو جو میری موت کا باعث.....“
۵ منٹ بعد سرکاری دستے ودال کی لاش اٹھا رہے
تھے۔ کاسلا نے دیکھا کہ ودال کی آنکھوں میں اب بھی
آنسو موجود ہیں۔

ودال کے گھوڑے مسلسل تعاقب میں تھے اور کار
بیکار ہو چکی تھی۔ کاسلا بے حد فکر مند تھی۔ اپنے بچوں کو
ودال کے قہر و غضب سے بچانا تھا۔ جج نے سرائے سے
روانگی سے قبل کمک کے لیے پیغام بھجوا دیا تھا لیکن اب مدد
کے انتظار کا وقت نہیں بچا تھا۔ کاسلا نے عزم کر لیا کہ جیسے
بھی ممکن ہو، اسے اپنے بچے محفوظ رکھنے ہیں۔

اس نے کار سے اتر کے ۲ بچوں کو سینے میں بھر لیا
اور ایک بچہ پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔ کاسلا نے تینوں
بچوں کو قریبی پہاڑی کی ایک کھوہ میں چھپا دیا۔ اس نے
ارد گرد دیکھا کہ کوئی جانور تو نہیں ہے۔ کاسلا نے بچوں
کو پیار کیا۔ اسے کتوں سے زیادہ خطرہ ودال کے آنے
کا تھا۔ کاسلا نے بچوں سے کہا۔ ”کچھ دیر میں مدد آتی
ہوگی۔ اس وقت تک چاہے کچھ ہو جائے، غار سے باہر
مت آنا، چاہے تمہیں میری چیخیں سنائی دیں تب بھی
مت آنا، سمجھ گئے؟“

کاسلا پہاڑ سے اتر آئی اور کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ
کر ودال کا یا کمک کا انتظار کرنے لگی۔

زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، جلد ہی دور سے دھول
اڑتی دکھائی دی، ساتھ ہی بہت سے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی
گونجیں۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈرتھا۔

ودال کے مسلح سواروں نے گاڑی گھیر لی۔ کاسلا نے
چہرے پر زخموں کے نشانات سے ودال کو پہچان لیا۔
ودال نے گاڑی کے قریب پہنچ کے اپنے سواروں کو
وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ سوار چلے گئے۔ ودال اکیلا
کاسلا کے پاس رہ گیا۔ کاسلا جانتی تھی کہ اب موت سے
زیادہ شدید صدمے کا سامنا ہے۔

ودال، جج بڈانگو پر نظر پڑتے ہی سمجھ گیا کہ وہ انتقام
کی دسترس سے بہت دور چا چکا ہے۔ اب اس کے سامنے
دشمن کی جوان بیوی موجود تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ
کھولا اور کاسلا کی نزاکت سے انداز لگا لیا کہ اسے پستول
ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے پستول
گھوڑے کی زین سے لگے ہوئے تھیلے میں ڈال دیا۔ معا

کوشش کے باوجود بھی تیز نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ میں لنگ تھا۔ کہتے ہیں بچپن سے ہی کوٹھے کی ہڈی ایک طرف کوٹھکی ہوئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا تو چاند گرہن سے متاثر ہوا تھا۔ بہر حال اس کی ایک ٹانگ میں نمایاں فرق تھا۔ وہ جب چلتا تھا تو یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ اس کی حالت بھی کچھ عجیب عجیب سی تھی۔ تھکا تھکا، اداس اداس، مریضوں کی طرح۔ اسے دیکھتے ہی ترس آنے لگتا تھا۔ وہ ہمارے گڈز آفس میں سیزمین تھا۔ معصوم چہرہ، بونا سا قد، نحیف ولاغر جسم۔ دور سے دیکھنے پر وہ ۱۲، ۱۵ سال کا لڑکا ہی معلوم ہوتا تھا۔ سارا دن کام میں گھٹا رہتا تھا۔ وہ کابلوں کی طرح کبھی نہیں بیٹھا لیکن نہ جانے کیوں سارا دن اسے جھڑکیاں ہی ملتی تھیں۔

”ارے اونظامو کے بچے! جا ایک سیر برف تو لے آ۔“

”ارے وہ سیزمین کہاں مر گیا! اس سے کہو جا کر دو لفافے لے آئے۔“

”ارے نظامو دوڑ کر یہ تار دے آ اور واپسی پر گھر سے کپڑے لا کر دھو بی کو دے دینا۔ جا جلدی جا! کیا رینگ رینگ کر چیونٹی کی چال چلتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے دفتر میں کوئی چیرا سی تھا ہی نہیں اس لیے سارے اوپر کے کام بھی نظامو کو ہی کرنا پڑتے تھے۔ ایک کام ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ دوسرا کام تیار ہوتا تھا۔ اے لو..... کہاں مر گیا تھا تو، جا یہ میموی ٹی او کو اور یہ ڈبلیو ایف او کو دے کر آ۔ واپسی پر گھر سے میرا کھانا لیتے آنا۔ اے او..... میری بات سن بھی رہا ہے اور یہ تو انک انک کر چلتا کیسے ہے۔ جا جلدی کر ایک میموی نے میں ہی سارا دن لگا دیتا ہے۔“

موسلا دھار بارش ہو رہی ہو یا آسمان سے آگ برس رہی ہو، آندھی ہو یا طوفان، نظامو کے فرائض اور جھڑکیوں میں کبھی کمی نہیں آتی تھی۔ وہ سارا دن پسینے میں شرابور لنگڑا لنگڑا کر چلتا رہتا، کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ یہاں

تک کہ رات کے ۱۰/۱۱ بج جاتے۔ میں نے کئی دفعہ اسے اپنا میلا سا تولیہ دیا تا کہ وہ جب دھوپ میں باہر جائے تو سر پر ڈال لے۔ کبھی کبھی وہ تولیہ اپنے پیٹ سے باندھ لیتا تھا۔ کہتا تھا پیٹ میں سخت تکلیف محسوس کرتا ہوں کبھی کبھی تو وہ اپنے پیٹ کی تکلیف سے رونے لگتا تھا۔ نہ جانے کیا بیماری لگ گئی تھی، دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

مجھ سے اس کی دوستی تھی۔ جب بھی اسے کوئی بات پوچھنی ہوتی تو وہ مجھ سے پوچھتا تھا۔ گھر سے خط آتا تو مجھ سے ہی پڑھواتا۔ دفتر کے معاملات میں بھی وہ مجھ سے مشورہ لیتا اور جب کوئی مسئلہ یا بات اس کی سمجھ سے باہر ہوتی تو وہ مجھے اپنا رازدار سمجھ کر پوچھتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ ”بابو جی! یہ لوگ اوور ٹائم کیوں نہیں دیتے، صبح ۸ بجے آتا ہوں اور رات کو ۱۱ بجے تک کام کرنا ہوں۔“ میں کیا جواب دیتا، میں بھی ملازم ہی تھا۔ کبھی کبھی کہتا ”بابو جی! یہ بڑا صاحب نہایت حقارت سے ناک سکیڑ کر کلک آؤٹ کر دوں گا، کلک آؤٹ کر دوں گا، کیا کہتا ہے؟“ کبھی کبھی تو اس کے مسلسل سوالوں پر مجھے ہنسی بھی آ جاتی تھی اور بعض اوقات اس کے سوالات اتنے تھکے، کڑوے، کیسے اور طنز سے بھرپور ہوتے تھے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے پاتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے غیر معمولی طور پر زیادہ خوش نظر آیا۔ وہ شاید تنخواہ کا دن تھا۔ نہ جانے کس نے اس کی کھوپڑی میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ تنخواہ بڑھ رہی ہے۔ تنخواہ بڑھنے کے تصور سے ہی اس کے چہرے پر خوشی چھلک رہی تھی۔ کہنے لگا ”بھائی، آج تو فلم دیکھیں گے! سنا ہے ٹیکسی ڈرائیور اچھی فلم ہے۔“

اور کچھ دیر کے بعد جب وہ تنخواہ لے کر آیا تو اس کا چہرہ اٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ بے جان سے تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ ”تنخواہ بڑھتا تو الگ رہا اٹنے میرے ۲۰ روپے کاٹ لیے۔ میری تو حاضریاں بھی پوری تھیں۔“ میں نے اسے بتایا کہ ۲ ماہ سے جو واشنگ الاؤنس مل رہا تھا، وہ کاٹ لیا ہے۔ لیکن اس بے چارے کو اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔

دفتر میں سب کا خیال تھا کہ نظامو کوئی بی ہو گئی ہے۔ جوں ہی یہ بات پھیلی اسے دفتر کے منگے سے پانی پینے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسے ٹی بی یا اس قسم کا کوئی اور مرض نہیں تھا۔ میں ہی کیا سب کو معلوم تھا کہ اسے کون سی بیماری ہے اور اس بیماری کا کیا علاج ممکن ہے۔ لیکن ہم میں سے کسی کو اس بات پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہم لوگ اسے یہ مشورہ تو دیتے تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤ ورنہ مر جاؤ گے اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب بھی اس کے پیٹ پر تولیہ دیکھا تو مجھے بھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں یہ مجھ سے پیسے نہ مانگے۔ وہ میرے علاوہ کسی اور سے اس درجہ فری نہیں تھا۔ ”بابو جی! آج تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ ۲ روپے دے دو تنخواہ کے دن واپس کر دوں گا۔“ وہ اس طرح معصومیت کے ساتھ کہتا کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ تنخواہ کے دن یہ پیسے واپس نہیں کرتا تھا۔ وہ پیسے پابندی کے ساتھ واپس کر دیتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ میرا حال بھی کچھ زیادہ ہی پتلا تھا۔

ایک دن ہمارے دفتر کا سارا عملہ جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ ہم دونوں ہی رہ گئے۔ کوئی کام بھی نہیں تھا اس لیے مزے سے دفتر کی میز پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کے کش لینے لگا اور ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھنے لگا۔ نظامو بیٹیوں والی کاپیوں پر اداس بیٹھا تھا اور ٹھنڈی سانس لے رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نے مارا ہے۔ کوئی دن ہو گا جب اس کی ایسی حالت نہ ہوئی ہو۔ میں نے بھی اس کے چہرے پر سکون نہیں دیکھا۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بولا۔

”بابو جی! اب اس نوکری سے جی کھنا ہو گیا ہے۔ آج پھر بڑے صاحب نے چارج شیٹ دی ہے۔ میں بھلا کوئی پڑھا لکھا ہوں جو یہ روز روز چارج شیٹ کا جواب لکھتا رہوں۔“

”آج کس بات پر چارج شیٹ ملی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا ”انھوں نے مجھے روٹی

کے بوروں پر سوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دیکھو نا بھائی! میں بھی آخر انسان ہوں۔ صبح ۸ بجے کام پر آتا ہوں، رات کے ۱۰، ۱۱ بج جاتے ہیں..... آخر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟“

”جس دن چھٹی ہوتی ہے اس دن بھی مجھے آنا پڑتا ہے ذرا سی دیر ہو جائے تو ہزاروں باتیں سناتے ہیں اور یہ چارج شیٹ تھما دیتے ہیں۔ میں ان روز روز کی باتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے نوکری چھوڑ دوں۔“

”پھر کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا اور میں ہی اس کے گھر کے خط پڑھ کر سناتا تھا لہذا میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”پگلے! ایسا خیال بھی دل میں مت لانا۔ آج کل نوکری مشکل سے ملتی ہے اور پھر تم اکیلے تو ہو نہیں۔ ۷ افراد اور بھی کھانے والے ہیں۔ ان کے ہی بارے میں سوچو۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹ آئے۔ ”پھر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟ جینے کیوں نہیں دیتے؟.....“ وہ رونے لگا اور روتے روتے اپنا سر سامنے میز پر رکھ دیا اور منہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ اس کے رونے اور ہچکیوں میں عجیب کیفیت تھی۔ عجیب درد تھا۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن میں کسی کام سے حیدر آباد چلا گیا۔ ۳ دن کے بعد جب واپس آیا تو دفتر میں دیکھا کوئی اور لڑکا کام کاج میں مصروف ہے۔ اس بات کا مجھے بعد میں علم ہوا کہ نظامو نے سیل لگانے کے لیے کسی بیوپاری سے پیسے مانگے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی کئی شکایتیں تھیں۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔

کافی دن گزر گئے۔ نظامو کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ایک دن میں ساتھیوں میں بیٹھا تھا اور نظامو کی مجبوریوں اور پریشانیوں پر افسوس کر رہا تھا تو ایک دوسرا بابو چڑ گیا تھا ”ارے تم نہیں جانتے اس کو..... ہم سب سے زیادہ کماتا تھا۔ قسم خدا کی وہ سیل لگانے کا ایک

اللہ کے بعید وہی جانے



ایک ہسپتال کا ماحبرا

۱۳ پردوں میں چھپے راز کو ایک ڈاکٹر نے ماننے سے انکار کر دیا تھا وہ نہیں جانتا تھا ناممکن انسانوں کے لیے ہوتا ہے، انسانوں کے خالق کے لیے نہیں

نوید اسلم صدیقی

خاص طور پر روزانہ آپ نے مانگنی ہے کہ اللہ مجھے بیٹا دے۔ یورپ جا کر ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر سے چیک کرایا تو اُس نے بتایا کہ ۴ ماہ بعد آپ کو اللہ اولاد کا تحفہ دے گا اُس وقت تک آپ نے باقاعدگی سے ہر ماہ یہاں آکر معاینہ کرانا ہے۔ میں بیٹی کے کہنے کے مطابق ہر نماز کے بعد نوا سے کے لیے دعا کرتا رہا۔ مجھے گھر والوں نے بتایا ہی نہیں کہ ہسپتال والوں نے الٹرا ساؤنڈ کر کے بیٹی زریںہ کے کارڈ پر لکھ دیا 'لڑکی'۔ گھر والوں نے مجھ سے یہ بات بالکل چھپائے رکھی اور میری دعاؤں کا سلسلہ چلتا رہا۔ گھر والوں نے لڑکی کے پانچ چھ جوڑے سی کر کسی کے ہاتھ دتی بھیج دیے لیکن مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ گھر والوں نے داماد اور بیٹی کو بھی منع کر دیا کہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ سب اہل خانہ کا خیال تھا کہ اگر مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں بلاوجہ پریشان ہوں گا۔

کچھ عرصہ قبل ایک شادی کی تقریب میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، حضرت کا نام محمد سلیم تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کی بیٹی کی شادی گزشتہ سال ہوئی تھی، دولہا میاں غالباً جرمنی (یورپین ملک کے نام کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ دلہا میاں مختلف ممالک فرانس، اٹلی، سچینم وغیرہ میں بھی رہتے رہے اور گفتگو کے دوران ان کے سر گئی ممالک کے نام لیتے رہے) سے آئے تھے۔ شادی کے فوراً بعد شوہر تو فوری طور پر واپس یورپ چلے گئے، بیوی کا پاسپورٹ اور ویزہ بننے میں چند ماہ لگ گئے، بعد میں وہ بھی یورپ چلی گئی۔ یورپ جانے سے قبل بیٹی میرے پاس آئی اور کہنے لگی آپ نے اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا ہے اور ایک دعا

کچھ اس طرح تھا:

”نور چشم نظام الدین! خدا تجھے خوش رکھے۔ اس سے پہلے میں ایک خط روانہ کر چکی ہوں لیکن تُو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں پریشان ہوں۔ تمہارے چھوٹے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ غالباً میعادِ بخار ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگیں گی ورنہ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

بیٹا کسی نہ کسی سے ادھار ادھار لے کر کچھ پیسے بھیج دو۔ بیماری تو ہے لیکن گھر کا حال یہ ہے کہ آج صبح سے مین سب کا فاقہ ہے۔ کلو دکان دار نے ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس دفعہ کچھ کفایت سے کام لینا کچھ زیادہ پیسے بھیجنا۔ دکان دار کا قرضہ زیادہ ہو گیا ہے اور بھی گھر کے دوسرے خرچ ہیں۔ تیری بڑی بہن کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ تیرے چاچا کا ہم لوگوں سے غیروں کا سا برتاؤ ہے پھر بتا ہم غریبوں کی بیٹی انھیں کیوں پسند آئے گی۔ تم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ تم ٹھیک نہیں ہو میں اور بھی بے چین ہو گئی۔ بیماریاں سب ہی خطرناک ہوتی ہیں، توجہ کرنا، دوا دارو کرنا۔ تمہیں دیکھے بہت دن ہو گئے اگر تنخواہ نہ کاٹیں تو کسی دن آکر منہ دکھا جاؤ۔ اپنے بیمار بھائی اور آلے کے لیے پیسے جلد روانہ کرنا فقط تمہاری ماں۔“

نظامو کا مسئلہ معاشرے کا عام مسئلہ ہے۔ نہ جانے کتنے نظاموروز اس مسئلے کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ میرے پاس نظامو کے لیے ہمدردیاں تھیں، آنسو تھے جس کی اسے ضرورت نہیں تھی اس کا مداوا کیا کرتا۔ میں تو خود ایک نظامو ہوں۔ ایک ایسا نظامو جس نے اپنے سفید کاروں کی عزت رکھنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔

روپیہ لے لیتا تھا۔“

”میں نے ہمدردی سے کہا تھا یار! تم لوگ تو یوں ہی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ وہ بے چارہ تو کبھی کبھی فاقے بھی کرتا تھا۔“ میری اس بات پر میرا ساتھی اچھل کر بولا ”یار! تم بھولے بھالے آدمی ہو، تمہیں کیا پتا وہ تو لوڈنگ تک کے پیسے کھا جاتا تھا۔ جو بھی نیا بیوپاری آتا کہتا نکال پیسے تیرا مال سب سے پہلے لوڈ ہوگا۔ سب سے پہلے جائے گا۔ میں جو اس سے جلتا تھا اس کی وجہ تھی۔ بڑا کمین تھا وہ۔“ تھوڑی دیر بعد وہ بولا ”تمہیں یاد نہیں شاید جس دن وہ بابو بھائی سے باتیں بنا رہا تھا اور انھوں نے غصے میں اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا تھا۔“

اس پر جتنے لوگ موجود تھے سب نے نظامو کو برا بھلا کہا کچھ نے تو گالیاں دیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ مجھے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جواب تک میرے پاس موجود ہے۔ کہتے ہیں دوسروں کا خط پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ اس بات کا میں مجرم ہوں، اس لیے آپ سے بھی نہیں چھپاتا۔ اس کا خط میں نے پڑھا۔ یوں تو وہ خط مجھ سے ہی پڑھواتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا خط پڑھنے میں ملامت محسوس نہیں کی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس خط میں کوئی بھی ایسی انوکھی بات نہیں جسے آپ کا ضمیر سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ ایک دکھی ماں کے دکھ بھرے الفاظ ہیں۔ نہایت سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ ملک کے کروڑوں انسانوں کی درد بھری کہانی جس کو ہم سب بخوبی جانتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ہم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ نظامو کی ماں کا خط

مصنف علی بابا، بلوچوں کے رند قبیلہ میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ بابا سندھی زبان میں جدید طرز کی مختصر کہانیاں لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی لکھی حقائق پر مبنی یہ کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

☆ ☆ ☆ مترجم ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسٹلوی ہیں۔ سندھ فیکسٹ بک بورڈ میں سینئر ماہر مضمون کے عہدہ پر فائز رہے۔ سندھی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ اور مہارت رکھتے ہیں کہ ان کے تراجم پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

ایک آبائی لہر کا ماحبرا
جو خوشی کے بجائے پریشانی کا باعث بن گیا تھا
مشکلات اگر سنگل ہیں تو اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آتے ہیں

پہلا گواہ

توقیر عائشہ

بھائی

صاحب کا فون آیا تھا۔ ان کے جانے کی تاریخ آگئی ہے۔ اس مہینے کی ۲۵ ہے۔ وہ پوچھ رہے تھے کیا مشورہ کیا۔“ نازیہ نے طاہر کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بھئی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنی بڑی آفر قبول کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”اچھا ایسا کرتے ہیں شام کو ان کی طرف چلتے ہیں۔ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے گا۔“ نازیہ نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

نازیہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی جمال نے جو ابھی نئے نئے روزگار پر لگے تھے بڑی ذمہ داری کا احساس کیا اور چھوٹے بھائی اور بہن کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ایسے میں ماں کی بے شمار دعائیں انھیں کیوں نہ لگتیں، ہر گزرتا دن انھیں معاشی طور پر مستحکم کرتا گیا۔ چھوٹے بھائی کو پیروں پر کھڑا کیا اور اس کے گھر بار کا بھی بندوبست کر دیا۔ ماں نے اب انھیں بھی گھر بسانے پر آمادہ کر لیا۔ خدا کی مہربانی سے شائستہ ان کی زندگی میں رونق افروز ہو گئیں۔ وہ نام ہی کی نہیں طور اطوار کی بھی شائستہ ثابت ہوئیں۔ گھر میں ان کا اضافہ بہت ہی خوشگوار ثابت ہوا۔ مگر اب ماں کو بیماریوں نے گھیر لیا اور وہ جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

نازیہ کو سب کی بڑی محبتیں ملی تھیں۔ لیکن اب امی کے نہ ہونے سے بھائیوں کو نازیہ کا فرض ادا کرنے کا احساس بہت بڑھ گیا۔ گھر میں بہترین معاشی حالات ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ رشتے کی طلب میں آتے لیکن ان کی لالچ اور کچھ حاصل ہونے کی خواہش ان کی گفتگو سے ٹپک پڑتی اور جمال بھائی انھیں چلتا کرتے۔ ایسے میں ان کی نظر انتخاب خاندان کے ایسے نوجوان پر پڑھری جو مناسب تعلیم اور روزگار کا حامل تھا۔ آمدنی جمال بھائی سے تو کم ہی تھی لیکن ایک مناسب معیار کی زندگی

آرام سے گزاری جاسکتی تھی۔ خاندان کے دیگر اراکہ جمال بھائی کے کمزور وغیرہ بے وجہ احساس کمتری کے ساتھ یا کسی لالچ میں جمال بھائی کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ نوجوان برابری اور وقار کے ساتھ ملتا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب پلہ تھا۔ خرابی تھی تو بس ایک کہ وہ شادی شدہ تھا۔ اور بات تھی کہ بیوی چند ماہ ساتھ نبھانے کے بعد خلع کر چلی گئی تھی۔ اولاد بھی کوئی نہ تھی۔ علیحدگی کی وجوہات جمال بھائی سے پوشیدہ بھی نہ تھیں۔ انھیں طاہر سے ہمدردی محسوس ہوتی۔ بیوی اور بھائی کے سامنے انھوں نے بات رکھی تو کسی کو اعتراض نہ ہوا۔ ڈر نازیہ کا تھا کہ کہیں انکار نہ کر دے۔ مگر شائستہ بھابھی نے اس طرح نازیہ سے بات کی کہ وہ بھی راضی ہو گئی۔

دوسری طرف طاہر کا بھی ایک پس منظر تھا۔ طاہر والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ طاہر کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ کچھ شادی شدہ تھے۔ تعلیم کے بعد طاہر والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا تھا۔ آمدنی اتنی تھی کہ درمیانے درجے کی آبادی میں ایک ون یونٹ بنگلہ اپنی رہائش کے لیے بنا لیا تھا۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ بھائیوں میں محبت قائم رکھنی ہے تو اپنی اپنی رہائش الگ ہونی چاہیے۔ انھوں نے طاہر کا گھر آباد کیا لیکن وہ مکان گھر نہ بن سکا۔ میکے کا اصرار اور خود فرح کی امریکا سین ہونے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ چند ماہ سے گھر سے دور رہ سکے۔ تو اب بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی طاہر اکیلا تھا۔ خوش مزاجی طبیعت کا حصہ تھی۔ زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ اس رشتے کو طاہر کے اہل خانہ نے بھی پسند کیا اور یوں سب کی دعاؤں میں نازیہ طاہر کے گھر میں آن بسی۔

جمال بھائی کو کینیڈا میں بہت اچھی ملازمت ملی تھی۔ جس میں انھیں اپنے اکلوتے بیٹے کی تعلیم اور مستقبل کی جھلک نظر آرہی تھی۔ لہذا انھوں نے وہاں سے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اس آبائی گھر سے بچیں اور نہ ہی کرائے پر دیں۔ بلکہ اپنی پیاری

بہن اختیار کرنے کے لیے کہیں۔ کرایہ وصول کرنے کی انھیں کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔

نازیہ اور طاہر کی بیٹی بیٹا بھی چھوٹے تھے۔ یہ بنگلہ جو طاہر نے شوق سے بنایا تھا اب اس کی مقامی آبادی میں غلط طبقے کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی کے کونے پر آٹو درکشاپس کی ڈھیروں دکانیں کھل چکی تھیں۔ سارا دن گاڑیوں کا شور رہتا۔ ان کے قریب ہی کسی وگین کا آفری شاپ تھا۔ نازیہ طاہر سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اب میں رہائش بدل لینی چاہیے۔ بھائیوں کی پیشکش میں سے بڑا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ آج جمال بھائی نے ان دونوں کو اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔

حسب وعدہ مغرب کے بعد طاہر اپنی فیملی کے ساتھ جمال بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ ”طاہر میاں! ہمارے اوپر مہربانی کرو اور ہمارے گھر میں رہ لو۔“

شائستہ نے مذاق میں کہا ”بھئی جو تنخواہ چوکیدار مانگ رہا ہے وہ تم کو ہی دے دیں گے۔“ سب ہی ہنس پڑے۔

جمال بھائی نے بات آگے بڑھائی۔ ”ہم اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے تم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تم بھی اپنے بچوں کے بارے میں سوچو۔ آج تمہارا اسد چھوٹا ہے۔ کل گلی میں کھیلے گا۔ کیسے کیسے دوست بنائے گا۔ ہماری گویا سکول کالج جائے گی۔ انہی رستوں سے گزرے گی۔ اب ماحول پہلے جیسا نہیں رہا۔ تم یہاں رہائش اختیار کرو۔ اپنے گھر کو فروخت کر کے اسی علاقے میں پلاٹ لے کر ڈال لو۔ یہاں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ تعمیر کرتے رہنا۔ تمہیں بہتر ماحول میسر آجائے گا۔ ہماری بہتری اسی میں نظر آرہی ہے۔“ جمال بھائی نے نکتہ سے کہا۔

طاہر کو گویا کیفیت میں تھا۔ بات تو درست تھی اور اس کے مفاد میں تھی۔ منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہ تھا۔ انھیں چھپے خلوص نے طاہر کو قائل کر ہی لیا۔

جمال بھائی جا چکے تھے۔ نازیہ اور طاہر شفننگ میں بیٹھے۔ اپنا گھر خالی کرتے ہوئے طاہر کو عجیب سا لگ

رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک وہ دن آگیا۔ جب فرح کے بھائی علیحدگی کے بعد فرح کو دیا جانے والا جہیز اٹھا کر لے جا رہے تھے اور بدلے میں ایک سناٹا اور وحشت چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن اب میں اور تب میں کتنا فرق تھا۔ نازیہ کے خاندان میں شامل ہو کر وہ ہر لحاظ سے پُرسرت زندگی گزار رہا تھا۔

اب وہ مرحلہ آیا کہ اپنا بنگلہ فروخت کرے۔ امید تھی کہ ایک دو ماہ میں اس کام سے بھی فراغت ہو جائے گی مگر..... طاہر نے قریب کے اسٹیٹ ڈیلرز کے پاس تمام معلومات رکھوا دیں۔ دونوں میاں بیوی اس گھر میں آنا جانا رکھتے کہ کوئی خالی گھر میں کھس کر ہی نہ بیٹھ جائے۔ چوکیدار رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ وہ کوئی غیر قانونی کام نہ شروع کر دے۔ گیس، بجلی کے بل باقاعدگی سے بھرتا حالانکہ اسے اب جمال بھائی والے گھر کے بل بھی ادا کرنے ہوتے تھے۔ اس نے اخبارات میں اشتہار دیے۔ پارٹیاں آتیں جو قیمت لگاتیں وہ طاہر کو پسند نہ آتی۔ اچھی قیمت کے چکر میں وہ گاہک لوٹا دیتا۔ اچانک وہاں جاسیدادوں کی قیمت گرنے لگی۔ جتنی قیمت شروع میں مل رہی تھی اب اُس سے کہیں کم دام مل رہے تھے۔ گاہک تو اب بھی آ جاتے تھے۔ طاہر نے کم قیمت پر ہی دل کو آمادہ کر لیا۔ کیونکہ آئے دن یہاں کی حاضری اور بلوں کی ادائی روزمرہ کے معمولات اور بجٹ کو متاثر کر رہی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ سودا ہوتے ہوتے رہ جاتا۔ بیعانہ، لین دین تک نوبت آ جاتی پھر کوئی ایسا مسئلہ آڑے آ جاتا کہ معاملہ ٹھپ ہو جاتا تھا۔ طاہر چڑچڑا ہو چلا تھا۔ موجودہ رہائش کے قریب ایک بہت اچھا پلاٹ مناسب قیمت پر مل رہا تھا۔ امید تھی کہ رقم ملتے ہی اس پلاٹ کو لے لے گا۔ مگر وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ آپ کرائے پر چڑھا دیتے۔ جب ہم کہیں جانے کا پروگرام بناتے ہیں آپ گھر کے چکر میں نکل جاتے ہیں۔ بچے گھر میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ نازیہ نے تنگ آ کر کہا ”ہاں تاکہ کرائے دار ہی قبضہ کر کے

بیٹھ جائے۔“ طاہر کا جواب ہوتا۔ یوں اس کا دل کبھی یکسو نہ ہوتا۔ ایسے میں ایک دن اس کا پرانا دوست سرور آفس میں ملنے چلا آیا۔ باتوں باتوں میں مکان کی فروخت کا ذکر نکل آیا۔

”کیا بتاؤں؟ خدا کو کیا منظور ہے؟ میں مکان کے چکر میں کہاں کہاں نہیں گیا؟ مگر پکٹتا ہی نہیں۔“ طاہر نے اپنے دوست سے کہا۔

سرور نے کہا ”خالی گھر میں تو جن بسیرا کر لیتے ہیں۔ تم نے کسی بابے کو بھی دکھایا؟“

”کیا بات کرتے ہو یا! تم کو پتا ہے کہ میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ اب تم عامل کامل کے پاس جانے کا مشورہ دو گے۔“ طاہر نے کہا۔

سرور نے کہا ”عامل کامل تو نہیں لیکن اسی شہر میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو چٹکی بجاتے مسئلہ حل کرتے ہیں مگر تم اس پر بھی شک کرو گے۔“ سرور نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں وہ کہے گا، کونوں میں تعویذ دباؤ۔ یہ پانی چھڑکو وغیرہ۔“ طاہر نے بے زاری سے کہا۔

”نہ نہ ایسا کچھ نہیں۔ وہ ایک اسکالر ہیں اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ وہ صرف لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں۔ شاید تمہیں بھی کوئی مفید مشورہ مل جائے۔“ سرور نے طاہر کو رضامند کر ہی لیا۔

☆☆

سرور نے ٹائم لے لیا تھا اور اب وہ رحمانی صاحب کے دروازے پر تھے۔ ایک تیزدار چوکیدار نے انہیں اندر بٹھایا۔ لائبریری جیسا ماحول تھا۔ ملاقاتیوں کے لیے شاندار صوفہ سیٹ بھی موجود تھا۔ دو ہی منٹ بعد درمیانی عمر کے ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ سفید چائنا ٹوپی باریش چہرے پر بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سرور سے واقف تھے۔ سرور کئی افراد کو ان کے پاس لا چکا تھا اور سب ہی مطمئن ہو کر گئے تھے۔ سرور نے طاہر کا تعارف کرایا اور بتایا کہ مکان کی فروخت میں ناقابل یقین حد تک رکاوٹ آ جاتی ہے۔

رحمانی صاحب نے طاہر سے کہا ”میں آپ سے سوالات کروں گا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض سے کرتا ہے آپ انہیں تو محسوس نہ کریں گے؟“

”نہیں میں تو آیا ہی اسی لیے ہوں کہ میرا مسئلہ حل ہو جائے آپ جو پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔“ طاہر کا جواب تھا۔

انہوں نے تعلیم، روزگار، رہائش وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ پھر شادی کے بارے میں پوچھا۔ طاہر نے بتایا کہ ”میں شادی شدہ ہوں البتہ یہ میری دوسری بیوی ہیں۔“

رحمانی صاحب نے پوچھا ”پہلی بیوی کہاں ہیں؟“ طاہر نے کہا ”اب یہ تو مجھے علم نہیں کیونکہ انہوں نے شادی کے سال بھر کے اندر ہی خلع لے لیا تھا۔ دراصل اپنے والدین کے پاس امریکا سیٹ ہونا چاہتی تھیں اور میں اس پوزیشن میں نہ تھا۔“ طاہر نے وضاحت سے جواب دیا۔

”اچھا! اچھا!..... آپ موجودہ شادی سے مطمئن ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں! اس خاندان نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”جو مکان آپ بیچنا چاہتے ہیں اس میں آپ نے کتنا عرصہ قیام کیا؟“ اگلا سوال تھا اور جواب تھا ”۸ سال۔“

رحمانی صاحب نے پوچھا ”اس مکان پر کوئی قرضہ ہے؟“

طاہر نے جواب دیا ”جی ہاں تھا۔ لیکن اب سب لے کر دیا گیا ہے۔“

”آپ نے یہ مکان کسی کو گفٹ تو نہیں کیا۔“ رحمانی صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں! میں نے اپنی بیوی کو دیا ہے۔“ طاہر نے بتایا۔

رحمانی صاحب نے فوراً ہی پوچھا ”کون سی بیوی؟ پہلی یا دوسری؟“

طاہر گڑبڑا گیا۔ فوری طور پر جواب سمجھ میں نہ آیا۔

”وہ جی میری پہلی شادی تھی اور خیال بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ میں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ شادی کی خوشی تھی اور وہ جذباتی سا دور تھا۔ کوئی باقاعدہ دستاویز تو نہیں بنی تھی۔“

رحمانی صاحب نے آگے کا نقشہ کھینچا۔ ”پھر حالات بدل گئے۔ پھر نئی آجانی سے آپ کے اور ان کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟“

”جی ہاں۔“ طاہر نے مختصراً کہا۔

”انہوں نے کبھی اس بات کا مطالبہ کیا کہ یہ مکان تو میرا گفٹ ہے۔“ رحمانی صاحب نے اب یہ سوال کیا۔

طاہر نے کہا ”نہیں۔ وہ پیپر تو کاغذات میں کہیں اب گیا۔ نہ انہوں نے کبھی مطالبہ کیا نہ میں نے اس پر کبھی سوچا اور پھر وہ جلد ہی ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔“

”پھر آپ کی شادی ان خاتون سے ہو گئی اور آپ نے انہیں بھی یہ ہی مکان گفٹ کر دیا۔“ رحمانی صاحب نے بات مکمل کی۔

”جی ہاں۔“ طاہر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ اب مسئلہ ایک تیار رخ اختیار کر رہا تھا جس کے تمام زاویے ایک ہی منہ میں ہونے کے ناطے طاہر پر عیاں ہو رہے تھے۔

رحمانی صاحب نے ایک لمبی ہوں کی اور کہا ”میرا خیال ہے آپ بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ آپ نے ایک تحفہ کسی کو دیا اور پھر اس سے پوچھے بغیر وہی تحفہ کسی اور کو دے دیا۔ مکان کا فروخت نہ ہو سکتا اس بات کی علامت ہے کہ وہ چیز دراصل آپ کی ملکیت نہیں۔ ہر وعدے کا پہلا گواہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے چاہے وہ زبانی ہو یا کاغذات پر۔ آپ کی موجودہ بیگم تو اس کی فروخت پر راضی ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ یہ سابقہ بیگم کو دیا جا چکا ہے۔ اگر آپ کی سابقہ بیگم بخوشی آپ کو دیتی ہیں اور اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتیں جب ہی آپ وعدے کی زنجیر سے آزاد ہو سکتے گے اور پھر یہ مکان فروخت ہو سکے گا۔“ رحمانی صاحب نے ہر پہلو واضح کر دیا۔

طاہر نے بے چارگی سے پوچھا ”اب میں کیا کروں؟“

رحمانی صاحب نے حل پیش کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے آپ موجودہ بیگم کو اعتماد میں لیں اور انہیں بتا دیں کہ یہ مکان آپ کا نہیں رہا۔ پھر آپ سابقہ بیگم سے رابطہ کریں۔ یہ ہے تو بڑے دل گردے کا کام لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود آپ اسے فروخت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رب تعالیٰ آپ کو وعدے کی پاسداری کا ٹوٹس دے رہا ہے۔“

سرور منہ پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بات تو اس کی سمجھ میں بھی آچکی تھی۔ اس نے سوچا اگر اس کی دوستی کا حق ادا کرنا ہے تو مجھے اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اس نے طاہر کو اٹھاتے ہوئے کہا ”آؤ طاہر! بہت کچھ واضح ہو گیا۔ چلو اللہ بہتر کرے گا۔“

وہ دونوں رحمانی صاحب کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔ ”یار! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اگر میں نازیہ کو سب بتا دوں تو اس کے بھائیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ اگر میں فرح کو مکان دے دوں تو میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ پھر میں اتنی بڑی دنیا میں اس سے کہاں رابطہ کروں؟“

سرور نے کہا ”نیت ثابت رکھ میرے بھائی! اب دنیا گلوبل ویج بن چکی ہے۔ ڈھونڈ لیں گے انہیں بھی۔ ایسا کرتے ہیں جن لوگوں نے تمہارا پہلا رشتہ کرایا تھا ان سے رابطہ کرو۔ ہو سکتا ہے وہ مدد کریں۔ بلکہ وقت لے لو میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

دو دن کی کھوج کرید کے بعد وہ دونوں فیروز صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فرح پاکستان میں نہیں۔ ان کے والدین نے ان کی شادی وہیں کر دی ہے۔ وہ مطمئن ہیں اور صاحب اولاد بھی۔

ان کے سامنے ہی فیروز صاحب نے امریکا فون پر بات کی اور تمام صورتحال فرح کے سامنے رکھ دی۔ فرح کے لیے بھی یہ بات ایک دھماکے سے کم نہ تھی کہ اسے بیٹھے بٹھائے ایک مکان مل رہا تھا۔ اس نے سوچنے کے

روز

ایک ماں کا ماحبرا
اے اپنے بیٹے سے بڑی محبت تھی
اور وہ محبت کے مفہوم و معنی سے بے خبر

کچھ
سوالوں کے
جواب کبھی
نہیں ملتے

حسن رزاقی

درستی سے جواب دیا۔

میں چھٹیاں گزارنے اپنی ماں کے پاس کراچی آیا تھا۔
میں مونٹریال میں رہتا ہوں۔ ہر سال چھٹیاں اپنی
ماں کے پاس کراچی میں گزارتا ہوں اور ہر سال واپس

ایک دن اور رک جاتے۔
یہ میری ماں کی التجا بھری آواز تھی۔
”یہاں رک جاؤں یا وہاں جا
کر نوکری کروں۔“ میں نے

بیٹا

خیالات کی طاقت

انسان دیکھے جاسکتے ہیں، ٹٹولے جاسکتے
ہیں، تم انھیں پکڑ سکتے ہو، ان پر حملہ کر سکتے ہو
اور قید کر کے ان پر مقدمہ چلا سکتے ہو اور انھیں
تختہ دار پر لٹکا سکتے ہو۔

لیکن خیالات پر اس طرح قابو نہیں پایا
جاسکتا۔ وہ نامحسوس طور پر پھیلتے ہیں، نفوذ کر
جاتے، چھپ جاتے اور اپنے مٹانے والے
کی نگاہوں سے مخفی ہو جاتے ہیں۔ روح کی
گہرائیوں میں چھپ کر نشوونما پاتے ہیں،
پھلتے پھولتے اور جڑیں نکالتے ہیں۔ جتنا تم
ان کی شاخیں جو بے احتیاطی کے باعث ظاہر
ہو جائیں گی، کاٹ ڈالو گے، اتنا ہی ان کی
زمین دوز جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔
(الیکز زوما)

میرے بھی بچے ہیں اور طاہر کے بھی بچے ہیں۔ میں یہ
مکان طاہر کے بچوں کو دیتی ہوں۔ طاہران کے سر پرست
کی حیثیت سے ان کی بہتری کے لیے جس انداز سے
چاہیں اس کو استعمال کریں۔“

طاہر جو ذہنی طور پر مکان فرح کو منتقل کرنے پر تیار تھا
اس فیصلے پر حیران رہ گیا۔ فرح کی طرف سے کیے گئے اعلیٰ
ظرفی کے اس مظاہرے نے اس کے بہت سے مسئلے
آسان کر دیے تھے۔ جب طاہر نے صدق دل سے وعدہ
پورا کرنے کی ٹھان لی تو اللہ کی رحمت اس کے شامل حال
ہوتی چلی گئی۔

واقعی انسان کا کسی مشکل میں گرفتار ہونا دراصل
رب تعالیٰ کی طرف سے سنگل ہوتا ہے کہ اپنے معاملات
درست کر لیے جائیں۔ اس لیے اپنے دل کی بیٹری چارٹ
رکھیے۔ کہیں کوئی خاص سنگل زندگی کی بھاگ دوڑ میں آپ
سے چھوٹ (بس) نہ جائے اور پھر خدا کے حضور پہنچنے کے
بعد تلافی کی کوئی صورت بھی نہ رہ جائے گی۔

لیے ایک دن کا وقت مانگا۔

جب طاہر گھر پہنچا تو پریشانی چہرے سے عیاں تھی۔
جس مکان سے بچوں کے مفادات وابستہ تھے وہ ہاتھ
سے جاتا دیکھ رہا تھا۔ لیکن وعدے کو پورا کرنے کے
اخلاقی تقاضے نے ہمت دے رکھی تھی۔ نازیہ نے پوچھا
”سرور بھائی! آپ کو کہاں لے جاتے ہیں۔ کئی دن سے
روز ہی چکر لگاتے ہیں۔ کیا پریشانی ہے؟“ اب طاہر کی
ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ساری صورت حال
نازیہ کے سامنے رکھ دی۔

”نازیہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔ جس چیز پر میرا بھی
حق نہ رہا تھا وہ تمہیں دے بیٹھا۔ اب یہ گھر ہمیں فرح کو
دینا ہوگا جو میری زندگی کی صرف چند ماہ کی شریک تھی۔
زبان سے نکلے الفاظ ہوں یا کاغذی دستاویزات سب پر
خدا پہلا گواہ ہوتا ہے۔ اب میں تم سے اور تمہارے
خاندان سے نظر نہیں ملا سکتا۔“

اس کا خیال تھا کہ نازیہ یہ سن کر بھڑک اٹھے گی۔ مگر
وہاں خاموشی تھی۔ ”بولو نازیہ! مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“
طاہر نے کہا۔

نازیہ کے لیے بھی یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ مگر وہ تھوڑی
سی ذہنی کشمکش کے بعد نتیجے پر پہنچ گئی اور سنجیدگی سے گویا
ہوئی۔ ”میرے بھائی نے آپ کی شرافت کی وجہ سے آپ
کو میرا سا بھی بنایا تھا۔ اس مکان کی بنیاد پر نہیں۔ اللہ
مہربان ہے کہ اس نے بے گھری کے عذاب سے بچاتے
ہوئے پہلے ہی ہم کو ایک ٹھکانہ فراہم کر دیا۔ آپ وعدہ پورا
کریں اللہ بہتری کرے گا۔“

طاہر کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا۔ کئی رات کے
بعد آج اسے پرسکون نیند آئی۔ دوسرے دن سرور اور طاہر
فیروز صاحب کے پاس بیٹھے فرح کا حیران کر دینے والا
فیصلہ سن رہے تھے۔ فرح نے پیغام دیا تھا ”آج کل
پاکستان میں جو حالات ہیں ان میں کوئی جائیداد بنانا بہت
مشکل کام ہے۔ پھر طاہر کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری
جائیداد بھی نہیں۔ میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

جاتے ہوئے ”ایک دن اور“ رکنے کا تقاضا ہوتا ہے۔

مجھے رخصتی کے لمحوں کی ان جذباتی باتوں سے چڑ ہے۔
”اچھا اگر ایک دن نہیں رک سکتے تو ایک گھنٹے بعد
ہوائی اڈے چلے جانا۔ ابھی فلائٹ میں تین گھنٹے باقی
ہیں۔“ ماں کا یہ انوکھا تقاضا تھا۔

”اگر ایک گھنٹہ اور رک بھی گیا تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟“
”میری آنکھیں ایک گھنٹہ اور ٹھنڈی رہیں گی۔“ وہی
جذباتی باتیں۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ پہلے مجھے
لندن جانا تھا۔ وہاں ۲ دن رک کر مونٹریال۔

..... (ب)

لندن ہوائی اڈے سے میں وکٹوریہ اسٹیشن آیا جہاں
مجھے ”سن رائز“ بیڈ اینڈ بریکفاسٹ ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔
میں جب بھی لندن آتا۔ اسی ہوٹل میں ٹھہرتا۔ میں پہلی
دفعہ ”سن رائز“ میں اس وقت ٹھہرا تھا جب میں پہلی دفعہ
کینیڈا جا رہا تھا۔ جب میں زیادہ پیسے نہ تھے۔ کم کرائے
والے ہوٹل کی تلاش تھی۔ ”وکٹوریہ اسٹیشن“ کے پیچھے ایسے
بہت سے ہوٹل تھے۔ ان میں سے ایک سن رائز تھا۔ یہاں
پر میری ہوٹل کے مالک کے سر سے ملاقات ہو گئی جو اس
ہوٹل کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان سے دوستی ہو گئی۔ پھر
میں یہیں ٹھہرنے لگا۔ گھر کا دوستانہ ماحول تھا۔ گپ شپ
رہتی۔ وقت اچھا گزرتا۔

ان صاحب کا نام جنید تھا۔ جنید صاحب ویسے تو عمر
رسیدہ تھے لیکن اپنے دل کو جوان رکھا ہوا تھا۔ گھومنے
پھرنے کے شوقین اور باتوں کے رسیا۔
فرصت ہوتی تو قصہ گوئی شروع کر دیتے۔ ہندوستان
کے پرانے قصے اور اپنا تجربہ سنایا کرتے کہ کتنی جوانیوں کو
زیر کیا۔ کبھی کبھی آوارہ گردی کرتے ہم لندن کی سڑکوں پر
نکل جاتے۔ آج آکسفورڈ سڑکس جانے کا پروگرام بنا۔
وہاں ان کی ایک پسندیدہ کافی شاپ تھی جہاں کی پیشتریاں
ان کو مرغوب تھیں۔ سینڈویچ وغیرہ بھی ملتے تھے۔ مگر وہ
پیشروں کے شیدائی تھے۔

ہم لوگ کاؤنٹر سے اپنی پسند کی پیسٹری لے کر مڑے
تو ساری میزوں کو بھرا ہوا پایا۔ ایک میز پر ایک اکیلی لڑکی
سر جھکائے بالوں کی لٹوں کو گرائے کچھ لکھ رہی تھی۔

میز کے پاس پہنچ کر اجازت چاہی کہ ہم یہاں بیٹھ
جائیں تو سر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی۔ شاید
امتحان کا پرچہ لکھ رہی تھی کہ وقت ختم ہونے سے پہلے پرچہ
ختم ہونا تھا۔ سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ میں نے
تصدیق کرنے کی خاطر پوچھ لیا کہ پرچہ کا مضمون کیا ہے۔
جملہ کو سراہتے ہوئے اور بالوں کی لٹ کو ایک طرف کرتے
ہوئے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میری آنکھیں اس کی
آنکھوں کی کشش کی تاب نہ لاسکیں۔

ساری شوخی دھری رہ گئی۔
آنکھیں تھیں یا مقناطیس کی جھیلیں کہ مجھے اپنی طرف
کھینچے لیے جا رہی تھیں۔ قدم تک نہ سنبھالے جاسکتے تھے۔
ابھی میں ان جھیلوں میں ڈوب ہی رہا تھا کہ دوسرا وار ہوا۔
اپنا صندوق ہاتھ میری طرف بڑھایا ”میرا نام روز ہے۔“
میری شامت میں نے ہاتھ تھام لیا۔ جس طرح
بادلوں میں بجلی چھپی ہوتی ہے اسی طرح اس ہاتھ میں بھی
بجلی چھپی ہوئی تھی اور جس طرح بادل کی بجلی جب چاہے
جس پر چاہے گر پڑتی ہے اسی طرح اس ہاتھ کی بجلی
میرے ہاتھ پر گری۔ ایک برقی رو میرے اندر دوڑ گئی۔

اگر مقناطیسی کشش میں کسی چھلے کو گھمایا جائے تو اس
میں برقی رو پیدا ہو جاتی ہے۔ روز کی آنکھوں کی اس
شدت کی مقناطیسی کشش میں اس کے ہاتھوں میں میرا
ہاتھ اسی چھلے کی طرح گھوم گھوم کر اور گردشیں کھا کھا کر
برقی رو پر برقی رو پیدا کیے جا رہا تھا جو میرے اعصاب پر
چھا رہی تھی۔

میں ابھی اپنے اس سائنسی تجربہ پر نازاں ہو ہی رہا
تھا کہ میرے کانوں میں رس گھولنے والی آواز آئی۔ ”مجھے
اچھا لگا کہ آپ کو میرا ہاتھ پسند آیا۔ لیکن اگر آپ اس کا
چھوڑ دیں تو میں دوسروں سے بھی ہاتھ ملا لوں۔“
روز کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے

گھبرا کر جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”شکریہ۔“ اس کی آنکھوں میں شوخی سے زیادہ کسی کو اپنی
شخصیت کے سحر سے زیر کرنے کی فتح مندی کا احساس تھا۔

میں ابھی تک ان مقناطیسی جھیلوں میں ڈبکیاں لگا رہا
تھا۔ جتنا ابھرنے کی کوشش کرتا اور ڈوب جاتا۔ پھر وہی
رس بھری آواز ”اب میرے ہاتھ خالی ہیں، پیش کروں۔“
روز اپنے شکار کو ذبح کر کے اس کے تڑپنے کے بھرپور
مزے لوٹنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے صرف میرے دل پر
ڈاکہ ڈالا تھا۔ زبان پر نہیں۔

”ایک شرط پر۔“ میں نے کہا۔

جواب ملا ”منظور۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔ پھر پلٹنا نہیں۔“

”سوچ لیا۔ تم شرط بتاؤ۔“

”یہ ہاتھ میرا ہو جائے گا۔ ساری زندگی میرے پاس
رہے گا، واپس نہیں ملے گا۔ تم اس ہاتھ کو کسی اور کے آگے
پیش نہیں کر سکتیں۔“

خاموشی۔

یہ میرے دل کی بات تھی مگر میرا مقصد روز کو بخل کرنا
نہ تھا۔ میں نے بات پلٹ دی۔

”تم لندن میں رہتی ہو؟“

”نہیں۔“ جواب ملا۔ ”میں کارڈف میں رہتی ہوں۔
لندن اپنی نانی سے ملنے آئی تھی۔ وہ گھر سے باہر ہیں۔
۲ گھنٹے بعد آئیں گی۔ میں کافی پیسے چلی آئی۔“

روز نے اپنے بارے میں بتانے کے بعد میرے
بارے میں جاننا چاہا۔

”تم شکل سے پاکستانی لگتے ہو مگر تمہارا بات کرنے کا
انداز اور لہجہ مختلف ہے۔ کیا تم امریکا میں رہتے ہو؟“

”اس ایک فقرے میں ۳ سوال ہیں ان کا جواب
سن لو۔ میں نے کہا پھر تفصیلی جواب روز کی خدمت میں
پیش کیے۔

”تمہارا اندازہ ٹھیک ہے میں پاکستانی ہوں۔ لب و
لہجہ زمانے اور وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔“

پھر تیسرا جواب ”میں امریکا کے شمال میں رہتا ہوں۔“
روز کو میری ”شرط“ کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ ”اچھا
تو تم اسکیمو ہو۔“ پھر اسکیمو کے خالی ہاتھ ہونے کی شکایت
”اسکیمو! تمہاری لومٹری کے بالوں والی ٹوپی اور ”اگلو“
کہاں ہیں؟“

”ٹوپی کا تو پتا نہیں لیکن اگلو تمہارے ہاتھوں کی گرمی
سے پکھل کر تمہاری آنکھوں کی جھیلوں میں بہہ گیا۔ میں
مونٹریال میں رہتا ہوں۔“

روز نے میری معلومات میں اضافہ کیا ”میں بھی
امریکا جا رہی ہوں۔“

میں سمجھا شاید میری پڑوسن بنے۔ میرے زیادہ تر
خیالات غلط نکلتے ہیں اور یہ خیال بھی غلط نکلا۔

”میرا منگیتر امریکا میں رہتا ہے۔“

کوئی اگر کہتا کہ قیامت آگئی ہے تو شاید مجھے اتنا بڑا
دھچکا نہ لگتا۔

عشق کا کارواں چلا بھی نہیں
اور ابھی سے غیار کی باتیں

کافی کا کپ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔

”کیا ہوا؟“ روز نے شوخی سے پوچھا۔

عورت پر اگر کوئی پسندیدگی کی نظر ڈالے تو وہ اس کو
فوراً جان لیتی اور اس کا قد اونچا ہو جاتا ہے۔ انداز میں
دلیری آ جاتی ہے۔

”روز مجھے یہ بتاؤ میں نے تم کو کتنے دن پہلے کھو دیا۔“

اس کو میرے سوال پر نہ تو حیرت ہوئی اور نہ ہی وہ
اس بدتمیزی پر ناراض ہوئی۔ اپنی شوخی برقرار رکھے ہوئے
بولی ”۶ مہینے پہلے۔“ پھر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

کہنے لگی ”اگر تم مجھ سے ۶ مہینے پہلے ملے ہوتے تو“
”آگے بولو رک کیوں گئیں۔“ میرے سوال کا

جواب ملنے سے پہلے جنید صاحب نے مجھے ٹھونکا لگایا۔ وہ
ہوٹل جانے کے لیے بے چین تھے۔ میں بادل خواستہ اٹھ

گیا۔ اٹھتے ہوئے میں نے جنید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کافی بہت عمدہ تھی۔ میں ۷ بجے پھر آؤں گا۔“ روز نے میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شام ۷ بجے کا مخاطب کس سے تھا۔ کافی شاپ سے نکلتے ہی جنید صاحب نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”کیا کر رہے ہیں آپ؟“ انھوں نے پوچھا۔

”آپ کا کیا مطلب ہے۔“
”مطلب آپ خوب جانتے ہیں۔ بھولے نہ بیٹے۔ آگ سے مت کھیلے، جل جائیں گے۔ اپنے ساتھ روز کو بھی لے ڈوبیں گے۔ اس کی شادی ہو لینے دیں۔“
جنید صاحب شاید ٹھیک کہہ رہے تھے مگر میں نہ جانے کن سوچوں میں تھا۔
”میں اس کی شادی میں کیسے رکاوٹ ڈال سکتا ہوں۔“
”۷ بجے بتاؤں گا۔“ جنید صاحب نے جواب دیا پھر اپنے خدشہ کا اظہار کیا ”اگر وہ ۷ بجے آگئی تو اس کی شادی نہیں ہوگی۔“
”وجہ.....“

”اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ لیجیے گا۔“
جنید صاحب نے ایسے شکار متعدد بار کھیلے تھے۔ کہنے لگے ”میں نے یہ ٹھیل بہت کھیلے ہیں۔ عورت جب کس کو دل دیے بیٹھتی ہے تو اس کی دلبری کا انداز ہی اور ہوتا ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ جب شکاری خود خنجر بن جائے تو معاملہ سنگین موڑ مڑ جاتا ہے۔“

پھر جنید صاحب نے کافی شاپ سے اٹھنے کی وجہ بتائی ”میں آپ کو اس موڑ پر مڑنے سے بچا لایا ہوں۔ اس میدان میں آپ کچے ہیں۔ میں اس کا کھلاڑی ہوں۔ آپ کو صرف جہاز اڑانا آتا ہے۔ آپ وہی کیجیے۔ اس میدان کو چھوڑ دیجیے۔“

ہم واپس ہوئے پینچ چکے تھے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے جنید صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ

رکھ کر چھتھپھایا اور بزرگانہ انداز میں درخواست کی۔ ”اس کے حال پر رحم کریں۔ ۷ بجے نہ جائیں۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ سوچ ضرور سکتا تھا۔ میرے قدم میرے دماغ کے تابع نہ رہے تھے۔ میں ۷ بجے سے پہلے ہی کافی شاپ پہنچ چکا تھا۔ ٹھیک ۷ بجے روز کافی شاپ کے دروازہ پر نمودار ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر میری میز پر آکر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ”میں کافی پینے آئی ہوں۔ تم سے ملنے نہیں۔“
”جھوٹ آنکھوں سے پکڑا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا تم آؤ گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ کون سا بلانے کا وقت ہے۔ میں نانی کے ساتھ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ اب بلایا ہے تو کھانا بھی کھلاؤ۔“ اس کی شلفنگی عروج پر تھی۔ پھر گھڑی دیکھ کر بولی ”ہمارے پاس ۲ گھنٹے سے بھی کم وقت ہے۔ مجھے ۹ بجے کی گاڑی سے کارڈف جانا ہے۔ کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں وقت ضائع نہیں کروں گی۔ یہیں کچھ منگوا لو۔“ سینڈوچ اور کافی سے فارغ ہو کر ہم لوگ سرکیں ناپنے نکل گئے۔

روز کھلی جا رہی تھی۔ ہمارے گھومنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہر گزرتے لمحہ کو ساتھ مل کر سمیٹ لیں۔

جنید صاحب نے کہا تھا کہ اگر روز ۷ بجے آگئی تو میرا عکس اس کی آنکھوں میں ہوگا۔ مگر ان مقناطیسی آنکھوں میں جھانکنے کی تاب نہ تھی۔ اتنا ضرور لگا کہ روز کے انگ انگ میں انبساط تھا۔

”روز۔“ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نے مقناطیسی پہاڑیوں کو جھیل میں کیسے تبدیل کر دیا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یہ میں نے اسٹیشل آرڈر پر بنوائی ہیں تاکہ تم جیسے ندیدے بچہ کو اس میں ڈبو سکوں ورنہ تم ہر گز میری (Gorcery) سٹور میں کھٹی میٹھی گولیوں کے مرتبان میں ہاتھ ڈال کر اپنے ہاتھ گندے کرتے رہو گے۔“

ان جھیلوں میں ڈوبنے اور ڈوبنے سے بچانے کا اختیار بھی روز نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ ”میں جب چاہوں تم کو ان میں ڈبو لوں۔“ کوئی خود اعتمادی سی خود اعتمادی تھی۔ ”ایسا ڈبوؤں گی کہ کبھی باہر نہ نکل سکو گے۔“ ایک دفعہ ان جھیلوں میں ڈوبنے کے بعد کس کا فرکا دل باہر آنے کو چاہے گا۔ مگر بہر حال باہر نکلنے کی تفصیل بتانا بھی ضروری تھا۔

”صرف ایک صورت میں باہر نکل سکتے ہو۔“ وہ صورت یہ تھی ”میں خود تم کو اچھال کر باہر پھینک دوں۔“ یہ موضوع ختم ہوا اب دوسری بات۔

”تم مجھ سے اتنا دور کیوں بھاگ رہے ہو۔ میرے قریب آ جاؤ۔ میری کمر میں ہاتھ ڈالو۔ میں تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال کر تمہارے شانے پر سر رکھ کر چلوں گی۔“ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

فرشتوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ عالم بالا سے جھانک کر دیکھ رہے تھے اور میری خوش نصیبی پر رشک کر رہے تھے۔

”ذیشان۔“
”جی حضور۔“
”مذاق مت کرو۔“
”بہت بہتر۔ فرمائیے۔“

”آج میں ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں آج ہی پیدا ہوئی ہوں۔“

مجھے خیال ہوا کہ دودھ کی بوتل اور چوٹی خریدنے پر باہمی مشورہ کرنا چاہیے۔ مگر موقع کی نزاکت کے پیش نظر دل کی بات دل میں ہی رہنے دی۔

”لگتا ہے کہ آج میں لندن پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ بلکہ ہر چیز پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“ پھر مجھے کمرۂ امتحان میں بٹھا دیا۔ ”جانتے ہو کیوں؟“

مجھے کیا معلوم تھا کہ کیوں لیکن جواب دینا وقت کی ضرورت تھا۔ ”اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں.....“ میری بات بچ میں کٹ گئی۔

”فلسفی بننے کی ضرورت ہے نہ ہی مذاق کرنے کی۔“ روز واقعی سنجیدہ تھی۔ ”اس لیے کہ آج میں اور تم ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔“

بات میرے دل کو لگی۔ میری حس مزاح گہری نیند سو گئی۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی معاملہ نہ تھا۔ کیا میں بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ لمحے ہمیشہ کے لیے تھم جائیں۔ زمین کی گردش رک جائے۔ روز کا ساتھ بھی نہ چھوٹے پائے۔ میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی ”اچھا وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ ساڑھے ۸ بج چکے ہیں۔ میری گاڑی ۹ بجے جائے گی۔ ہم کو اسٹیشن چلنا چاہیے۔“ اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکی۔ ”پید ٹکٹن اسٹیشن۔“ ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں روز نے کہا ”ذیشان! میں اتنی خود پرست نہیں ہوں۔ اور نہ ہی اتنی شوخ۔ تم کو میری باتیں بُری تو نہیں لگیں۔“

روز کی کسی بھی بات کا کسی طور بُرا لگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مجھے اس کی ہر بات گوارا تھی۔ دل چاہتا تھا وہ بولتی رہے۔ میں سنتا رہوں۔ میں روز کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔“ اس نے پوچھا۔ ”میں چاہتا ہوں تمہارا وجود اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم ندیدے بچے ہو چاہتے ہو ہر میٹھی گولی تمہارے منہ میں گھل جائے۔“

”ہر گولی نہیں۔ بس صرف ایک گولی۔“ میں نے پوری سچائی سے کام لیا۔

ٹرین چلنے میں پانچ چھ منٹ رہ گئے تھے۔ روز سوار ہونا چاہتی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اپنا منہ میرے آگے کر دیا۔ ”تم میری بہن نہیں ہو کہ میں تمہارے گال پر پیار کر کے تمہیں رخصت کروں۔“

”پھر کیا ہوں۔“ اس نے پوچھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا یا۔ ”روز۔“ میری آنکھوں میں التجا تھی۔ ”اگلی گاڑی سے چلی جانا۔“

میری زبان نے جو کچھ کہا۔ جب اس کو میرے کانوں نے سنا تو ان کو یقین نہ آیا۔ رخصتی کے وقت کی جذباتی باتیں مجھے بڑی لگتی تھیں۔ جب میری ماں مجھے کہتی ”بیٹا! ایک دن اور رک جاؤ۔“ تو میں بھڑک جاتا۔ ”یہاں بیٹھا رہوں یا جا کر نوکری کروں۔“ مگر اس وقت میں خود کسی اور کو بلا مقصد روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی شاید صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے۔

میں جب کراچی سے چل رہا تھا تو ماں نے کہا تھا ”ایک گھنٹہ بعد ہوائی اڈے چلے جانا۔“ میں نے پوچھا تھا ”کیوں؟“ تو اس نے کہا تھا ”میری آنکھوں میں ایک گھنٹہ اور ٹھنڈک رہے گی۔“ اس وقت میں نے ماں کے جذبات نہ سمجھے تھے۔

”نہیں۔“ روز نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ”میں نہیں رُک سکتی۔“ اس کی آواز میں عزم تھا۔ ”میں اپنے منگیتر سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔“ پھر شکوہ ”تم مجھ سے ۶ مہینے پہلے کیوں نہیں ملے؟“ سارا قصور میرا نکلا۔ آواز میں عزم تھا مگر آنکھوں کی کہانی کچھ اور تھی۔

دم رخصت وہ چُپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

روز نے بات بنانی چاہی۔ ”میں تم کو اپنا کارڈف کا پتا دیتی مگر اس لیے نہیں دے رہی ہوں کہ تم اگلی صبح کارڈف پہنچے ہو گے۔ رومیو۔“ پھر اس نے ہولے سے میرے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ”تم بھی میرے بھائی نہیں ہو۔“ پھر ایسا سوال جس کا نہ میرے پاس کوئی جواب تھا اور نہ ہی میں اس الزام کا ذمہ دار تھا ”تم کو میری زندگی میں ہلچل مچانے کا حق کس نے دیا تھا۔“ آنکھوں کا کاجل اور پھیل رہا تھا۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ رہے تھے۔

روز نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مگر میرے اوپر زندگی میں ہلچل مچانے کا الزام کیوں۔ ہلچل تو خود اس نے مچائی تھی۔ ۷ بجے کیوں آئی تھی۔

جنید صاحب نے کہا تھا ”اگر وہ ۷ بجے آجائے تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا عکس دیکھ لیجے گا۔“ لیکن جب نینوں میں کاجل پھیل رہا ہو تو عکس دھندلا جاتے ہیں۔ میں اگر ان مقناطیسی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ بھی لیتا تو کیسے پتا چلے گا کہ یہ دھندلا ہوا عکس کس کا ہے۔ اور اس کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ تو جارہی تھی۔

روز نے پلٹ کر میرے کوٹ کے دونوں فلیپ (Flap) اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے ”مجھے جواب دو کیوں آئے تھے میری زندگی میں ہلچل مچانے۔“

”تم بھی تو آئی تھیں۔“ وہ پھر گئی۔ ”کیا مجھے آنے کا حق نہیں تھا۔ تم آسکتے تھے تو کیا میں نہیں آسکتی تھی۔“ اس کی آواز میں شدت آ رہی تھی۔ ”تمہارے دل نے تمہیں مجبور کیا تم آگئے۔ کیا میرا دل مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگئے تو یہ شیولری (Chivalry) تھی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی تو یہ کمزوری ہو گئی۔“

”بتاؤ! مجھے جواب دو۔“

میں کیا جواب دیتا۔ میں تو خود پگھل رہا تھا۔ روز نے میرے شانے پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ چکے تھے۔ ساون بھاؤوں برکھا برس رہی تھی۔ میرا کوٹ اس کے آنسوؤں سے بھیک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں میرے آنسو تھے۔ ان پر میرا کوئی بس نہ تھا۔

گارڈ کی آواز آئی ”آل ابورڈ“ (All aboard) (سب گاڑی پر سوار ہو جائیں)۔

روز بھاگ کر ڈبا میں سوار ہو گئی۔ دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ ٹرین حرکت میں آئی پھر پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ یہ ٹرین پلیٹ فارم سے نکلی تھی یا میرے وجود سے۔

اس میں میرا قیمتی سرمایہ تھا جو کسی اور کے لیے تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا تو ہمزاد میرے ساتھ تھا۔ ”اداس ہو؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ میں اداس ہوں یا یہ احساس زیاں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تمہاری کوئی اپنی شے تھی جس کا احساس زیاں ہے۔؟“

”نہیں یہ شے نہیں تھی سرمایہ تھا گراں قدر سرمایہ۔“

”اس سرمایہ پر تمہارا کیا حق تھا۔“ ہمزاد نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو کیا پھر غیر کی چیز کو اپنا کہہ کر اس کے ٹٹ جانے کا سوگ منا رہے ہو۔“

بس ایک نگاہ میں لٹکا ہے قافلہ دل کا
سو اس کو اہل تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

”تم نے کیوں اس کو نگاہ بھر کے دیکھا۔“

”یہ اسی گناہ کی سزا ہے۔“

”عقل کے ناخن لو۔“

ایسے موقعوں پر عقل کے ناخن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ میرا اور روز کا مشکل سے گل ڈھائی گھنٹے کا ساتھ تھا۔ ڈھائی گھنٹے میں تو ٹھیک سے نفرت بھی نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ ٹٹ جانے کا احساس کیوں۔ پھر یہ احساس یک طرفہ بھی نہ تھا۔ لٹنے والا خود بھی لٹنے کے احساس سے دوچار تھا۔ عقل کے ناخن جھڑ چکے تھے۔ ان کا کہیں وجود نہ تھا۔

روز اس کا اصل نام نہیں۔ میں نے یہ نام فلم ٹائی ٹینک (Titanic) کی ہیروئن کے نام کی مناسبت سے بدل دیا۔ ٹائی ٹینک کی ہیروئن کا اصل نام کیٹ وینسلیٹ (Kate Winslet) ہے۔ کیٹ میں اور کارڈف کی روز میں دو قدریں مشترک ہیں۔ دونوں برطانوی ہیں اور دونوں برطانوی حسن کا بہترین شاہکار مگر کارڈف والی روز کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ جو تمکنت اور سحر انگیز ڈیڈ پھ روز میں تھا وہ مجھے کیٹ میں نہیں ملا یا شاید میرا حسن ظن تھا۔

خیالات کا دھارا بہتا رہا، میں چلتا رہا یہاں تک کہ ہوٹل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کل صبح مجھے مونٹریال واپس جانا تھا۔

رات بھر بے خوابی کی کیفیت رہی۔ جب کبھی آنکھ جھپکتی، روز سامنے آکھڑی ہوتی ”بتاؤ! مجھے جواب دو۔“

بتاؤ۔ جواب دو۔ جواب دو۔

میں نے بھی اس سے جواب مانگنے شروع کر دیے ”بتاؤ کیوں بنائی تھیں یہ جھیلیں۔ تم نے خود کہا تھا کہ اس ندیدے بچے کو ڈبوؤں گی اور ایسا ڈبوؤں گی کہ باہر نہ نکل سکو گے۔ سوائے اس کے کہ میں خود تم کو اچھال کر باہر پھینک دوں۔ بتاؤ کیوں بنائی تھیں یہ جھیلیں۔ بتاؤ جواب دو۔ مجھے اچھال کے کیوں نہیں پھینک دیتیں۔“ نہ اس کو کوئی جواب ملا اور نہ ہی مجھے۔

صبح اٹھا تو طبیعت مضطرب تھی۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ ۳ بجے مونٹریال کی پرواز تھی۔ ۱۱ بجے کے قریب میں ناشتا کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے اندر کا ضدی بچہ جاگ اٹھا۔ ”میں کارڈف جا کر روز کو تلاش کروں گا۔“ ہمزاد سامنے آکھڑا ہوا۔ ”پاگل ہوئے ہو؟“

”ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے ہمیشہ عقل کا کہا مانا ہے۔ وہی کیا جو درست اور مناسب تھا۔ آج میں عقل سے ناطہ توڑ لوں گا۔ میں کارڈف جا کر اس کو ڈھونڈوں گا۔ مجھے کون روکے گا۔“ اتنے بڑے شہر میں اس کو کہاں ڈھونڈو گے؟ عقل سے کام لو۔“ ہمزاد نے سمجھایا۔

میں نے بات سنی ان سنی کر دی۔ سوٹ کیس پیک کیا اور باہر نکل آیا۔ ”ٹیکسی۔“ میں نے آواز دی۔ ٹیکسی میں داخل ہو کر میں نے کہا ”پیدنگٹن اسٹیشن۔“

”کارڈف کی ٹرین کس وقت جائے گی؟“ میں نے اسٹیشن کے کاؤنٹر پر پوچھا۔

”آدھے گھنٹے بعد۔“

”ایک ٹکٹ دے دیں۔ لندن سے کارڈف۔ ون دے (One Way)۔“

با جی کی ترجیحات کا دلچسپ ماحبرا

بکرے کی ان

کچھ دلائل آگ کیوں لگاتے ہیں

انجم فاروق ساحلی

روپے میں۔“ قیمت سنتے ہی ابا جان دھک سے رہ گئے ان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”ابا جان قربانی کرنے کے لیے رقم تو قربان کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب ۲۰۱۰ ہزار کوئی بڑی رقم نہیں رہی۔ بچوں کی خوشی میں کسی بھی قیمت پر خرید سکتی ہوں۔“ با جی نے ابا جان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن بیٹی اب مہینہ بھر کا بجٹ بھی تو متاثر ہو جائے گا۔“ ابا جان نے فکر مند لہجہ میں کہا۔

”کوئی بات نہیں ابا جان۔ آپ کے علاج و معالجہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دوں گی۔“

”مگر پھر بھی بیٹا اتنے روپے! کبھی ۲۰۱۰ روپے میں گائے مل جایا کرتی تھی اور اب ۲۴ سو میں مرغا بھی نہیں آتا۔ اے اوپر والے رب! تو ہی کچھ رحم کر۔“

ابا جان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے التجا کی۔ گھر کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ جب سے انھیں ہارٹ ایک ہوا تھا پر چون کی دکان بند پڑی تھی۔ اب انھیں بیٹھے بیٹھے چکر بھی آنے لگتے تھے۔ لہذا مجبوراً سٹریڈ آؤن کرنا پڑا تھا۔ میں نے بہت

بکرا دیکھتے ہی مجھے بھول گئے۔ با جی طاہرہ نے ایک تندرست اور بٹے کئے بکرے کو کان سے پکڑا ہوا تھا۔

”تو بکرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نئے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابا جان تیز بخار کے باوجود بستر سے اٹھ کر صحن میں تشریف لے چکے تھے۔ اماں بھی کچن کے دروازے پر نمودار ہو کر پر مسرت انداز سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ بکرا خریدنے کا سب گھر والوں کا مطالبہ شدت اختیار کرتا چلا گیا تھا۔

ایسے میں با جی طاہرہ کو اپنی مصروفیت سے وقت نکالنا تھا پڑا تھا۔ بچے خوشی سے بکرا کو گھماتے پھر رہے تھے۔ امی کے اشارے پر بکرا کو ایک جگہ باندھ دیا گیا۔ امی، ابا اور با جی قابل تحسین نگاہوں سے بکرا کے جسم کے مختلف حصوں کو نکلنے لگے، جیسے اپنے اپنے حصے کا گوشت دیکھ رہے ہوں۔“ کتنا خوبصورت اور تندرست بکرا ہے۔“ امی نے با جی کی طرف دیکھتے ہوئے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔

”بس قسمت سے مل گیا۔“ با جی نے کہا۔ ”کتنے ہزار کس ملا؟“ ابا جان نے استفسار کیا۔ ”صرف ۲۰ ہزار

سب

میں مونٹریال پہنچ چکا تھا۔ روز کی یاد ابھی تازہ تھی۔ وقت کا دھارا بہتا رہا۔

آہستہ آہستہ روز میری یادوں سے دور ہوتی گئی۔ ماں کا اصرار تھا کہ گھر بسالو۔ ماں نے لڑکی پسند کی۔ میں نے پاکستان جا کر نکاح پڑھوا لیا۔

رضیہ گھر آئی تو گھر میں زندگی کی رونقیں آگئیں۔ رضیہ نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔ وہ میرا لباس تھی میں اس کا لباس۔

میری جھولی میں اتنی خوشیاں ڈالیں کہ مجھے شکوہ بتکی داماں ہو گیا۔

یہ سچی اور پائیدار خوشی تھی۔

صرف جذبات کا اُبال یا جوانی کا جوش نہ تھا۔ پھر خدا نے مجھے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ میری زندگی مکمل ہو چکی تھی۔

وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ میرے ہنستے بستے گھر کو نظر لگ گئی۔ رضیہ ٹریفک کے حادثہ میں مجھ سے جدا ہو گئی۔ بیٹا بڑا ہو چکا تھا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب اس کو میری ضرورت نہ تھی۔

رضیہ کے جانے کے بعد میرے لیے مونٹریال میں کوئی کشش نہ رہی تھی۔ مغرب کی بے معنی چمک دمک والی مادی زندگی سے دل بھر چکا تھا۔ وطن کی مٹی یاد آتی تھی۔ میں پاکستان واپس آ گیا۔

بیٹے کی چھٹیاں تھیں۔ وہ مجھ سے ملنے کراچی آیا ہوا تھا۔ آج اس کی واپسی تھی۔ ٹیکسی دروازہ پر کھڑی تھی۔

”بیٹا!“ میں نے التجا کی ”ایک دن اور رک جاتے۔“ وہ جھنجھلا گیا ”یہاں رکوں یا وہاں جا کر نوکری کروں۔“

ماضی میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ ماں کی آواز گونجی۔

”ایک گھنٹہ بعد جاؤ گے تو میری آنکھیں ایک گھنٹہ اور ٹھنڈی رہیں گی۔“

ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

مکٹ لے کر میں پلیٹ فارم پر اسی جگہ آکھڑا ہو گیا جہاں میں اور روز کل رات کھڑے تھے۔ فرق صرف اتنا سا تھا کہ آج روز میرے ساتھ نہ تھی۔

کل کا منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

روز اسی پلیٹ فارم پر ہنستی ہوئی آئی تھی اور روتی ہوئی گئی تھی۔ میرا کوٹ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اس کے بالوں میں میرے آنسو تھے۔ ان پر میرا کوئی بس نہ تھا۔

گاڑی چلنے میں ۱۰ ارمنٹ رہ گئے تھے۔ میں وہ جگہ ابھی نہ چھوڑنا چاہتا تھا جہاں روز کھڑی تھی۔ پھر وقت پورا ہو گیا۔

گاڑی کی آواز آئی ”آل ابورڈ۔“

میں نے سوٹ کیس اٹھایا۔ دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ ٹرین حرکت میں آئی۔ پھر پلیٹ فارم سے نکل گئی۔

میں ٹرین کو پلیٹ فارم سے باہر نکلتے دیکھتا رہا۔ یہی ٹرین تھی جو کل روز کو مجھ سے دور لے گئی تھی۔ روز میری نہ تھی۔ وہ کسی کی مانگ تھی۔

میرا کوئی حق نہ تھا کہ میں دوبارہ اس کی زندگی میں پچھل مچانے کا رڈف جاتا۔

میں نے اپنا سوٹ کیس تھاما اور اسٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی کو آواز دی۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور سے کہا ”ہیتھرو“ (Herthrow) (لندن کا ایر پورٹ)۔

ٹیکسی ہوائی اڈے کی طرف جارہی تھی۔

میرا دل کارڈف میں تھا۔

اگر مجھے یہ حق نہ تھا کہ میں روز کی زندگی میں پچھل پیدا کروں تو روز کو کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کا کا جل میری آنکھوں میں پھیلائے۔

دل تو اپنا اداس ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

کوشش کی دکان چلانے کی لیکن اپنے تخلیقی مزاج اور نرم طبیعت کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو کے الگ بیٹھ گیا تھا۔ چرب زبان لوگوں نے ادھار لے کر خسارے میں مبتلا کر دیا تھا۔ باجی میڈیسن کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایڈورٹائزمنٹ کے شعبہ کی انچارج بن چکی تھیں۔ لہذا انھیں ایک اچھی تنخواہ ہر ماہ مل جایا کرتی تھی۔

میں کہانیاں لکھ کر تھوڑا بہت کما لیتا تھا۔ گھر میں مرکزیت باجی کو حاصل تھی اور مجھے تو اکثر اوقات آڑے ہاتھوں لیا جاتا تھا۔

”ہر وقت سوچوں میں گم رہنا، نہ کھانے کا ہوش نہ مینے کا، نہ کوئی امنگ نہ ترنگ اور طاہرہ لڑکی ہو کر سارے گھر کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اور تم؟“ ماں کی باتیں میرے سینہ میں سلکتی ہوئی مرجیں بھر دیتیں تو میں کراہ اٹھتا اور اپنی صفائی پیش کرتا، دیکھنا اماں ایک دن میرا شمار بھی ملک کے صف اول کے ادیبوں میں ہو گا۔ ناشر میری کہانیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا کریں گے۔ پھر اس گھر کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔“ اماں خاموش تو ہو جاتی لیکن اندر ہی اندر کھولتے ہوئے لاوا کو روکنا ان کے بس میں نہ تھا۔ سب کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ باجی کی شادی کے بعد اس گھر کا کیا بنے گا۔

میں کتنی دیر سے کھڑا امی اور چھوٹی بہنوں سے چائے بنانے کی درخواست کر رہا تھا، لیکن بکرا گھر بھر کی توجہ کا مرکز اس طرح بنا ہوا تھا کہ کسی نے میری طرف توجہ دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ مسلسل دماغ سوزی سے میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔

میں نے خود ہی کچن میں جا کر چائے بنالی اور اسٹڈی روم کی طرف چلا گیا۔ ہاتھ بڑھا کر سوچ آج کیا تو کمر روشن ہو گیا لیکن دل بچھ سا گیا۔ غربت فن کا مذاق اڑا رہی تھی اور باہر باجی کی جیب سے نئے نئے رنگ برنگے نوٹ اس طرح اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے جیسے ان کے پر نکل آئے ہوں۔ عیدی تقسیم ہو رہی تھی اور بچوں کے شور وغل نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مجھ پر اضطرابی

کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے ٹیبل لیپ کی روشنی میں ایک کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابھی ۲۰۱۵ء میں گزرے تھے کہ اچانک کھلی کھڑکی سے ایک بکرا اور ایک بچہ کا سر نمودار ہوا اور بکرا کی جذباتی صدا نے میرا سارا غارت کر دیا۔ میں نے جھنجھلا کر زور دار آواز کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔ اتنے میں میرا چھوٹا بھائی آصف کم دیر کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ اسی اثناء میں کمرے کے باہر کارڈور سے گزرتے ہوئے میرے سب سے چھوٹے بھائی سجاد کے ہاتھ سے بکرا چھوٹ کر کمرے میں گھس آیا اور زور سے میری رائٹنگ ٹیبل سے ٹکرایا۔ میری کتابیں، رسالے، روشنائی کی کھلی دوات اور دوسری مختلف اشیاء اچھل کر ادھر ادھر جا پڑیں۔ آصف نے غسل خانہ سے جھانک کر دیکھا تو ٹیبل روشنائی کا سیلاب فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کتابوں کو روشنائی سے داغ دار ہونے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحہ ناممقول بکرانے ایک زور دار ٹکرا اس کی کمر پر رسید کی۔ بکرا اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ دھکا کھا کر فرش پر لڑھک گیا۔ بکرا کمر کی سیاحت کرتے ہوئے اچھل کر کرنے لگا۔ پھر ایک جگہ دیوار پر آویزاں آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر غضب ناک آواز کے ساتھ ایک ٹکر شیشے دے ماری۔ آئینہ چور چور ہو گیا۔ سجاد نے اور میں نے بمشکل اس وحشی کو قابو کیا۔ پھر سجاد اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گیا۔ اس نے بچوں کو بھی خوب کھری کھری سنائی اور ایک دو کے کان بھی مروڑے کہ اب تک اس کو باندھا کیوں نہیں گیا۔

عید الاضحیٰ کی نماز ادا کرتے ہی مجھے قصاب کی محلہ میں نکلنا پڑا۔ کیونکہ گھر والے گوشت اور نوکری کھال کی منتظر تھی۔ فقیر اور مساکین بھی دروازہ کے ارد گرد منڈا رہے تھے۔ کیونکہ پڑوسیوں کے دو عدد بکروں کی جذباتی آوازیں انھیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے دو پڑوسیوں کے بکروں میں شاید میمانے کا مقابلہ ٹھن گیا تھا پھر اچانک پڑوس کے ایک چھترے کے ذبح ہونے کی

جیسا کہ آواز نے ہمارے بکرے کو شدید ہيجان میں مبتلا کر دیا۔ وہ رسی تڑوا کر بھاگنا چاہتا تھا اور سب بچے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پٹکیاں دے رہے تھے۔ میں نے قصاب کی دکان پر پہنچا۔ قصاب صاحب بہت معروف دکھائی دے رہے تھے اور موبائل پر کسی سیٹھ کو بعد از جلد پہنچنے کی یقین دہانی کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک پجارو قصاب کے قریب آ کر رک گئی۔ قصاب نے پجارو کو دیکھ کے موبائل بند کر دیا اور پجارو سے اترنے والے تاجر کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ ”آئیے“ آئیے ملک صاحب! بس میں پہنچنے ہی والا تھا۔ ملک صاحب نے بڑی فرعونیت سے گردن کو خم کر کے اسے گورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کچھلی بار بھی میرا سارا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ چلو! فوراً میری گاڑی میں بیٹھو“ اس لمحے گاڑی سے سنار تاجر کا بڑی بڑی بوٹوں والا خوفناک پاڈی گاڑ اپنی گن کی جھلک دکھا کر قصاب کو گھورنے لگا۔ قصاب محلے داروں سے جان چھڑا کر پجارو کی طرف بڑھ گیا، اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ میری بہن طاہرہ نے بھی ایک قصاب سے بات کر رکھی تھی لیکن وہ بے چارہ بدقسمتی سے ٹرین کے ایک حادثہ میں زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔

ای لئے یہ کام میرے ذمہ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے بہت نہیں ہاری اور برابر قصاب کے تلاش میں آگے بڑھتا جا گیا۔ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا اپنی منگیتر نادیہ کی کوٹھی کے سامنے جا پہنچا جس کا گیٹ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ نادیہ کے ”ہالٹھر فاروقی صاحب قصاب کو رخصت کر رہے تھے۔“ سن فوراً آگے بڑھا۔ یہ سنہری موقع تھا۔ کم بخت قصاب نے اس کے دن وی آئی پی بنے ہوئے تھے۔

اس لمحہ میری منگیتر کے والد مجھے دروازہ کے اندر نظر آئے۔ ”السلام علیکم انکل! عید مبارک“۔ میں نے ”آگے“ کہتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو فاروقی! کیسے ہو عید مبارک“۔

اتنے میں نادیہ جو گوشت کے ڈھیر کے پاس کھڑی تھی بات کر رہی تھی، میری آواز سن کر تیزی سے

قریب آ گئی۔ میں نے اسے بھی عید کی مبارک باد دی۔ ”خیر مبارک“ کہتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

وہ میک اپ اور عید ڈریس کے بغیر ہی سادگی اور قدرتی حسن کا نمونہ دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، روشن چہرہ، گداز بدن، لمبے گھنے سیاہ بال۔ ایک لمحہ کے لیے تو میں چاند ستاروں کی دنیا میں چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس دنیا سے دور اڑتے چلے جا رہے ہوں۔ وجد اور سرور کا ایک عجیب عالم تھا۔ ہم پھولوں سے سجے ہوئے راستہ پر دوڑتے چلے گئے۔ اچانک اس حسین اور خوبصورت تصور کو قصاب کی موٹر بائیک کی کھانسی نے منقطع کر دیا۔ میں حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا، روح کا گداز ختم ہو چکا تھا۔

نادیہ پوچھ رہی تھی ”پ لوگوں کا بکرا ذبح ہو چکا؟“ ”نہیں ابھی نہیں۔ میں تقریباً ۲ گھنٹے سے قصاب کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔“ میں نے مایوس لہجہ میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں ابھی لو۔“ نادیہ نے قصاب کو روک لیا۔ ”بی بی جی میرا وقت بہت قیمتی ہے۔“ قصاب نے کھسکا چاہا۔

”وقت کی ایسی کی تیری نور محمد! ان کے ساتھ جا کر ان کا بکرا بھی جلدی سے ذبح کر آؤ۔“ نادیہ نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ ”بی بی اگلا بکرا تھانیدار صاحب کا ہے وہ میری کھال کھینچ لیں گے۔“ قصاب منت سماجت کرنے لگا۔ ”نور محمد! بہانہ نہیں چلے گا، یہ میرا کارڈ لے لو یہ انھیں دکھا دینا۔“

نادیہ نے ”دنیا کرائم رپورٹر“ کارڈ قصاب کو تھما دیا۔ فاروقی صاحب ایک طرف کھڑے خاموشی سے اس ساری گفتگو کو سن رہے تھے۔

”بی بی جی میں لیٹ ہو جاؤں گا، میں ایڈوانس لے چکا ہوں پلیر آپ ضد نہ کریں۔“ قصاب منمنایا۔

”نہیں نور محمد ابھی اور اسی وقت جاؤ، اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمہاری دکان کے نزدیک تھانہ میں گوشت مہنگا بیچنے والوں کی لسٹ آچکی ہے اور مجسٹریٹ

کے ہمراہ بقرعید کے فوراً بعد چھاپہ پڑنے والا ہے اور ان قصابوں میں تم سرفہرست ہو۔ اگر تم فاروق کے ساتھ نہ گئے تو پھر مجھ سے لحاظ داری کی توقع نہ رکھنا۔“ نادیا نے اسے کھری کھری سنا دیں۔ قصاب ایک لمحہ کے لیے لرز کر رہ گیا۔ وہ بازار کا سب سے مہنگا قصاب تھا۔ چند لمحے وہ متفکر کھڑا اپنی موٹر بائیک کی طرح خود بھی کھانتا رہا۔ پھر بادل نخواستہ میرے ساتھ روانہ ہو گیا۔

قصاب تیزی سے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار تھے لیکن اسے کام میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے فون کر کے اپنے ماتحت کو بھی بلوایا تھا۔ کام ختم کرتے ہی قصاب کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا اپنا معاوضہ وصول کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔

اب اہم مرحلہ گوشت کی تقسیم کا تھا۔ امی جان نے چھوٹی بہنوں کی مدد سے جمع شدہ گوشت کے ڈھیر میں سے کلچر، گردے، رانیں، چانپیں اور دوسرا بہترین گوشت الگ کیا اور انھیں لفافوں میں بند کر کے فریزر میں رکھا۔ باقی رہ جانے والا ہڈیوں سے بھرا گوشت رشتہ داروں واقف کاروں اور مساکین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

طاہرہ باجی تھکن اتار رہی تھیں۔ اماں کڑا ہی گوشت، تیخ کباب، بریانی، قورمہ اور دوسرے لذیذ پکوان کی تفصیل سے بچوں کے شوق کو دوبالا کر رہی تھیں۔ اوجھڑی ایک جمعدار کے لیے شاید لفافہ میں ڈال کر الگ رکھ دی گئی تھی۔ کھال ایک بیوہ کے قبضہ میں چلی گئی تھی، جو امی کی پرانی سہیلی تھی۔ گوشت کی نامناسب تقسیم پر مجھے آگے بڑھنا پڑا۔

میں نے آگے جا کے لفافہ ایک طرف رکھوا دیے۔ بچے حیرت سے اماں کا منہ دیکھنے لگے۔

”امی جان اگر آپ قربانی کے فلسفہ سے واقف ہیں تو آپ کو گوشت کی تقسیم منصفانہ کرنی چاہیے۔ قربانی تقویٰ اور قرب الہی کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن اس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سارا سال گوشت نصیب نہیں ہوتا، جو قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے، ان میں قربانی کا

گوشت پہلے تقسیم کیا جائے پھر کسی دوسرے مصرف کے بارے میں سوچا جائے۔ لیکن آپ نے تو سارا اچھا گوشت چھانٹ کے فریزر کی زینت بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس طرح قربانی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ گوشت خوری کی رسم ادا ہوتی ہے۔“

میرا لیکچر سن کر امی جان کا منہ پھول گیا۔ ”فاروق کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو جس نے ۲۰ ہزار روپے خرچ کر کے اہتمام کیا ہے۔ اسے ۲ دن اچھا کھا جائے نصیب نہ ہو۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے بھی گوشت کی بخاری مشورہ دے رکھا ہے۔ آخر ہم اپنی ضرورت کس طرح پوری کر سکتے ہیں اگر صرف دوسروں کے بارے میں سوچ شروع کر دیں؟ جو گوشت بچ گیا ہے وہ لوگوں میں تقسیم جائے گا۔ تمہیں جو چاہیے وہ لے لو۔“ امی جان نے میرے لہجے میں کہا۔ امی لائیے ایک ران مجھے دے دیجیے۔

اسے نادیا کے گھر دے آتا ہوں۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ران؟ امی نے لفظ کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ ”فاروق بیٹا تمہیں اچھی طرح معلوم ہے رانیں تمہاری باجی کے ڈائریکٹرز کے گھروں میں بھجوائی جائیں گی جنھوں نے اس عید پر خصوصی بونس دیا ہے۔“ امی جان نے خشک لہجہ میں کہا۔

”اور امی جان جنھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے قصاب کو پابند کر کے ہمارے گھر روانہ کیا وہ ایک ران کے بھی مستحق نہیں!“۔ امی کے دلائل سن کر میرے سینہ میں آگ سی لگ گئی۔ ”فاروق؟ بیٹا ضد اچھی بات نہیں کہہ لڑکیو! رانیں اٹھا کر فریزر میں رکھو۔“ امی جان نے حکمانہ لہجہ میں کہا۔

اس وقت میرا بچپن کا جگری دوست ڈاکٹر علی بکرے کی ران لے کر آ گیا اور مجھ سے عید مل کر جان سے آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے سب کے سامنے بکرے کی تازہ اور فربہ ران کو نمایاں کرتے ہوئے لہرایا اور پھر ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ امی جان اور بچے مجھے گھور گھور کر دیکھیں۔ ہم سب کی اپنی اپنی ترجیحات تھیں۔ ورنہ عید تو ہر سال آتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شناخت

بے تاب ممتا کی دستک کی کہانی
سننے والے نے اسے اُن سنا کر دیا ہوتا

غلام سکینہ شیخ

انتخاب: محمد زمان خشک
کربوئے شریف، ہنگو

کبھی زخمی کر دینے والی
یادیں بھی فیصلوں کی
راہ میں آٹھٹھکتی ہیں



مہاراج.....
کرکٹ کے
ساتھ کبڈی
میچوں پر بھی پابندی کا نعرہ لگائیے
یہ پاکستانی کسی نہ کسی کھیل میں
جیتنے کا راستہ نکال لیتے ہیں

ملک صاحب! شکریہ ادا کرتے
ہوئے کوئی نہیں روتا، ضرورت
نے وہاں بھی موبائل فون اور
موٹر سائیکل بند کر دیے ہوں گے



مسٹر پریذیڈنٹ.....!
پلیز جلدی سے بتائیے،
دوسری بار صدر کیسے
بننے ہیں.....؟

عمران ہیل بوبی کی
سکراتی
لکیریں





میرا معمول تھا۔ میں روزانہ وہاں سے گزرتی تھی۔ اخبار پڑھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ یاد بھی کرتی تھی۔ کوئی بھی خبر اگر مجھ سے کوئی پوچھتا تھا تو میں پوری خبر سنا دیتی تھی بلکہ یہ بھی بتاتی تھی کہ کس صفحے، کون سے کالم اور کتنی سطروں پر یہ خبر مشتمل ہے۔

لیکن آج کل میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے، اس لیے کہ اخبارات میں تو ڈاکوں، چوریوں، قتل و غارت، جنگوں، اغوا، قیدیوں کی آہوں، ماتم کرتی ہوئی بیواؤں کی فلک شکاف چیخوں، بموں کے دھماکوں سے بکھری ہوئی لاشوں اور سسکتی سانسوں کے سوار کھا بھی کیا ہے۔

اس قسم کی خبریں پڑھنے کے بعد آنکھیں از خود آسمان پر رب جلیل کی طاقت کو جوش دلانے کے لیے اٹھ جاتی ہیں۔ اف خدایا! یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لیے میں نے اخبار نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے اور آج تک اس فیصلے پر قائم ہوں۔

”آج کا تازہ اخبار“ صدائیں لگاتا، گاڑی کے اندر جھانک کر اخبار والا ہاتھ اندر کر کے میری طرف اخبار بڑھاتا ہے تو اس کی اس جرأت پر میں حیران ہونے کے بجائے خوشی سے پرس میں سے پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتی ہوں اور پیسے لے کر اس کے چہرے پر جو میٹھی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے، بس وہ میٹھی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں روزانہ اخبار لینے کے لیے ”بابو“ کے سامنے جا کر گاڑی روکتی ہوں۔

اس نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ اس کا نام ”بابو“ ہے۔

دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ دو سال پہلے اس کا ماموں مر گیا جو اس کے والدین کی موت کے بعد واحد سہارا تھا۔ اس کی ممانی کی التجا پر اخبار والے نے اسے اپنے پاس نوکری دی تھی۔ روزانہ جو چار پیسے کماتا تھا وہ ممانی کی ہتھیلی پر رکھتا تھا۔ ممانی بھی مختلف گھروں میں جھاڑو پونچھا کرتی

تھی۔ دن بھر کی تھکن دونوں کے پیٹ کی آگ بجھانے ہوئے زندگی کی گاڑی کو آگے کی طرف دھکیل دیتی تھی۔ بابو شکل صورت سے کسی امیر کبیر خاندان کا چشم و چراغ لگتا تھا۔ چہرہ اتنا حسین کہ بیان سے باہر رنگ سفید دودھ کی طرح، بڑی بڑی کالی آنکھیں اس کے چمکتے ہوئے چہرے کا مکمل حسن تھیں۔ میں دیکھ کر اکو سوچتی تھی کہ بابو کسی امیر گھرانے کا ہی چشم و چراغ ہے۔ اس کے چہرے پر غربت والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں ہمیشہ اسے مسکراتا پاتی تھی۔ ہمیشہ خوش اور مطمئن۔ کبھی کبھی نہاد ہو کر اچھے کپڑے پہنتا تھا تو بالکل شہزادہ لگتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بابو میری کمزوری بننا گیا۔ میں بابو کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھنے لگی۔ جب تک بابو کوئی دیکھتی تھی تب تک مجھے چین ہی نہ آتا تھا۔ بابو میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بننا گیا شاید اس لیے کہ میں بے اولاد تھی۔ شادی کو عرصہ گزر گیا، مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ بابو کو دیکھ کر میرے اندر کی جاگ اٹھی۔ یہ حقیقت تھی کہ خاندان کے کسی بھی بچے کو دیکھ کر میرے دل میں کشش محسوس نہیں ہوتی تھی اور بابو دیکھتے ہی میں اپنے بس میں نہیں رہتی تھی۔ اس کا سبب شاید بابو کی معصومیت بھری خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

جیسے جیسے دن گزرتے رہے ویسے ویسے بابو میرے بہت قریب آتا گیا، سانسوں اور رگوں سے بھی بہت قریب۔ ایک دن ہمت کر کے بابو کو ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی کی سیٹ پر اندر بٹھایا۔ پہلے اس سے اخبار لیا۔ پیار سے اپنے بازوؤں کے حصار میں بھر کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا:

”بابو! تم میرے ساتھ چلو گے؟ میرے ساتھ رہو گے؟“ میرے گھر میں چل کر بالکل میری اولاد کی طرح۔ میں نے اتنا پیار دوں گی، اتنا پیار دوں گی کہ تمہارے تصور سے زیادہ۔ میرے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے سوائے اولاد کے جب سے تمہیں دیکھا ہے میری جان، میرے اندر کی جاگ اٹھی ہے۔ (بابو بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا) اب

تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بتاؤ بیٹا! بولو میری جان! تم میرے ساتھ چلو گے؟ میں تمہیں ماں کا پیار دوں گی جو تم سے بچپن میں ہی چھین لیا گیا ہے۔ میں تمہارے ہر زخم پر مرہم رکھوں گی۔ میں تمہاری تمام محرومیاں دور کر دوں گی۔ میں تمہارے قدموں میں دنیا کی ہر آسائش رکھوں گی۔ کہو بیٹا! تم چلو گے میرے ساتھ؟ دیکھو بابو، دیکھو میری جان! انکار نہ کرنا۔ میں بڑی امید سے آئی ہوں، مجھے مایوس نہ کرنا، ہاں کہو بابو، ہاں کہو!“

بابو نے عجیب نظروں سے مجھے گھورا اور بیزاری سے پہلو بدل کر کہا:

”نہیں بیگم صاحبہ! میں ایک دفعہ پھر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتا۔ ایک دفعہ پہلے بھی بچپن میں آپ کی طرح ایک امیر بیگم صاحبہ میری ماں کے مرنے کے بعد ممانی سے مجھے زبردستی مانگ کر لے گئی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی کے حسین ترین دن ان کے ساتھ گزارے۔ میں ان کے بغیر اور وہ میرے بغیر ایک بل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ہاں بیگم صاحبہ! ہم دونوں کی ایک دوسری میں جان تھی۔ میں مامتا کا بھوکا تھا اور وہ اولاد کے لیے ترسی ہوئی تھی۔

دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پھر کیا ہوا، ۲ سال کے بعد انہیں اللہ نے اولاد جیسی نعمت سے نوازا اور میری تقدیر نے پلٹا کھایا۔ جیسے جیسے دن گزرتے رہے، میں مامتا کی گود کی گرمی سے محروم ہوتا گیا۔ اپنی اولاد پھر اپنی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ! میں پرانی اولاد تھا، کب تک، آخر کب تک مجھے کوئی حقیقی محبت دے سکتا تھا؟ آخر ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ہاں بیگم صاحبہ! میں اس گھر سے دھکے دے کر نکالا گیا۔ جس گھر میں کچھ دن پہلے میں شہزادوں کی طرح رہتا تھا، جہاں میری خوشیوں کا خیال سانسوں سے بھی زیادہ رکھا جاتا تھا، اب وہاں میرے بچتے ہوئے آنسوؤں کو کسی نے بھی اپنے دامن میں جذب نہیں کیا جو میری بربادی کا ماتم کر رہے تھے۔“

”ہاں بیگم صاحبہ! میں اس گھر سے نکل آیا اور کسی نے مجھے نہیں روکا۔ کسی نے بھی نہیں کیونکہ اب انہیں میری

ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے عارضی زندگی کی عارضی خوشیاں نہیں چاہئیں کیونکہ آپ امیر لوگ، چند دنوں کی خوشیاں دے کر غریبوں کے جذبات سے کھیل کر پھر دھتکار دیتے ہو۔ جب اللہ آپ امیروں کو اپنی حقیقی اولاد سے نوازتا ہے تو آپ کے اندر کی اصلی مامتا جاگ اٹھتی ہے اور پھر آپ امیر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ آپ کے اس رویہ سے ہم غریبوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ہمارے اندر کا انسان ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چورے کی طرح اپنی ہستی کھو بیٹھے گا۔ ہماری شخصیت ہمارے لیے ہی اجنبی بن جائے گی۔ ہم اپنے آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ زندہ وجود ہوتے ہوئے بھی لاش بن جائیں گے۔“

”خدا کے لیے!“ بابو نے دونوں ہاتھوں کو ایک ادا کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہا:

”بیگم صاحبہ! ہم سے ہماری یہ غربت والی شناخت نہ چھینئے۔ ہم غریب ایسے ہی خوش ہیں، بہت خوش۔ ہمیں غربت والی خوشیوں میں ہی رہنے دیں۔ ہمیں امیروں کی طرح مصنوعی خوشیاں نہیں چاہئیں، نقلی اور جھوٹی، پل میں چھننے والی جن کی کوئی گارنٹی نہ ہو۔ ہم کیا جانیں ایسی خوشیوں کو۔ ہم ایسے ہی خوش ہیں۔ ہزار بار خوش ہیں۔“

وہ مسلسل کہہ رہا تھا:

”مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ کہ میں آپ کی خواہش پوری کر کے ایک دفعہ پھر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتا۔“

بابو نے پر وقار طریقے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے خدا حافظ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بابو کی کوئی بھی بات مجھے جھوٹی نہیں لگی۔ اس کا لفظ لفظ سچ تھا، کھلا سچ۔

”آج کا تازہ اخبار“ بابو مختلف آوازیں دیتا ہوا آنے جانے والی گاڑیوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔

اس کی چال میں وقار تھا، اس کی آواز میں اعتماد تھا، اس کے چہرے پر اطمینان، سکون اور خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ بابو پر آخری نظر ڈالتے ہوئے میری پلکوں پر دیر سے رکے ہوئے آنسو گالوں سے گزرتے ہوئے میری جھولی میں جذب ہو گئے اور میرا سر شرم سے جھک گیا۔

ایک دردمند دل کی پکار
جسے یہ بے دردی ایک آنکھ نہیں بھاتی

عمر میرکے تھکے مگر...

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

اُن بے چاروں کی کثرت کیوں ہے
جنہیں اپنی آزادی چھین جانے کا احساس
ہی بہت تاخیر سے ہوتا ہے

کیا کھانا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا پہننا ہے، کس کے ساتھ جانا ہے، کس کی عزت کرنی ہے، کس سے منہ بنانا ہے، کس کے سامنے جھکنا ہے، کسے جھکانا ہے، ہمارے تو سارے ہی اہم اور غیر اہم فیصلے عمر بھر دوسرے کرتے ہیں

یوں

تو انسان کی زندگی غلط فہمیوں سے ہی عبارت ہے مگر سب سے بڑی غلط فہمی جس کا شکار وہ تمام عمر رہتا ہے یہ ہے کہ یہ زندگی اس کی اپنی زندگی ہے، عمر اس کی اپنی عمر ہے، خوشیاں اور غم اس کے اپنے خوشیاں اور غم ہیں۔ اپنی مرضی سے تو خیر آج تک کسی کو اس دنیا میں آنے کی توفیق ہوئی نہیں، دنیا میں وارد ہونے کے بعد بھی تادم مرگ جو کچھ وہ کرتا ہے اس میں بھی اس کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ نومولود تو خیر نومولود

ہوتا ہی ہے کہ جہاں ڈال دیا پڑا رہا، جو منہ میں کسی نے ڈالا اس نے ٹگنا شروع کر دیا، کسی نے ہنسا دیا تو ہنس پڑا رلا دیا تو رو پڑا، مگر ذرا ہاتھ پاؤں اور دماغ چلانے کی صلاحیت مل جائے تو تب بھی اس روبوٹ کو دوسرے ہی چلاتے ہیں۔ کیا کھانا ہے کیا نہیں کھانا، کب سونا ہے کب جاگنا، کب کھیلنا ہے کب پڑھنا ہے، کس کا ادب کرنا ہے کس سے بے ادبی، سارے فیصلے ارد گرد کے ہلے بوڑھے ہی کرتے ہیں جن کے قابو میں وہ قسمت سے آ جاتا ہے۔ ابھی بمشکل تین سال کا ہوتا ہے کہ ایک

ریموٹ کنٹرول اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور زندگی دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔
سکول میں زندگی کو میچر کنٹرول کرتا ہے اور گھر میں ماں باپ، دونوں جگہ کوشش بس یہی ہوتی ہے کہ کوئی کام اپنی آزاد مرضی سے نہ کر سکے۔ صبح کتنے بجے اٹھنا ہے، ناشتہ کیا اور کیسے کرنا ہے، سکول میں کیا لے کر جانا ہے، بستے کا بوجھ کتنا ہوگا، کون سی کتابوں سے مغز مارنا پڑے گا، کن ساتھیوں کے ساتھ کھیلنا ہوگا، کس استاد کے آگے پر نہیں مارنا، کس استاد کو پڑھانے نہیں دینا۔ بریک کے دوران کس کینٹین سے کیا اور کتنے میں لینا ہے، اس کا فیصلہ بھی سکول والے ہی کرتے ہیں۔ مبادا وہ گھر پہنچ کر سکول کی گرفت سے آزاد ہو جائے اسے اتنا ہوم ورک ضرور دے دیا جاتا ہے کہ جس کی وجہ سے اسے بار بار سکول یاد آتا رہے۔ اس دوران ماں باپ بھی اپنے فرائض بزرگی سے غافل نہیں رہتے، ”بیٹا جلدی سے ہوم ورک کرلو“، ”ٹی وی کے سامنے زیادہ دیر نہ بیٹھو“، ”کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرو“، ”فضول چیزیں مت کھاؤ“، ”بڑے بھائی کو تنگ مت کرو“، ”کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرو“، ”چھوٹی بہن کے پاس شور مت کرو“، ”جلدی سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے“، وغیرہ وغیرہ جانے کتنی ہدایات ہر قدم اور ہر لمحہ جاری ہوتی رہتی ہیں۔

اتفاق سے گھر میں بڑا بھائی اور بہن ایک دو بزرگ از قسم دادا، دادی، نانا، نانی یا خالہ پھوپھی بھی ہوں تو پھر سمجھ نہیں آتی کہ اتنے زیادہ ڈائریکٹروں کی موجودگی میں زندگی کی فلم چلے گی تو کیسے، اور چلے گی تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بعض اوقات یہ بد قسمتی بھی ہوتی ہے کہ ایک ڈائریکٹر زندگی کو مشرق کی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگا ہوتا ہے تو دوسرا مغرب کی طرف، کوئی ایکسیلیٹر دبا رہا ہوتا ہے اور کسی نے بریک پر پاؤں رکھے ہوئے ہوتے ہیں، کوئی سٹیئرنگ کو دائیں طرف گھمانے پر زور لگا رہا ہوتا ہے تو دوسرا بائیں طرف۔ ایک کلچ چھوڑتا ہے تو دوسرا گھیر لگا دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کی گاڑی پٹری

سے اتر کر شمال یا جنوب کی طرف نکل کر کسی نہ کسی دلدل میں پھنسی کھڑی ہوتی ہے۔ اور سارے ڈائریکٹر ارد گرد کھڑے لعنت ملامت کر رہے ہوتے ہیں کہ ”ہم نہ کہتے تھے یہ نہ کرو ورنہ وہ ہو جائے گا۔“ ”ادھر نہ جاؤ ورنہ ادھر نکل جاؤ گے۔“ ”باز آ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔“ ”لو چکھ لو آج مزہ۔“

ہماری رائے میں زندگی کا آزاد ترین دورانیہ کالج یا یونیورسٹی کا ہوتا ہے جب انسان اگر پڑھنے پڑھانے اور ”میں ڈاکٹر بن کر اپنی قوم کی خدمت کروں گا“ یا ”میں انجینئر بن کر بے روزگار پھروں گا۔“ جیسے احمقانہ خیالات اپنے دل سے نکال دے تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں کوئی ایسا الٹا سیدھا کام نہیں ہے جو آپ کرنا چاہتے ہوں اور کالج کی انتظامیہ پروفیسر صاحبان طلبہ تنظیمیں، مذہبی اور سیاسی جماعتیں اس میں داسے درمے سخنے امداد نہ کریں۔ اس زمانے میں آپ جی بھر کر وقت ضائع کر سکتے ہیں (اپنا اور دوسروں کا)، ہر سپیڈ لمٹ کو توڑ سکتے ہیں، ہر اخلاقی ضابطے کو پامال کر سکتے ہیں۔ زندگی کے یہ سنہری دن انسان کو زرتیں موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ سارے لوگ خاص طور پر ماں، باپ، بھائی، بہن، بڑے بوڑھے جواب تک اس کی زندگی سے کھیلے رہے ہیں وہ بھی جی بھر کر ان کی زندگیوں سے کھیلے۔ زندگی میں یہ سنہری موقع پھر کبھی نہیں آتا۔ جس نے اسے کھو دیا وہ ساری عمر پچھتا تا رہا کیونکہ عملی زندگی آ کر جب اپنے شکنجے کستی ہے تو اس میں ادھر ادھر بھاگنا تو کیا، دائیں بائیں ہلنے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔

عملی زندگی کے ۲ پہلو ہیں شادی اور روزگار اور دونوں کے ضمن میں ہمارے نوجوانوں کو جتنی آزادی حاصل ہے ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں۔ شادی تو خیر دور کی بات ہے کہ وقت سے پہلے ڈولھا کو دلہن دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی، شادی کے بعد کسی زمانے میں میاں بیوی کو کم از کم بچے پیدا کرنے کی آزادی ہوا کرتی تھی۔ مگر افسوس اب خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے نے وہ

بھی چھین لی ہے اور وہی یہ فیصلہ کرتا ہے کون کب اور کتنے بچے Afford کر سکتا ہے؟ زمانہ بعد از شادی کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر خاوندوں کو یہ آزادی بھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کے ساتھ بیوی کی غلامی کر سکیں۔ ماں باپ، بھائی، بہن، عزیز اور رشتے دار اس آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ بعض عقلمند لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ بیک وقت دونوں غلامیوں کا طوق گلے میں ڈالے رکھیں۔ ماں باپ ملیں تو ان کے پاؤں چھوئیں اور بیوی کا سامنا ہو تو اس کے سامنے ناک رگڑ دیں مگر پھر جھگڑا اس بات پر کھڑا ہو جاتا ہے کہ زیادہ غلام کس کا ہے۔ اکثر بیویاں یہ زیادتی کرتی ہیں کہ اپنا غلام تو بناتی ہی ہیں ”love me & love my dog“ کے مصداق سواری اچھی ہو تو نکیل ہاتھ میں لے کر اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو بھی ساتھ سوار کرا لیتی ہیں۔۔۔۔۔

”چل میرے گھوڑے ٹک ٹک ٹک“

جہاں تک روزگار کے مواقع کا تعلق ہے اس کا انحصار

ملک کی اقتصادی حالت پر ہوتا ہے۔ ملک کی اقتصادی حالت کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور حکومت کا تعلق اس بات کو یہیں چھوڑیے کہ بات کہیں دور نہ نکل جائے اور روزگار کی طرف پلٹ آئیے۔ خواہش تو ہر نوجوان کی (فلمی) ستاروں پر کمند ڈالنے کی ہی ہوتی ہے مگر اس کا فیصلہ ہمیشہ ماں باپ اور ان کا روپیہ پیسا اور اثر و رسوخ ہی کرتے ہیں۔ جن کے ماں باپ لمبے ہاتھ مار چکے ہوں ان کی اولاد کے لیے بھی لمبے ہاتھ مارنا آسان ہو جاتا ہے۔ باقی نوجوان اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ جب بھی روزگار کے کسی اچھے کنارے لگنا چاہتے ہیں حالات کی کوئی نہ کوئی لہر انہیں دھکیل کر پھر ساحل مراد سے دور کر دیتی ہے۔ روزگار میں نوکری ہے تجارت ہے اور صنعت نوکری کے بارے میں تو خیر یہ کھلا راز ہے کہ اس میں انسان آتا بھی کسی اور کی مرضی سے ہے رہتا بھی کسی اور کی مرضی سے ہے اور جو کچھ اس دوران کرتا ہے وہ بھی کسی اور کی مرضی سے۔ اور آزادی تو ان بیچاروں کو کیا ہونی ہے ان کے لیے تو یہ فیصلے بھی کوئی اور کرتا ہے کہ امانت کا دامن پکڑنا ہے یا خیانت کا، رشوت لینی ہے یا دینی ہے، لینی ہے تو کب کس سے اور کیسے لیتی

ہے اور لی ہے تو کب کہاں اور کیسے خرچ کرنی ہے۔ رشوت دینی ہے تو کب کس کو اور کیسے دینی ہے اور دی ہے تو اس کا حساب کتاب کب کس کو اور کیسے دینا ہے۔ اس لیے نوکری پیشہ سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

تجارت اور صنعت کے بارے میں کئی لوگوں کو یہ خوش فہمی ہے کہ شاید ان میں انسان کی اپنی مرضی چل سکتی ہے۔ ہماری رائے میں اس خوش فہمی میں صرف وہ لوگ رہ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی بجلی کا بل ادا نہیں کیا، جنہوں نے کبھی گیس کی ”آنیاں جانیاں“ نہیں دیکھیں، جنہوں نے کبھی روپے کو سر کے بل گرتے نہیں دیکھا، جنہوں نے کبھی کسی لائسنس اور پرمٹ کے لیے درخواست نہیں دی، جنہوں نے کبھی قواعد و ضوابط کی مار نہیں سہی، جنہوں نے کبھی سرخ فیتے کا نظارہ نہیں کیا، جنہوں نے کبھی ٹیکس لگتے نہیں دیکھے، جنہوں نے کبھی ڈیوٹیاں (Duties) چھوٹی نہیں دیکھیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لائسنس طلب
اس پارک میں آخرائے اکبر ہم نے تو ٹھلنا چھوڑ دیا

جس ملک میں پارک میں داخلے کے لیے دس جھیلے

ہوں، جہاں بیوی کے ساتھ کھونے میں دس جگہ پوچھ پچھ کا خدشہ ہو، جہاں بچوں کو نرسری میں داخلے کے لیے زور اور زر کی ضرورت پڑے، جہاں ایک ریڑھی لگانے کے لیے ۱۰ محکموں کو خوش کرنا پڑے وہاں کوئی شخص اپنی مرضی سے تجارت کر سکے یا کارخانہ لگا سکے؟

ایں خیال است و محال است و جنوں

پیسالگانا ہو تو پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ ”کہاں سے آیا ہے یہ پیسا“ اور اگر کمانا ہو تو سوال کرنے والے سوال کرتے ہیں ”کہاں لے جاؤ گے یہ پیسا“ سو لوگ پیسا لگاتے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں، کماتے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں اور جب کمالیں تو پھر کھاتے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں۔

اوپر نیچے سے پیسا بنانے کے لیے عمر کے آخری حصے میں لوگ جس طرح زور لگاتے ہیں اس میں صرف ایک ہی خواہش کو عمل دخل ہوتا ہے کہ میرے بعد میرے بچوں کو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ دنیا تو خیر دنیا ہے کئی لوگ بچوں کے لیے اپنی آخرت بھی برباد کر کے ہی اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

خوشی کیوں.....؟

ارسطو نے ایک بار کہا تھا کہ انسان کسی بھی چیز سے زیادہ خوشی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد خوش ہونا چاہتا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ کھلے جام اس کا اظہار نہیں کرتے یا پھر مختلف الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم میں عظیم اکثریت شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کا بہترین حصہ خوشی، سکون اور اطمینان کی تلاش میں گزارتی ہے۔

انسان خوشی اور سکون کی تلاش میں سرگرواں ہے۔ اس کے لیے وہ ہر چیز کرنے اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات وہ گناہ میں بھی ملوث ہو جاتا ہے۔ گناہوں سے انسان کو وقتی لذت حاصل ہوتی ہے مگر خوشی اور سکون نہیں۔

خوشی کیا ہے؟ ہر فرد اس سے آگاہ ہے، تاہم خوشی سے مراد زندگی سے لطف اندوز ہونا اور اچھا محسوس کرنا ہے۔ ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ احساس ہمیشہ اس کے ساتھ رہے مگر یہ دنیا خوشی، آرام اور سکون کے لیے نہیں بنائی گئی۔ دائمی خوشی اور سکون انسان کو جنت ہی میں ملے گا۔

ہمارا قول یہ ہے کہ ۴۰ سال کے بعد انسان صرف اپنے بچوں کے لیے زندہ رہتا ہے اور صحیح معنوں میں اس کے بچے اس کی زندگی گزارتے ہیں۔ کب اٹھنا ہے، کب سونا ہے، کیا پکنا ہے، کیا کھانا ہے، کہاں رہنا ہے، کب تک رہنا ہے، کہاں سے کیا بچت کرنی ہے، کس چیز پر کیا خرچ کرنا ہے، ہر چیز کا فیصلہ بچوں کی طرف دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ بچے تو خیر زندگی کے مالک بن ہی جاتے ہیں ان کی خاطر اور بھی بہت سوں کو سر پر بٹھانا پڑتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے معتبر لوگوں کو پرائمری سکول کے بچروں کے آگے منمناتے دیکھا ہے۔ امتحان میں بیٹھتے بچے ہیں امتحانات ان کے والدین دیتے ہیں۔ جتنی محنت بچے پیچھے پھسلنے کے لیے کرتے ہیں ان سے دو گنا زور والدین کو انہیں آگے دھکیلنے کے لیے لگانا پڑتا ہے۔ ڈگریوں کا شوق بچوں کو کم ہوتا ہے والدین کو زیادہ، اس لیے ظاہر ہے محنت بھی انہی کو کرنی پڑتی ہے۔۔۔۔۔

اس نے ہی آخر لگایا زور اور زر تب ٹلی
باپ کی خواہش تھی بیٹا ہونی ڈگری چاہیے

اور جنہوں نے بہت غربت میں پرورش پائی۔ لہذا آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا اصل راز اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور اللہ پر بھروسہ رکھنا ہے۔

اکثر یہ الفاظ دہراتے رہا کریں۔ ”یا اللہ! مجھے اپنی رضا میں راضی کر لے۔ مجھے ویسا بننے کی توفیق دے جیسا تو اپنے بندوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔“

یہ مشق تسلیم و رضا سیکھنے کے لیے بہترین ہے۔ ہمیں زندگی میں دو طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں ذرا سی تکلیف پہنچے یا ذرا سادھ ملے تو گلہ ان کی زبان پر آ جاتا ہے۔ ایک وہ بھی چھب جائے تو وہ ساری کائنات کے خلاف بولنے لگتے ہیں کہتے ہیں ”جب سے چاند ستارے بنے ہیں مجھے کوئی نہ کوئی تکلیف رہتی ہے۔“ یہ وہی لوگ ہیں جن کی پر بہار زندگی میں اگر خزاں کا ایک پتا بھی گرے تو یہ ناشکری کرتے ہیں۔ پھولوں بھری زندگی میں ایک کانٹا بھی آجائے تو گلہ کرتے ہیں۔ یہی ہمیشہ برسنے والی رمتوں، عنایات اور عطاؤں کی بارش بھول جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھتے ہیں تو لو کا وہ ایک تھپیڑا جس نے کبھی انہیں ہلکے سے چھوا تھا۔ یہی وہی لوگ ہیں جو جوتا گم ہونے پر چلنا چھوڑ

ممکن ہے وہ لوگ نظر آ جائیں جو مال و دولت، مرتبہ، تعلیم میں آپ سے کم، لیکن شکرگزاری میں آپ سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

ایک مقولہ مشہور ہے ”جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا، وہ اللہ کا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے؟“

اللہ کے بندوں کا شکر گزار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم وہ بھلائیاں اور نیکیاں یاد رکھیں جو انہوں نے ہمارے ساتھ رکیں۔ جب دوسروں میں کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں تو اپنے گریبان میں جھانک لیا کریں؟ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں اپنی کوتاہیاں دوسروں کی خامیاں بیان کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ جو لوگ اپنی کوتاہیوں پر نگاہ رکھیں، عموماً وہ دوسروں سے گلہ، شکوہ کم کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو اپنے حالات، ماحول، خاندان، کم وسائل سے شکوہ ہوتا ہے۔ وہ جب دوسروں کو سبقت لے جاتے دیکھیں تو نامناسب حالات، محدود مواقع اور غیر فائدہ مند خاندانی پس منظر کا گلہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں بہت سی نامور اور عظیم شخصیات ایسی گزری ہیں جن کا تعلق انتہائی عام خاندانوں سے تھا



کچھ لوگ زندگی کے ڈھیر خوشگوار لمحوں میں سے کوئی ناخوشگوار لمحہ ڈھونڈ کر کیلنڈر کی صورت دیوار پر لگا لیتے اور پھر ہر وقت اسے یاد کر کے آپس بھرتے، تقدیر سے گلہ اور ناشکری کرتے ہیں

زندگی کے ایام بدر کو اماوس کی رات بنا لینے والوں کا تذکرہ جو جوتا گم ہونے پر چلنا ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں

خوشیوں کی پوٹلیوں سے دکھوں کی تلاش میں رہنے والوں کے لیے

شکر گزار بنیے

رخسانہ بشیر



ہیلن کیلر کا نام آپ نے سنا ہوگا جسے مارک ٹوئن نے انیسویں صدی کی سب سے دلچسپ شخصیت قرار دیا تھا۔ ہیلن کیلر بینائی، گویائی اور سماعت سے محروم تھی، وہ محض لمس محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے اندر کچھ کر دکھانے کی طلب نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا، کہ وہ اتنی محرومیوں کے باوجود نامور خاتون بن گئی۔ اس نے اپنی آپ بیتی میں ایک کمال کی بات لکھی۔ ”میں خوش ہوں کہ میرے خدا نے میرے اوپر بڑا کرم کیا۔ اگر یہ ساری چیزیں، یہ ساری نعمتیں..... بینائی، گویائی اور سماعت مجھے ملی ہوتیں تو میں دنیا کی ایک نامور عورت نہیں معمولی سی گھریلو عورت ہوتی۔“

شیخ سعدی کے پاؤں میں جوتا نہ تھا اور یہی بات اندر ہی اندر انہیں ملول کر رہی تھی۔ جنگل میں چلے جا رہے تھے کہ ایک اپانچ کو دیکھا جو بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ پاؤں ہی نہ تھے، لیکن پھر بھی وہ شکر گزار تھا۔ شیخ سعدی بہت متاثر ہوئے اور شکر کیا کہ ان کے جوتے ہیں سو شکرگزاری سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ بھی ہے کہ سراغ کر دیکھنے کے بجائے کبھی سر جھکا کر بھی دیکھ لیا جائے۔

اس کے لیے رن وے اور پل سبجراؤنجر
بھی بڑے بنانے پڑتے ہیں

ڈبل ڈیکر طیارہ جو ایک ٹرین
کے برابر مسافر لے کر آؤسکتا ہے

ایئربس A-380

فقیر اللہ خان

کمپنی مختلف سائز اور ڈیزائن کے طیارے تیار کر چکی تھی جن میں A-300، A-310، A-320، A-340 اور A-350 شامل ہیں اور اب ایئربس کمپنی کا آخری شاہکار عوام کی نظروں کے سامنے تھا۔ شہری ہوابازی کی صنعت لا محدود ترقی کی منازل طے کرنے کی طرف گامزن ہے۔ اسی صنعت کا آخری طیارہ ایئربس A-380 ہے جو اپنے اندر ۸۵۳ مسافروں کو بٹھا کر ہوا کے دوش پر جہاں چاہے اڑنے کے لیے پرتول رہا تھا۔

۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۰۵ء تک فضائی حکمرانی میں ابھی تک بوئنگ کمپنی کے ۷۴/۷ جیو جیٹ کا طوطی بول رہا

اکیسویں
صدی کا آغاز ہوتے ہی
شہری ہوابازی کی دنیا میں
ایک ایسے پرندے نے
آنکھ کھولی کہ اُس کے
سامنے بڑے بڑے شہباز بھی مو لے دکھائی دینے لگے۔
۲۰۰۵ء کی صبح پیرس میں ایئر شو کے ایک
سٹیج میں لوگوں کا ٹھانٹھاں مارتا ہوا سمندر ایک ایسے
جہاز کو دیکھنے کے لیے اُمند آیا تھا، جسے ایئربس A-380
کا نام دیا گیا تھا۔ اس جہاز کو فرانس کی ہی ایک طیارہ ساز
کمپنی ایئربس نے متعارف کرایا تھا۔ اس سے قبل ایئربس

اللہ! تو ہمیشہ سے مجھ پر مہربان ہے، میں نے جب بھی اس
کی طرف ایک قدم بڑھایا تو وہ دس قدم ضرور میری طرف
آیا ہے۔“ یہی لوگ ہیں جن کے پاس جو تا تو درکنار پاؤں
بھی نہیں ہوتے پھر بھی زبان پر شکوہ نہیں لاتے۔

یہی وہی لوگ ہیں جو ہیلن کیلر کی طرح محرومیوں کو
نعمت کہتے ہیں۔ ناخوشگوار لمحوں کو کارٹون بنا کر ان پر
رنجیدہ ہونے کے بجائے ہنسنے کا ہنر سیکھتے ہیں۔ آدھا خالی
گلاس دیکھ کر پریشان ہونے کے بجائے آدھا بھرا ہوا
گلاس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وقت کے تاریک جنگل
سے ملنے والے جگنو جیسے ایک پل کو بھی مٹھی میں قید کر کے
ساری زندگی روشن کر لیتے ہیں، زندگی کے پتے صحرا میں
اڑتی ریت کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اکا دکا سایہ فراہم
کرتے، درختوں کی بات کرتے ہیں۔

یہی لوگ ہر کھن لمحہ میں اپنے آپ سے بہت
دھیرے سے پریقین انداز میں کہتے ہیں:
”جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے، صحیح کرتا
ہے۔“

یہی مقصودِ فطرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے
جب ان کے سپنے بکھریں اور ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دل
میں ترازو ہوں تو وہ فگار دل اور چھلنی جگر کے ساتھ بھی
چہرے پر مسکراہٹ سجانے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ وہ چپکے
چپکے اللہ سے کہتے ہیں ”اگر تو اس بات میں راضی ہے تو
پھر میں بھی راضی ہوں۔“

سوال یہ ہے کہ پہلی قسم کے لوگوں سے نکل کر دوسری
صف میں کھڑے لوگوں میں شامل ہونا ہمیں کب آئے گا؟
گلے، شکوے، شکایات، ناشکری اور بے جا تقاضے
سے نکل کر شکر گزار اور تسلیم و رضا کے مرحلہ میں ہم کب
داخل ہوں گے؟

یہ وہ سوالیہ نشان ہیں جن پر سوچنے کی ضرورت ہے
تاکہ ہم نعمتوں کا ادراک اور اعتراف کر سکیں۔ کیونکہ
قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے۔ ”اگر تم شکر کرو گے تو میں
تمہارے لیے نعمتوں کو بڑھا دوں گا۔“

کچھ لوگ آدھا خالی گلاس دیکھ
کر پریشان ہونے کے بجائے
آدھا بھرا ہوا گلاس دیکھ کر خوش
ہوتے ہیں۔ وقت کے تاریک
جنگل سے ملنے والے جگنو جیسے
ایک پل کو بھی مٹھی میں قید کر کے
ساری زندگی روشن کر لیتے ہیں

دیتے ہیں۔ محرومی کے چھوٹے نقطے کو پھیلا کر زندگی کے
ایام بدر کو بھی اماؤں بنا لیتے ہیں۔

ان ہی کی نظریں شیشے پر چسپاں مری مٹھی پر جا ٹھہرتی
ہیں، لیکن شیشے کے اس پار تاحہ نگاہ سے پھیلا حسن و جمال
محسوس نہیں ہوتا۔

یہ وہی لوگ ہیں جو خوشیوں کی پوٹلی میں سے چھانٹ
چھانٹ کر دکھ نکالتے ہیں اور پھر انہیں تعویذ بنا کر گلے میں
ڈال لیتے ہیں۔

یہی لوگ زندگی کے ڈھیر سارے خوشگوار لمحوں میں
سے کوئی ناخوشگوار لمحہ ڈھونڈ کر کیلنڈر کی صورت دیوار پر لگا
لیتے اور پھر ہر وقت اسے یاد کر کے آہیں بھرتے، تقدیر
سے گلہ اور ناشکری کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا
جائے یا چھاؤں میں ان کے دل کا پیمانہ شکر گزاری اور
احسان مندی کے جذبات سے لبالب رہتا ہے۔

ان کی خزاں زدہ زندگی میں بہار کا ایک معطر جھونکا
بھی بہت معنی رکھتا ہے وہ اس جھونکے کو ساری زندگی یاد کر
کے اپنی جس زدہ زندگی مہکاتے رہتے ہیں۔

خوشی کا ایک لمحہ عطا ہونے پر بھی کہتے ہیں ”میرے

تھا۔ ۲۰۰۵ء میں ایئر بس کمپنی نے ایک ایسا طیارہ متعارف کرایا کہ سول ایوی ایشن میں ایک زبردست انقلاب آگیا۔ دنیا کی تمام فضائی کمپنیوں اور مسافروں نے اس طیارے کو دل و جان سے خوش آمدید کہا اور اس پذیرائی کا نتیجہ حقائق اور ہندسوں کی شکل میں نہایت چونکا دینے والا ہے۔ اس لیے اس جہاز کو سپر جمبو جیٹ کا بھی نام دیا گیا ہے۔

۱۔ یہ ۲ منزلہ جہاز ہے، جس میں نشستوں کی کل تعداد ۸۵۳ ہے۔ پہلی منزل میں ۵۳۸ اور دوسری منزل میں ۳۱۵ نشستیں ہیں جو کہ سب کی سب اکانومی کلاس کے لیے ہیں۔

۲۔ اگر جہاز کی دونوں منزلوں میں تینوں مروجہ یعنی فرسٹ کلاس، بزنس کلاس اور اکانومی کلاس کی نشستیں بھی لگائی جائیں تو مجموعی نشستوں کی تعداد ۵۲۵ ہے جو کہ بوئنگ جمبو جیٹ ۷۴۷ سے ۱۰۰ نشست زیادہ ہے۔

۳۔ ایئر بس A-380 کے پرواز بھرتے اور اترتے وقت جمبو جیٹ سے ۵۰ فیصد کم شور سنائی دیتا ہے۔

۴۔ ایئر بس A-380 کا زیادہ سے زیادہ فضا میں دائرہ پرواز ۱۵۴۰۰ کلومیٹر ہے یعنی یہ جہاز آرام سے نیویارک سے پرواز کر کے ہانگ کانگ تک بغیر کہیں رُکے اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے جبکہ نیویارک سے ہانگ کانگ کا فضائی فاصلہ ۱۲۹۸۳ کلومیٹر ہے۔

یہ جہاز اتنا عظیم الجثہ ہے کہ اس کے آس پاس کھڑے ہوئے جہاز بھی اپنا دامن، منہ اور دم چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایئر بس سیریز کا فی الحال آخری جہاز ہے۔ ابھی آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ گویا اب یہ ایئر بس A-380 پوری ۱۰ بوگیوں والی ٹرین کی سواریاں اٹھا سکتی ہے۔ اگر ہم اسے ایک فضائی ٹرین بھی کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس جہاز کی دونوں منزلوں میں ۸۵۳ مسافروں کی دیکھ بھال کرنے والے عملے کی تعداد ۲۰ ہے۔ جن میں

۱۲ نیچے والی منزل میں اور ۸ اوپر والی منزل میں اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھالے کھڑے ہوتے ہیں جبکہ کاک پٹ میں ایک پائلٹ اور ایک اسسٹنٹ پائلٹ بیٹھتا ہے۔

جب ۲۰۰۵ء میں ایئر بس کمپنی نے اپنا یہ جہاز متعارف کرایا تو اس کی کارکردگی دیکھ کر اکثر فضائی کمپنیوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ان فضائی کمپنیوں میں سب سے پہلے جنوبی ایشیا کے چھوٹے سے جزیرے سنگاپور کی ایئر لائن نے ایئر بس کی پیشکش کو قبول کیا اور پھر سنگاپور ایئر لائن نے ۲۰۰۷ء میں ایئر بس A-380 کو اپنے فضائی بیڑے میں شامل کر لیا۔ اس طرح سنگاپور ایئر لائن سپر جمبو جیٹ A-380 کو خریدنے والی پہلی کمپنی بن گئی۔ اس کے بعد تو گویا ایئر بس انڈسٹری کے پاس A-380 کے آرڈرز کی لائن لگ گئی۔ ابھی اگست ۲۰۱۲ء تک دنیا کی ۲۵ فضائی کمپنیوں نے A-380 خریدنے کا آرڈر دے دیا ہے اور ان کمپنیوں میں A-380 کی سب سے بڑی خریدار امارات ایئر لائن ہے جس نے ۹۰ (A-380) جہاز خریدنے کا آرڈر دیا ہے۔

ایئر بس A-380 کی پیداوار شروع ہونے سے لے کر ستمبر ۲۰۱۲ء تک ۸۱ جہاز دنیا کی فضائی کمپنیوں نے خرید لیے ہیں اور بڑی کامیابی سے وہ جہازوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان میں سنگاپور ایئر لائن، ایمیرٹس (امارات)، قنطاس (Qantas)، لفتھانسا، ایئر فرانس، کورین ایئر لائن، ملائشین ایئر لائن اور چائنا ساؤدرن ایئر لائن بھی شامل ہے۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۰ء تک پہلے ۳ سال ڈیڑھ کروڑ مسافران جہازوں میں سفر کر چکے ہیں۔

سنگاپور ایئر لائن نے ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو A-380 سے اپنی پہلی پرواز کا آغاز سنگاپور سے سڈنی کے لیے کیا۔ ایمیرٹس دوسری فضائی کمپنی تھی جس نے دبئی سے نیویارک کے لیے اپنی پہلی نان سٹاپ پرواز اگست ۲۰۰۸ء میں

شروع کی۔ Qantas (آسٹریلین فضائی کمپنی) نے ۱۸ ستمبر ۲۰۰۸ء کو اپنی پہلی پرواز میلبورن سے لاس اینجلس تک چلائی اور ملائشین ایئر لائن نے جولائی ۲۰۱۲ء کو کوالالمپور سے لندن تک نان سٹاپ پہلی پرواز کا آغاز کیا۔

۲۰۰۸ء کے آخر تک ایئر بس A-380 کی پروازوں میں ۸ لاکھ مسافر سفر کر چکے تھے اور ۲۲۰۰ پروازوں کے ۲۱۰۰۰ گھنٹے فضا میں ہی گزرے۔ A-380 میں بورڈنگ کے وقت مسافروں کو ان کی نشستوں پر بٹھانے کے لیے صرف ۳۴ منٹ درکار ہوتے ہیں جبکہ جمبو جیٹ ۷۴۷ جو کہ ایئر بس A-380 سے بہت چھوٹا جہاز ہے، اُس میں مسافروں کو سوار کرانے کے لیے کم از کم ۳۵ منٹ کا وقت درکار ہوتا ہے۔

اس طرح کے عظیم الجثہ اور دیوبیکل جہاز بنانے کا خیال اس سے قبل بوئنگ کمپنی کو بھی آیا تھا، لیکن نہ جانے کون خدشات کے پیش نظر بوئنگ کمپنی نے یہ منصوبہ ۱۹۹۲ء میں ختم کر دیا لیکن یہ ایئر بس کمپنی ہی تھی جس نے اس بڑے مسافر طیارہ بنانے کے خواب کو تعبیر دی۔ اس جہاز A-380 میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو ہر ۳ منٹ بعد نیا تازہ ہوا مل جاتی ہے، جس سے مسافروں کو جہاز پر اترتے وقت بہت کم تھکان کا احساس ہوتا ہے۔ اس جہاز کی دونوں منزلوں کے اطراف میں ۲۵۲ سے بڑی کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے وافر مقدار میں قدرتی روشنی جہاز کے اندر پہنچتی ہے۔ جہاز کی پہلی کلاس پر آگے اور پیچھے ۲ سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعے

اوپر والی منزل میں پہنچا جاسکتا ہے۔ A-380 کی دونوں منزلوں میں ڈیوٹی فری شاپس کے کاؤنٹر بھی بنائے گئے ہیں۔ جہاں مسافر اپنی من پسند گھڑیاں، سگریٹ، فینسی طرز کے بال پن اور دوسرے سووینیر خرید سکتے ہیں۔ طویل فلائٹ کے پیش نظر مسافروں کو ناشتا، لُچ، ڈنر اور ڈرنکس مختلف وقفوں سے پیش کیے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ A-380 ایئر بس کی لمبی پروازوں میں عملے کی کوشش ہوتی ہے کہ مسافر کم سے کم بوریت محسوس کریں۔ مسافروں کی نشست پر ٹی وی، سی ڈیز کی سہولت کے علاوہ لیپ ٹاپ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایئر بس A-380..... ایک نظر میں

لمبائی		۲۳۹ فٹ
اونچائی		۷۹ فٹ
پروں کا پھیلاؤ		۲۶۲ فٹ
دائرہ پرواز		۱۵۴۰۰ کلومیٹر
مستعمل تاروں کی لمبائی		۵۳۰ کلومیٹر
تاروں کا وزن		۵۸۰ ٹن
اکانومی نشستوں کی تعداد		۸۵۳
رفتاری گھنٹہ		۹۰۰ کلومیٹر
انجن (رولس رائس)		۴
تیل کی گنجائش		۳۲۰۰۰۰ لیٹرز
قیمت		۱۳۶ ارب روپے

جس طرح کہا جاتا ہے کہ اگر بڑے بڑے راجوں مہاراجوں سے یاری لگانی ہو تو اپنے گھروں کے دروازے نہ صرف بڑے بلکہ اونچے رکھنے پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جن ملکوں کی فضائی کمپنیاں ایئر بس A-380 استعمال کر رہی ہیں، انھوں نے اپنے ہوائی اڈے، رن وے اور پنجر لاؤنجر بھی وسیع اور کشادہ کر لیے ہیں تاکہ جہاز کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔

کمزور درد سے کیسے بچیں

کیا غیر معمولی تھکاوٹ یا سردی لگنے کے باعث یہ درد آپ کو اپنا شکار بنا سکتا ہے؟

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

ایک

اندازے کے مطابق ۸۰ فیصد سے بھی زیادہ لوگ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں کمزور درد کا شکار ہو جاتے ہیں جو زیادہ تر سرد موسم میں ہوتا ہے۔ یہ کمزور درد عام طور پر معمولی نوعیت کا ہوتا ہے اور ایک سے لے کر ۳ راتوں تک معمولی آرام اور عام دوائی، درد کش مرہم، ہلکی مالش یا گرمائش سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ درد غیر معمولی کام کی تھکاوٹ، کام کرتے ہوئے کمر کی ہڈی پر جھٹکا، سوتے ہوئے غیر مناسب جسمانی حالت یا کمر سے کپڑے کے ہٹے رہنے کی وجہ سے کمر کے مسلسل سردی میں رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے درد کا شکار فرد اگر غور کرے اس کو ان اسباب میں سے اگر کوئی ہو تو یاد آ جاتا ہے اور یہ معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔

اگر درد ۳ دن سے زیادہ رہے یا شروع میں ہی شدید ہو جائے اور وجہ معلوم نہ ہو تو دیکھنا چاہیے کہ درد کے ساتھ ساتھ پیٹ کا کوئی حصہ تو متاثر نہیں پیٹ کو ہاتھ لگانے سے درد تو نہیں ہو رہا۔

☆ نبض میں کوئی بے ترتیبی، کمزوری، بلڈ پریشر میں کمی یا غیر معمولی جسمانی کمزوری تو نہیں ہے۔ ایسا خون کی نالیوں میں کسی نقص کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

☆ اگر مریض کی عمر ۲۰ سال سے کم ہے اور کمر کی ہڈی پر کوئی سوجن یا چھوٹے ہوئے درد کا احساس ہوتا ہے تو یہ کسی بڑی تکلیف کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ اگر عمر ۴۰ سال سے کم ہے اور درد آرام کرنے سے بڑھے اور حرکت کرتے ہوئے کم ہو جائے تو ایسا

(Ankylosing Spondilitis) یا کسی ایسی ہی بیماری کے باعث ہو سکتا ہے۔

☆ ۵۰ سال کی عمر کے بعد درد کا بغیر کسی وجہ سے ہونا بھی احتیاط کا معاملہ ہے کیونکہ ایسا درد جسم کے کسی عضو کی بیماری کے سبب کمر کی ہڈی تک کے پھیلاؤ کے باعث ہو سکتا ہے۔ پروٹینٹ کا کینسر اس کی ایک وجہ ہے۔

☆ عام نوعیت کا درد آرام کرنے سے یا جسم کو کسی خاص پوزیشن پر رکھنے سے کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی بھی پوزیشن نہ ملے تو یہ گردے یا مثانہ میں پتھری کے سبب ہو سکتا ہے۔

☆ رات کو آرام کرتے ہوئے کمزور درد کا شروع ہونا یا بڑھنا بی یا کینسر کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ درد کا کولہوں تک ہونا یا گھٹنوں یا گھٹنوں سے نیچے تک پھیلنا مہروں کے درمیان Disc کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ اگر کسی درد کو ۳ دن کے آرام اور عام دوائی سے

تھوڑا سا سہاگہ کرنا چاہیے۔ خاص حالات میں ایم آر آئی (MRI) سے درد کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اگر ان تمام باتوں کا جائزہ لے کر اس بات کا ذرا بھی شک ہو کہ یہ درد کسی بڑی بیماری کے باعث ہے تو فوراً کسی

طبيب سے رجوع کرنا چاہیے۔

لیکن اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ درد پٹھوں کی

تھوڑی اور کام کی زیادتی وغیرہ سے ہو رہا ہے اور اگر کوئی

ال کی تصدیق بھی کر دے تو بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

کمزور درد سے بچاؤ کی تدابیر
کمزور سیدھی رکھیں ☆ کمزور گرم رکھیں
کمزور درد سے بچاؤ کے سنہری اصول ہیں

کمزور سیدھی رکھیں

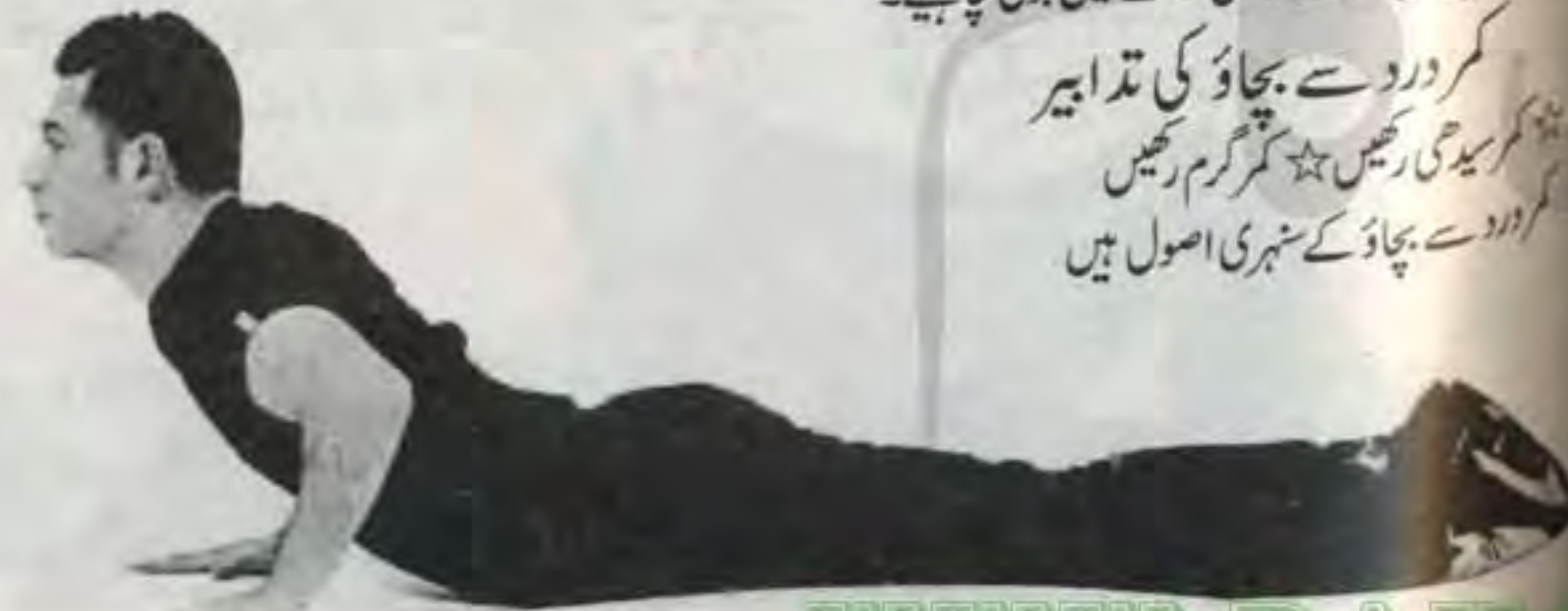
کمزور درد کے مریض کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنا سر اونچا، کندھے اوپر اور سیدھے اور سینہ ابھار کر رکھے۔ اس طرح اس کی پوری کمر سیدھی رہے گی اور درد میں کمی رہے گی۔ اگر اس کی کمر ڈھیلی اور الجھی ہو تو کمزور درد دوبارہ شروع ہو سکتا ہے اور بڑھ بھی سکتا ہے۔ اس لیے ہر حالت میں کوشش کریں کہ کمر سیدھی رہے۔

کمزور گرم رکھیں

ہمیشہ لمبی شرٹ ہی استعمال کریں۔ چھوٹی شرٹ اوپر اٹھ جاتی ہے، جس سے کمر کو ہوا لگ جاتی ہے اس سے درد دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ رات سوتے وقت بھی لمبی شرٹ استعمال کریں۔

کہاں لیٹنا چاہیے

کمزور درد کے مریض کو زمین پر نہیں لیٹنا چاہیے کیونکہ ایک تو زمین پر مناسب موٹائی کا بستر نہیں بچھایا جاتا اور دوسرے زمین پر لیٹتے اور اٹھتے وقت بھی دقت ہوتی ہے۔ آج کل جو میٹریس والے بیڈ ہیں ان پر لیٹنا چاہیے۔ بیڈ کا میٹریس اور تختہ ہموار اور ٹوٹا پھوٹا نہیں ہونا چاہیے، پرانے زمانے کی لکڑی کی چارپائی ہموار بھی نہیں ہوتی اور ڈھیلی بھی ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ہموار سخت اور موٹے بستر





رکھ کر آگے جھک کر بیٹھیں اور کسی سہارے کو پکڑ لیں۔

ہر انسان کو اپنی عمر کے مطابق ورزش ضرور کرنی چاہیے۔ دنیا میں اس وقت ورزش کے بہت سارے طریقے موجود ہیں۔ نماز کے بے شمار فوائد میں سے ایک فائدہ پورے جسم کی ایک ایسی ورزش ہے۔ جو ایک بچے سے لے کر انسان کی ہر عمر کے لیے ضروری ہے۔ بتائے گئے مناسب طریقے سے وضو، قیام، رکوع، سجود اور قعود اگر مکمل ذہنی یکسوئی کے ساتھ کیا جائے تو یہ یوگا اور ورزش کا بہترین امتزاج ہے۔ نماز کی ہر کیفیت میں اپنے جسم کو متوازن رکھنا اور سلام پھیرتے ہوئے کندھے، گردن اور کمر کو سیدھا رکھ کر ایسے سلام پھیرنا کہ نظر کندھے پر ہو۔ سارے جسم کی بہترین ورزش ہے لیکن شدید درد کی حالت میں اگر نماز پڑھتے ہوئے مریض کو تکلیف ہو تو اجازت ہے کہ وہ آفس چیئر پر بیٹھ کر اشاروں کے ساتھ نماز ادا کرے۔

کمر درد کے مریض کو اپنا وزن، عمر اور قد کے مطابق رکھنا بہت ضروری ہے۔ دیکھیے ۱۸ سال کی عمر میں انسان کا جو وزن ہوتا ہے، اُسے اٹھانے کے لیے اس وقت اس کی ہڈیاں بہت مضبوط ہوتی ہیں لیکن ۴۰ سال کی عمر میں انسان کی ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں اور انسان اس پر چربی اور ہاتھوں کا کتنا ہی وزن ڈال دیتا ہے۔ اس لیے زیادہ وزن والے مریضوں کی ہڈیاں زیادہ ہی احتجاج کرتی ہیں۔ اس لیے اپنے وزن کو کنٹرول کریں۔

پیٹ

پیٹ چھوٹا کریں۔ ایک عام کلیہ ہے کہ اگر کسی انسان



لیں۔ بیسن پر کھڑے ہو کر منہ ہاتھ دھوتے، برش کرتے وقت احتیاط کریں۔ بہتر ہے کہ ایک ہاتھ بیسن پر رکھیں اور گھٹنوں کو ذرا خم دے لیں، وضو کرنے کے لیے سٹول یا چوکی کا استعمال کریں۔

نیم گرم پانی سے نہائیں

اگر آپ موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہیں تو اپنے جسم کا وزن اپنے دونوں پاؤں اور ہاتھوں پر رکھیں۔ دونوں گھٹنوں کو پٹرول کی ٹینگی سے چپکا لیں موٹر سائیکل کی سیٹ پر بہت کم وزن ڈالیں اپنے سر کو آگے کی طرف جھکا لیں جیسے ریس کے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے اس کا جینک کرنا ہے۔ اس سے کمر پر دباؤ بھی نہیں پڑتا اور ہوا کی مزاحمت بھی کم ہوتی ہے۔ سپیڈ بریکر اور گڑھوں سے گزرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کمر درد کا مریض موٹر سائیکل کی پچھلی سواری ہے تو اس کو زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ موٹر گاڑی کی سیٹ ہموار اور آرام دہ ہونی چاہیے گاڑی ویگن یا رکشہ میں سفر کرتے ہوئے ہمیشہ کمر سیدھا

والی چارپائی استعمال کی جاسکتی ہے۔ یا ان پر لکڑی کا تختہ لگا کر میٹریس یا روٹی کا موٹا گدار رکھا جاسکتا ہے۔

بیڈ پر لیٹتے وقت کمر سیدھی رکھ کر گھٹنوں اور کولہوں کو جھکا کر بیڈ پر بیٹھنا چاہیے اور پھر کروٹ کے بل کہنی کی مدد سے لیٹنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے درد کی لہر نہیں اٹھتی اگر سیدھا لیٹ کر درد کا احساس ہو تو دونوں گھٹنوں کو اوپر اٹھا کر ان کے نیچے چھوٹا تکیہ رکھ لیں یا کوئی کرسی یا میز لے کر اس کے اوپر اپنے پاؤں رکھ لیں۔ یا کروٹ کے بل لیٹ کر دونوں گھٹنوں کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان چھوٹا تکیہ یا دونوں ہاتھ جوڑ کر رکھ سکتے ہیں اس سے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔ بستر پر لیٹتے ہوئے لمبا سویٹر وغیرہ تکیہ کے نیچے رکھ لیں اور صبح یا کسی بھی وقت اٹھتے ہوئے فوراً پہن لیں تاکہ کمر ایک دم ٹھنڈی نہ ہو۔ بستر سے اٹھ کر چند منٹ تک کمرے کے گرم ماحول میں چہل قدمی کریں۔ بستر سے اٹھنے کا طریقہ بھی بستر پر لیٹنے جیسا ہی ہونا چاہیے۔ بیٹھنے کے لیے آفس چیئر کا استعمال کریں اور پیچھے ہو کر بیٹھیں تاکہ کمر سیدھی رہے اور اس کو سہارا ملا رہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں کمر سیدھی رکھیں اور گھٹنوں اور کولہے کے جوڑ استعمال کریں۔ میز یا زمین سے کوئی چیز اٹھاتے ہوئے اپنا ایک پاؤں آگے کر لیں اور کمر سیدھی رکھ کر ویسے ہی گھٹنوں اور کولہوں کے بل ایک ہاتھ سے کسی میز وغیرہ کا سہارا لے کر جھکیں۔

ہاتھ روم میں اپنے آپ کو سردی سے بچائیں۔ ہاتھ روم جانے سے پہلے ہاتھ روم کے روشن دان بند کر لیں۔ اگر زیادہ ٹھنڈک ہے تو ہاتھ روم ہیٹر وغیرہ لگا کر گرم کر

کا پیٹ اس کے سینے سے ۴، انچ چوٹا ہے تو وہ صحت مند ہے۔ اگر کسی انسان کا پیٹ اس کے سینے سے بڑھا ہوا ہے۔ اتنا ہی اس کو شوگر، بلڈ پریشر اور کمر درد کی تکالیف کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔ بڑھا ہوا پیٹ جب اس کے جسم سے آگے کو نکلتا ہے تو اس کا سارا وزن ہر وقت اس کی کمر کی ہڈی پر پڑتا ہے۔ جس سے وہ کمر درد کا شکار بھی ہو جاتا ہے تو آرام بھی مشکل سے آتا ہے۔ اس لیے کمر کا سینے سے چھوٹا رہنا بہت ضروری ہے۔

کمر درد کا علاج

کمر درد شروع ہوتے ہی اگر مریض کوئی درد کش گولی کھا لے، زمین پر فوم بچھا کر یا بیڈ پر الٹا لیٹ جائے اور کسی مددگار سے (جو اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرنے کے بعد) زیتوں کے تیل کی مالش کرے یا کوئی درد کش مرہم لگوائے یا مناسب گرمائش والی ربڑ کی پانی کی



۱۴۰۰ کتابیں
ہر ایڈیشن ۳ ہزار کا
۳۰ ملکوں میں برائیں

دنیا کے بہترین کاغذ پر نوبل قرآن کی
۳۰ لاکھ کاپیاں چھاپنے کا اعزاز ملا ہے



آپ بیتی عبدالملک مجاہد

میں حرم میں جا کر دیانت دار اور باصلاحیت
افسرانہ کار ملنے کی دعا کرتا ہوں

ہمیشہ یہ چاہا کہ آنحضرت کی سیرت کو موتوں کی طرح پیش کروں
صحاح ستہ ایک ہی جلد میں ۷۷۲ صفحات پر چھپی تو کسی کو یقین نہیں آیا

قرآن پاک کی کتابت سے فیض پانے والے
ایک کیلی گرافر کی حیرت افزا داستان
جس کی ہمت، ذہانت، واضح مقصد، مسلسل محنت اور اللہ سے
گہرے تعلق نے اسے ۳۰ ملکوں میں قائم عالم اسلام کے
سب سے بڑے پبلشنگ ہاؤس کا خالق اور سربراہ بنا ڈالا



تحریر و تہذیب
اختر عباس

ہتھیلیاں زمین پر رکھ دیں۔ اب دونوں گھٹنوں کو ملا کر بغیر
پاؤں اٹھائے پنڈولم کی طرح ۱۵، ۱۰ بار دائیں بائیں
حرکت دیں۔

ورزش نمبر ۳: اٹنے لیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں
گردن کے برابر زمین پر رکھ لیں اور اس کے بعد اپنے چہرے
اور سینے کو اوپر اٹھاتے جائیں جہاں تک ممکن ہو سکے۔ جیسے
آپ اپنی سامنے کی دیوار کو دیکھ رہے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد
پہلی حالت میں آجائیں یہ ورزش ۱۰، ۵ بار کریں۔

یہ ورزشیں دن میں ۳، ۳ بار دہرائی جاسکتی ہیں۔
جب کمر درد کا مریض ٹھیک ہو جائے تو بعد میں بھی ان
ورزشوں کو جاری رکھنا چاہیے اور کمر درد سے بچاؤ کی تدابیر
پر بھی عمل کرنا چاہیے۔ بکرے کی پشت (پٹھ) کا گوشت
کھانا کمر درد کے لیے مفید ہے۔ ملٹی وٹامن کی گولیاں بھی
استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ چند ایک مشورے ہیں جو میں اپنے مریضوں کو
اپنے چھوٹے سے کلینک میں دیتا ہوں۔ اکثریت اس سے
فائدہ اٹھاتی ہے۔ بہتری کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ مجھے
آپ کی رہنمائی اور مشوروں کا انتظار ہے۔

گرم بوتل کپڑے میں لپیٹ کر کمر کو گرمائش دے تو اکثر
اوقات ان تدابیر سے ہی درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کو
اس کے بعد بھی ساری احتیاطی تدابیر اور کمر کی بتائی گئی
ساری یا چند ایک ورزشیں کرنی چاہئیں ہم کمر درد کی صرف
وہی ورزش بتا رہے ہیں جو آسانی سے ہو جاتی ہے اور اکثر
اتنی ورزش ہی کافی ہو سکتی ہے۔

کمر درد کی ورزش

کمر درد کی ورزشیں زمین پر روئی کا گدایا پتلا ہموار
فوم بچھا کر کرنی چاہیے۔ ورزش سے پہلے کمر کی ہلکی مالش
کر کے اس کو گرم کر لیں زیتون کا تیل استعمال کر سکتے ہیں۔
ورزش نمبر ۱: زمین پر روئی کا گدایا فوم بچھا لیں دونوں
گھٹنوں کو اکٹھا کر کے پاؤں اپنے جسم کے نزدیک رکھ لیں
دونوں ہاتھوں سے ایک گھٹنے کو پکڑ کر اپنے پیٹ کی طرف
زور سے کھینچیں۔ چند سیکنڈ کے بعد اس گھٹنے کو واپس کر کے
دوسرے گھٹنے کو بھی ایسے ہی اپنے پیٹ کی طرف کھینچیں۔
کسی مددگار کی مدد سے بھی جو گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پیٹ کی
طرف دبائے، فائدہ ہوتا ہے۔ ۱۰، ۵ بار کریں۔ اس
طرح پٹھے نرم اور درد میں افاقہ ہوتا ہے۔

ورزش نمبر ۲: پہلی ورزش کی طرح گھٹنوں کو اکٹھا کر
کے پاؤں جسم کی طرف لائیں اور پھر دونوں ہاتھوں کی مدد سے
کمر کو اس طرح زمین سے اٹھائیں کہ دونوں پاؤں، کہنیاں،
سینہ کا اوپری حصہ گردن اور سر زمین پر رہیں چند سیکنڈ بعد کمر کو
واپس زمین پر رکھ لیں۔ یہ ورزش ۱۰، ۵ بار کریں۔

ورزش نمبر ۳: زمین پر سیدھے لیٹ کر پہلی ورزشوں
کی طرح دونوں گھٹنوں کو آپس میں ملا کر پاؤں اپنے جسم
کی طرف لے آئیں دونوں بازو جسم کے ساتھ ملا کر



بنیادی طور پر کیلی گرافر ہوں جسے اردو میں خطاط کہا جاتا ہے۔ کیلی گرافر کی خوش بختی یہ ہوتی ہے کہ اس کا قلم جب بھی لفظ لکھتا اور اٹھاتا ہے تو قرآن میں کا ہوتا ہے۔ میری زندگی کی ساری خوشیاں اور کامیابیاں اسی عظیم کتاب سے جڑی ہوئی ہیں۔ بطور کاتب جو پہلا سبق میں نے سیکھا وہ تھا ”گر تو می خواہی کہ باشی خوش نویس می نویس و می نویس و می نویس (اگر تو چاہتا ہے تو خوش خط ہو جائے) (پھر لکھتے رہو، لکھتے رہو) جب سے دارالسلام میری زندگی کی پہلی ترجیح بنا تو یہ سبق یوں بدل گیا کہ اگر تو کامیابی چاہتا ہے تو خلوص نیت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کرتے رہو۔ کرتے رہو۔

میں نے ۳۲ سال پہلے پاکستان سے سعودی عرب جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں کئی سال وزارت دفاع میں ملازم رہا۔ کام اور تعلقات دونوں کو سنبھالنے میں، میں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ جب نوکری چھوڑ کر میں نے طباعت، نشر و اشاعت میں آنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے افسر اعلیٰ نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے تب تک انتظار کرنا پڑا جب تک ان کی ٹرانسفر نہیں ہوگئی۔ نئے افسر سے گزارش کی تب جا کر مجھے اجازت ملی۔

”دارالسلام“ میرا خواب تھا۔ ریاض میں اس کی تعبیر سامنے آئی۔ کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت کے لیے دنیا کی سب سے بہترین طباعت و اشاعت کا ادارہ، اللہ رب العزت نے اسباب ہی فراہم نہیں کیے عمدہ اور اعلیٰ درجے کی ٹیم بھی فراہم کر دی۔ آج دارالسلام عالم اسلام کا سب سے نمایاں ادارہ قرار دیا جا رہا ہے، ہم ۱۳۰۰ سے زائد ٹائٹل چھاپ چکے ہیں۔ ۱۵۵۰ انگلش میں اور ۳۳۰ اردو میں۔ بانی عربی میں۔ ۳۰ ممالک میں ہماری فرنیچر کمز کام کر رہی ہیں۔ ۱۰۰ نئی کتابیں آنے والی ہیں۔ ہماری ہر کتاب کا ایڈیشن ۳ ہزار کا ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک نئی روایت ہے کہ ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔

لوگ پوچھتے ہیں آپ کی کامیابی کی وجہ کیا ہے؟ اللہ کی رحمت اور کرم کے بعد میری والدہ، ان کی دعائیں، صدقہ خیرات بھی بہت کرتی تھیں۔ میری اہلیہ میرے کئی کاموں میں مشاورت میں شامل ہوتی ہیں۔ میرے بچے جو ہر حال میں میرے قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میرا شاف، آپ کو حیرت ہوگی ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو سفر کے آغاز سے میرے ساتھ ہیں۔ میں نے ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کی عزت، مرتبہ، سہولت اور تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کے علم میں اضافے کی پوری طرح سعی کرتا ہوں۔ اپنے شاف کو تنخواہ ہم ڈالر میں

اب تک ۲۵ زبانوں میں قرآن پاک چھاپ چکے ہیں

دیتے ہیں تاکہ مہنگائی کا بہت زیادہ اثر ان پر نہ ہو۔ اچھے لوگوں اور اچھی ٹیم پر میرا یقین اور جستجو میرا ہمیشہ فوکس رہا ہے۔ آج پرائیویٹ سطح پر آپ کو اتنے عالم کسی ایک ادارے میں اکٹھے کام کرتے کم ہی نظر آئیں گے۔ جو ایک بار دارالسلام آجاتا ہے واپس نہیں جاتا۔ مشن سمجھ کر وابستہ ہو یا نوکری جان کر آئے۔ اسے جلدی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ”دین بھی ہے اور دنیا بھی“۔ پھر جہاں عزت نفس کے ساتھ کام کی آزادی ہو وہاں کوئی کیوں نہیں کام کرنا چاہے گا؟

سچ تو یہ ہے کہ یہ اب ایک افراد ساز ادارے کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ عالم یہاں آکر ریسرچ کاربن رہے ہیں۔ تحقیق و جستجو کے جدید اور قدیم اصولوں کو سمجھتے ہیں اور پھر ہر کتاب کو تحریر کو ان اصولوں کی بنیاد پر لکھتے

ہیں، جانچتے ہیں۔ عالم کی خوبی صرف اس کی ذات تک ہوتی ہے۔ ہم نے علماء کو سکالربننے اور اپنانے کا پلیٹ فارم بنا دیا ہے۔ کتاب کے مواد کی پیش کش تو خوبصورت اور پرکشش ہونا ہی چاہیے ہم نے مواد کو مستند ترین حوالوں سے پرکھنے کی طرح ڈالی ہے۔ علماء کو اردو ادب پڑھنے کی تربیت دی ہے زبان و بیان کے رموز سکھائے ہیں۔ اس وقت ۱۵۰ ہمدنی علماء ہمارے ساتھ لاہور آفس میں وابستہ ہیں۔ ان میں ۹۰ فیصد وہ ہیں جو پہلے دن سے ہماری ٹیم کا حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں وزٹ کے لیے آنے والے حیران ہوتے ہیں کہ ایک ہی چھت تلے اتنے علماء جمع ہیں اور اس قدر عمدگی سے کام کرتے ہیں۔

دارالسلام کے آغاز کی ایک وجہ بے شک تجارت بھی ہے مگر ہم سارے ہی اسے عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہمارے ریاض آفس میں مختلف زبانوں کا علم رکھنے والے، مترجم اور ایڈیٹر ہیں۔ ان کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے۔ سعودی عرب میں ہماری ۱۰ برانچیں ہیں، نیویارک، یوسٹن، لندن، شارجہ، آسٹریلیا، ملائیشیا سمیت ۳۰ ممالک میں شاخیں ہیں۔ ساتھ میں اسلامک سپر مارکیٹ کا تصور سے رہے ہیں۔

مولانا صفی الرحمن مبارک پوری کے ساتھ کام عالم اسلام کی مقبول کتاب الرقیق المنحوم جسے رابطہ عالم اسلامی نے شاہ فیصل ایواڈ سے نوازا تھا کے نامور مصنف اپنی آخری عمر میں دارالسلام میں قائم ریسرچ سنٹر کے سربراہ رہے۔ ان کی وجہ سے ہمیں بہت تقویت ملی۔ وہ مدینہ یونیورسٹی میں سیرت چیئر کے سربراہ تھے۔ جب میں نے ان سے اپنے ہاں آنے کی گزارش کی تو لوگ حیرت سے پوچھتے تھے۔ مولانا صفی الرحمن مبارک پوری آپ کے ہاں کام کرتے ہیں تو میں پورے یقین سے کہتا تھا نہیں عبدالمالک ان کے پاس کام کرتا ہے۔

نوبل قرآن۔ ۳۰ ملین کا پیاں

ہماری سب سے بڑی سعادت نوبل قرآن کی تیاری اور اشاعت ثابت ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ کرنے والی شخصیت ڈاکٹر محمد محسن خان صاحب پنجاب کے شہر قصور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایم بی بی ایس کر کے دل کے امراض کے ماہر بنے۔ پھر برطانیہ چلے گئے اور وہاں سے سعودی عرب، کنگ عبدالعزیز السعود کی بادشاہت میں وزارت صحت سے وابستہ ہوئے۔ ۱۵ سال اسی وزارت میں



وزیر اسلامی امور شیخ صالح بن عبدالعزیز دارالسلام (ریاض) آمد کے موقع پر

رہے، زیادہ وقت طائف میں گزارا۔ شاہ خالد کے عہد میں ان کو سعودی عرب کے پہلے چیف ہسپتال کا ایم ایس بنایا گیا۔ ان کو خواب میں آنحضور ﷺ کی زیارت ہوئی، خواب میں ہی استعفا دیا اور پھر حضور ﷺ کے کہے لفظوں کی حفاظت اور خدمت پر لگ گئے۔ انتہائی وجہہ، سرخ و سفید رنگت اور پُرکشش شخصیت کے حامل۔ انھوں نے قرآن پاک کا انگریزی میں بہت عمدہ اور معیاری ترجمہ کیا۔ میں ان سے اجازت لینے گیا۔ ان کی سیرت اور صورت دونوں نے موہ لیا۔ میں نے ترجمے کی رائٹنگ کا پوچھا۔ بولے رائٹنگ لے لی تو قیامت کے روز آنحضور ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ نوبل قرآن کے ترجمہ والا یہ منصوبہ بہت بڑا تھا۔ راہواری شوگر ملز کے

یوسف سیٹھی صاحب کو اللہ نے جن لیا۔ انھوں نے بہت کھلے دل کے ساتھ اس پر رقم خرچ کی۔ ہدف یہ تھا کہ نسخہ صحت کے اعتبار سے بہترین ہو۔ ۱۹۹۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن چھپا۔ الحمد للہ اب تک ۳ ملین (۳۰ لاکھ) کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

نوبل قرآن آج دنیا کا سب سے معروف اور مقبول انگریزی ترجمہ مانا جاتا ہے۔ احادیث کی روشنی میں اس میں مختصر حواشی بھی ہیں۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مدینہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بھی اس پر بہت کام کیا۔ سعودی گورنمنٹ اور علماء کے بورڈ نے منظور کیا تب یہ طبع ہوا۔ میرا خواب یہ تھا کہ دنیا میں بائبل سب سے عمدہ ۵۶ گرام کاغذ پر اور پاکٹ سائز میں چھپتی ہے۔ نوبل قرآن کو ویسی ہی کوالٹی سے چھاپا جائے۔ اٹلی میں پریس تھا۔ میں وہاں پہنچا ان کے پاس کئی سال کی بکنگ تھی۔ میں نے ان سے بکنگ کی تاریخ لی۔ کاغذ وہ صرف خاص کارخانے سے لیتے ہیں جو صرف بائبل کے لیے ہی بنایا

جب صحاح ستہ ایک جلد میں چھپ کر میرے ہاتھوں میں آئی تو وہ زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا اور میرے ہاتھوں ہوا تھا

جاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے عمدہ، باریک اور دیر پا کاغذ ہے۔ میں وہاں پہنچا، ان سے کاغذ کی بات کی۔ اس پریس سے جہاں ہمیشہ بائبل چھپی، پہلی بار قرآن پاک شائع ہوا۔ ۱۰ ہزار کا پہلا ایڈیشن چند دنوں میں امریکا میں فروخت ہو گیا۔ ہم وہاں سے ۲ ایڈیشن اور طبع کرائے۔ ابھی بہت آرڈرز تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا کہ ہمارے پالیسی سازوں نے منع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں صرف بائبل چھاپیں گے۔ میں اس فیکٹری میں پہنچا

مدارس کا نصاب بدلنے میں ۱۵ سال

ہمارے ہاں جو کمیٹی مدارس کے لیے جدید نصاب ترتیب دے رہی ہے۔ وہ وفاق المدارس کے خطوط پر پرکام کر رہی ہے۔ پروفیسر محمد یحییٰ صاحب اس کے چیئرمین ہیں۔ ۶ کتابیں آچکی ہیں۔ ۱۵ سال لگیں گے سارا سکیس بدلنے اور مدارس کے نظام میں جو ہری تبدیلیاں لانے میں۔ تب پورا سٹرکچر بدل جائے گا۔ عصری تعلیم کی طرف رجحان کافی ہو چکا ہے۔ امید ہے اس سے مدارس کا کام اور موثر اور بہتر ہو جائے گا۔

اور پوچھا کہ آپ کا غذا اور کون کون چھاپتا ہے پھر ہمیں دوسرے اچھے پریسوں کا بھی پتا چل گیا جہاں اسی کاغذ پر طباعت ہوتی تھی۔ یوں عمدہ ترین کاغذ پر نوبل قرآن کی ایک نہ ختم ہونے والی طباعت کا سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد ہم نے مختلف زبانوں میں قرآن پاک چھاپنے کا آغاز کیا۔ اب تک ۲۵ زبانوں میں قرآن چھاپ چکے ہیں۔

صحاح ستہ کا ۱۰۰ سال بعد ترجمہ

ہدف یہ تھا کہ صحت اور اسناد کے اعتبار سے احادیث اور سیرت پر بہترین کام ہو۔ ہندوستان کے مولانا صفی الدین مبارک پوری علمی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ وہ احادیث کے خداداد کمپیوٹر تھے۔

صحاح ستہ کا انگریزی ترجمہ ۳۸ جلدوں میں چھپا ہے۔ اللوٹو والمرجان (یعنی بخاری اور مسلم کی مطلق ملے احادیث کا مجموعہ) کا بھی ترجمہ کرا لیا ہے۔ صحاح ستہ کا ترجمہ کوئی ۱۰۰ سال پہلے ہوا تھا۔ مشکل الفاظ پر پانی زبان، تشریح کی بھی ضرورت تھی۔ علماء اور شیوخ الاحادیث جمع کیا اور اس بڑے منصوبے پر کام کا آغاز کیا۔

سنن ابو داؤد (۴ جلدوں میں) سنن نسائی (۵ جلدوں) سنن ابن ماجہ (۵ جلدوں) شائع ہو چکی ہیں۔ یہ مختلف سائز میں ۱۳۴۰ صفحات سے ۱۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر محسن صاحب نے صحیح بخاری کا پہلا بار

ترجمہ کیا اور یہ ۹ جلدوں میں طبع ہوا۔

صحاح ستہ ایک جلد میں بھی اٹلی سے چھپوائی گئی۔ ۲۷۷۲ صفحات A/4 سائز اور ۴۰ گرام پیپر پر۔ تین ہزار کاپیاں چھپوائی گئیں۔ میں ۱۰ اردن وہیں اٹلی کے پریس میں بیٹھا رہا۔ یہ میرا دیرینہ خواب تھا۔ اس کی تکمیل کا لمحہ لمحہ اپنے سامنے تکمیل پاتا دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ پروف ریڈنگ کرتا رہا۔ جب صحاح ستہ ایک جلد میں چھپ کر میرے ہاتھوں میں آئی تو وہ زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا اور میرے ہاتھوں ہوا تھا۔ مجھے سارے لمحے یاد تھے۔ ساری ٹیم دن رات کام کر رہی ہوتی۔ صبح و شام کھانا پینا تک دارالسلام کی طرف سے تھا کہ کسی سکارلر، عالم کو کہیں ذرا سی دیر کے لیے بھی جانا نہ پڑے۔ مدد و رہنمائی کے لیے ہندوستان سے

دارالسلام کی ترقی کا راز

میری اور دارالسلام کی دنیاوی ترقی میں اگر کوئی ایک راز پنہاں ہے تو وہ یہ ہے کہ جو ارادہ ایک بار کر لیا، اسے بدلنا نہیں۔ اس کو بغیر انجام تک پہنچانے کے لیے سوچنے، وسائل بہم پہنچانے سے لے کر بہترین کام کے بندے ڈھونڈنے اور کام پر لگا دینے تک چھوٹی بڑی ہر چیز کا دھیان رکھنا ہوں۔ آپ کو تعجب ہو گا مگر یہ سچ ہے کہ میں روزانہ اپنے ادارے کے لیے نیک صالح، دیانت دار اور باصلاحیت افراد کار کے ملنے کی دعا کرتا ہوں۔ جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں ان کی دل سے خیر خواہی چاہتا ہوں۔ کئی بار تو حرم میں جا کر بھی اللہ سے التجا کرتا ہوں تب کام کے آدمی ضرور ملتے ہیں۔

میں نے زندگی سے یہ سیکھا کہ بہترین ایمان کا تقاضا یہ ہے انسان صلہ رحمی میں کوتاہی نہ کرے۔ مجھے ہمیشہ اپنے خاندان اور اہل خاندان کا خیال اور دھیان رکھنا، درگزر سے کام لینا عزت نفس کا خیال رکھنا، حفظ مراتب کا خیال رکھنا عزیز رہا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کے ”فتح الباری“ (بخاری کی شرح) مخطوطات منگوائے گئے۔ میں طبع شدہ صحاح ستہ کی کاپیاں لے کر ریاض پہنچا۔ تب وہاں ایک بہت بڑی نمائش چل رہی تھی۔ صحاح ستہ وہاں مرکز نگاہ بنی رہی۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی کتاب ایک ہی جلد میں کیسے آسکتی ہے۔

شروع دن سے طے کیا کہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کبھی معیار پر کمپروماز نہیں کریں گے

۴ مئی ۱۹۹۳ء دارالسلام لاہور کا قیام

اُردو بازار غزنی سٹریٹ لاہور میں میری ایک دکان موجود تھی۔ میں نے اپنے بھائی عبدالعظیم اسد (جو میرے دوست، مخلص نائب اور میرے بچوں کے ماموں بھی ہیں) سے جو علوم دین کی تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے تھے اور سعودی عرب آنے کے خواہش مند تھے۔ ان سے کہا کہ آپ یہاں دارالسلام کا کام شروع کرو۔ کتابیں میں سعودی عرب سے بھجواتا ہوں۔ یوں ۱۹۹۳ء میں پہلا کنٹینر لاہور آیا۔ جسے خود انھوں نے کریم بلاک میں اپنے ہاتھوں سے اتروایا۔ یہ قرآن و حدیث کے حوالے سے مختلف معروف اور مستند عربی کتابیں تھیں۔ اللہ نے اس قدر برکت دی کہ وہاں سے ہم لوئر مال پہ جہاں قومی پریس تھا منتقل ہوئے۔ وہاں پورا فلور لے لیا۔ ۷ سال وہاں رہے پھر سیکرٹریٹ شاپ کے ساتھ اپنا پریس لگایا اور دارالسلام سپر مارکیٹ بنائی۔ یہ ۳ منزلہ بلڈنگ ہے۔ یہاں ریسرچ سنٹر کا آغاز فروری ۱۹۹۵ء میں ہوا۔ کتاب و سنت کی اشاعت آسان نہیں ہے۔ صحت کا خیال رکھنا، اصل مراجع اور مصادر سے لے کر ہر تحریر کو غلطیوں اور شبہات سے پاک رکھنا۔ اس کام کے لیے بہترین دماغ درکار تھے۔

آغاز حافظ صلاح الدین یوسف سے کیا گیا۔ شریعت کورٹ کے ایڈوائزر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ٹیم بنتی گئی۔ یہیں ہم نے پروف پڑھنے کا ایک باقاعدہ شعبہ بنایا۔ ایک بہترین شعبہ ڈیزائن قائم کیا۔ ہم نے شروع دن سے طے کیا کہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کبھی معیار پر کمپروماز نہیں کریں گے۔ کوالٹی نہ صرف ریسرچ کی بلکہ طباعت و اشاعت کی ہر دو صورتوں میں ترجیح اول رہے گی۔ بہت لوگوں نے کہا کتابیں بہت اچھی ہیں۔ سستا ایڈیشن بھی چھاپیں۔ ہم نے بات نہیں مانی۔ ہماری ۳۰ فیصد کتابیں ۴ کلو ہر ہو چکی ہیں۔ بہترین اور عمدہ کاغذ پر ان کی طباعت ہوئی ہے۔ آنے والا دور ۴ کلو کتابوں کا ہے۔ ہم نے ابھی سے اپنی ہر کتاب کو ۴ کلو کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔

ہمارا سالانہ ٹرن اوور ۴۳ ملین ریال ہے۔ ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا ٹکٹ یعنی ۳۳ فیصد حصہ فی سبیل اللہ خرچ کریں گے۔ اس پر عمل پیرا ہیں۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز کے میں تو انھیں اس دور کا حاتم طائی کہتا ہوں۔ ان کے ہاں دو وقت امیر و غریب کے لیے دسترخوان سجا رہتا ہے۔ کیا آدمی تھے۔ ان کو ویسا ہی ہونا چاہیے کھلے ہاتھ والا۔ انہیں مل کر ویسا بننے کی آرزو ہو جاتی تھی۔

اصل اسلامی سپرٹ تو یہی ہے

یہی سوچ کر ہم نے پاکستان میں باقاعدہ ٹرسٹ بھی بنا دیا ہے۔ دینی اور تعلیمی ادارے بنانے کے ساتھ ساتھ، مساجد بنا رہے ہیں۔ ڈسپنسریاں قائم کر رہے ہیں۔ خوشی کے ایام میں تحائف تقسیم کرتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں عبدالعظیم اسد سارا نظام بحسن و خوبی دیکھ رہے ہیں۔ دو زون بنا رکھے ہیں۔ زون ۱۔ حافظ آباد میں، اسے محمد طارق شاہد دیکھتے ہیں زون ۲۔ واربرٹن شیخوپورہ، پروفیسر امان اللہ بھٹی دیکھتے ہیں۔ ننگانہ سٹی عمران ناصر صاحب اور شرپور سٹی محمود الحسن بزمی صاحب، خیر کے ان کاموں میں

کیلانی سپر اور کیلیا نوالہ گاؤں

ضلع گوجرانوالہ میں قادر آباد ہیڈ بیراج پر جانے والی سڑک پر کیلیا نوالہ گاؤں واقع ہے اور اس میں رہنے والا ہمارا خاندان کیلانی سپر اکھلایا۔ بارہویں پشت میں جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں حکیم حاجی محمد عارف یہاں آئے۔ چھٹی پشت کے بزرگ فیض اللہ نے اپنے بیٹے ہدایت اللہ کے لیے دو قلمی نسخے چھوڑے، کیلانی اور منیتہ المصلیٰ۔ ماضی میں علمی خاندانوں میں ہمیشہ روایت رہی ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کے لیے کتابیں لکھتے ان کی علمی، عملی اخلاقی معاشی تربیت بھی ہوتی۔ فیض اللہ جہانگیر کے عہد میں جامع مسجد دہلی کی امامت و خطابت پر فائز رہے۔ کتابت کے رموز خاندان کے ہر فرد نے سیکھے کتابت بطور پیشہ بہت زیادہ معروف تب ہوئی جب مشین طباعت کا آغاز ہوا اور کتابیں پریس میں چھپنے لگیں۔ یہ زمانہ چھٹی پشت میں محمد دین، امام دین اور سلطان احمد محمد دین کے بڑے بیٹے محمد مصطفیٰ میرے دادا تھے۔ ان کے والد محمد بخش ۱۸۱۴ء میں کیلیا نوالہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے کتابت کے رموز سیکھ کر فن کمال کو پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ تیر اندازی کی مشق کے دوران انھوں نے دور سے تیروں کی مدد سے دیوار پر چسپاں ایک کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی۔ انھیں کسی نے ۱۸۶۱ء میں نہر دے کر راہی ملک عدم کر دیا۔ ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ میرے دادا محمد مصطفیٰ انہی کے بیٹے تھے۔ میرے والد محمد یونس کے تین بیٹے تھے محمد ایوب، محمد طارق اور عبدالملک مجاہد۔ میرے والد کو کتابت میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ اچھے خطاط اور باعمل انسان تھے۔ ۵۵ سال کی عمر میں حافظ آباد میں فوت ہوئے۔

ہمارے دست و بازو ہیں۔

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم، واربرٹن میں

پرائمری پاس بچوں کو انٹری ٹیسٹ کے بعد داخلہ دیا جاتا ہے اور تین سال میں حفظ کے ساتھ ساتھ مڈل کی ریگولر تعلیم دی جاتی ہے۔ مڈل کا مکمل نصاب پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کا پڑھایا جاتا ہے۔ مڈل کی تعلیم کا طریقہ کار اس طرح ہے کہ چھٹی اور ساتویں کلاس میں تین مضمون (انگلش، ریاضی، اردو) ریگولر پڑھائے جاتے ہیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اردو اور انگلش خوشخطی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے ہر روز ۲ گھنٹے سکول کی کلاس ہوتی اور ایک گھنٹہ ہوم ورک کے لیے۔ یہ ایک بورڈنگ سکول ہے جس میں حفظ القرآن اور دینی تربیت کے ساتھ فل ٹائم سکولنگ کرائی جاتی ہے۔

دارالسلام ٹرسٹ کے زیر انتظام عرصہ ۵ سال سے واربرٹن سٹی میں اس سسٹم کے تحت تین مساجد (جامع مسجد ریاض الاسلام، مسجد فاران اور مسجد ریاض الجنت) میں کام ہو رہا ہے۔ ان مساجد میں چھ کلاسیں اور ۱۲۰ طلباء حفظ و مڈل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اب تک ۵۷ طلباء حفظ و مڈل کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم کے تحت شیخوپورہ سٹی، ننگانہ سٹی اور شرپور سٹی میں ابتدائی طور پر اسکول شروع کیا گیا ہے۔ یہ منصوبہ بڑا منفرد اور تربیتی اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

الرحمہ انسٹیٹیوٹ

داربرٹن سابقہ ضلع شیخوپورہ اور موجودہ ضلع ننگانہ کا

جدید ترین پریس لگانے کا خواب

میں نے ۱۹۹۴ء میں ایک ایسا جدید پریس لگانے کا خواب دیکھا تھا جو صرف قرآن و سنت کی ترویج و اشاعت کا کام کرے۔ اللہ نے اس کا بھی اہتمام کر دیا ہے۔ لاہور میں شیخوپورہ روڈ موٹروے پر کوٹ عبدالملک انٹر چینج کے بالکل ساتھ ۵ ایکڑ میں دارالسلام پرنٹنگ کمپلیکس تیار کیا جا رہا ہے۔

اس کا فرسٹ ۵۰۰ فٹ ہے۔ یہ اسلامی دنیا میں بہترین قرآن پاک کی طباعت اور دینی کتب کی اشاعت کا مرکز ہوگا ان شاء اللہ۔ جرمنی سے جدید ترین مشینری آ رہی ہے جو "آٹو باسنڈری" ہوگی۔ یہاں ۵۰ سے زائد زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کے لیے ریسرچ سنٹر قائم کر رہے ہیں۔ یہ لوئر مال سے صرف ۱۴ کلو میٹر پر ہے۔ انجینئر کا شرف شہزاد باجوہ نے ہمارے ساتھ ہی ۵ ایکڑ کا پلاٹ لیا ہے۔ وہ سائنسی ایجادات کو قرآن کی رہنمائی میں بطور پراڈکٹ بنانے اور مارکیٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک تاریخی قصبہ ہے جو ہر مذہب و مسلک سے وابستہ لوگوں کا مسکن ہے۔ تمام مذاہب و مسالک کے لوگ اپنے اپنے اسلوب کے مطابق دینی و تبلیغی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس قصبے میں خالص کتاب و سنت کے حاملین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو شروع ہی سے انفرادی



ڈاکٹر ذاکر نایک
دارالسلام ریاض آفس میں

طور پر تعلیم و تعلم اور دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ اسی دعوت و تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے دسمبر ۲۰۰۲ء میں واربرٹن کے چند مخلص احباب نے پروگرام بنایا کہ ۲۰۰۹ء میں طلبہ کے لیے بھی ریلوے اسٹیشن واربرٹن کے عقب میں چھوٹی سی مسجد ریاض الجنہ کے اندر ”الرحمہ ٹرسٹ“ کے زیر انتظام ”الرحمہ انسٹیٹیوٹ“ کے نام سے شعبہ علوم اسلامیہ کا آغاز کر دیا جائے۔ چنانچہ اب الحمد للہ ”روشنی جنرل ہسپتال“ واربرٹن کے عقب میں ایک شاندار عمارت میں اسے منتقل کر دیا گیا ہے۔ ”الرحمہ انسٹیٹیوٹ“ کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے بڑی اچھی شہرت سے نوازا ہے۔ اس وقت انسٹیٹیوٹ سے صوبہ پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخوا کے دور دراز علاقوں کے طلبہ بھی فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ان تمام تعلیمی اداروں میں ۳۰۰ بیرونی طلبہ و طالبات رہائش پذیر ہیں جن کے قیام و طعام اور علاج معالجہ کا انتظام نہایت احسن انداز میں کیا جا رہا ہے۔ یہاں میٹرک سے ایم۔ اے تک تعلیم کا بندوبست ہے۔

دارالسلام۔ امت کا اثاثہ

آج میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ دارالسلام جو ایک کیلی گرافر کا خواب تھا۔ اب امت کا اثاثہ بن گیا ہے اور اس اثاثے کا اصلی سرمایہ ہمارے سکالرز اور علماء ہیں۔ پروفیسر یحییٰ صاحب ۷۵ سال کی عمر میں جب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آ کر تھکاوٹ نہیں ہوتی روزانہ بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ان جیسے اہل علم کا اکرام اور احترام مجھ پر اور میری پوری ٹیم پر واجب ہے۔ سارے کام کرنے والوں کی پذیرائی اور عزت افزائی ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں دارالسلام کی کامیابی میں اس رویے کا بھی ضرور دخل رہا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ”مسلمان نرم طبیعت اور نرم خو ہوتا ہے۔“ ہمارے ہاں کسی ایک مکتبہ فکر کے عالم نہیں ہیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب کے شاگرد مفتی عبدالسمیع بھی ہیں جنہوں نے ان سے تخصص کیا۔ میں نے اپنے لیے فیجر کے بجائے رہنما کا رول پسند کیا ہے۔ اس

چینی منیجر کا قبول اسلام

مسلمانوں میں تعلیم برائے تربیت کی سوچ کہیں بہت پیچھے چلی گئی ہے۔ ساری تعلیم برائے معیشت، نوکری اور پیسے کے لیے ہو رہی ہے۔ اسی لیے وہ خوشی اور برکت سے خالی ہے اور تاثیر کہیں اڑ گئی ہے۔ میں جب پہلی بار چین گیا۔ مختلف لوگوں سے ملا۔ اداروں کے وزٹ کیے پھر اپنا آفس وہاں کھولا۔ اب ہماری کتابیں جہاں اٹلی، بیروت سے باقاعدگی سے پہنچتی ہیں وہاں چین سے بھی بڑی تعداد سے چھپ کر آتی ہیں۔ وہاں کے ہمارے چینی منیجر کو ہمارا کام اور کام دونوں اچھے لگے اور الحمد للہ مسلمان ہو گئے۔ ان کا نام یونس پول ہے۔ بہت محنتی ہیں۔ انھیں بھی اسلام کا یہ پہلو بہت اچھا لگتا ہے کہ تعلیم برائے تربیت ہو۔ ہم نے دارالسلام کے تعلیمی اداروں میں اس کا بطور خاص اہتمام کیا ہے۔

آنے والے دنوں میں ہماری ہر کتاب کی سوفٹ کاپی نیٹ پر دستیاب ہوگی۔ Embided پر ۲۰ کتابیں آچکی ہیں۔

بلیک بیری اور نوکیا کی Application پر کافی کام ہو چکا ہے۔

ایسے ہر کام میں تعلیم کے ساتھ تربیت ہمارا منظم نظر ہے۔

لیے سفر و حضر میں سوچنے، نئی نئی راہیں تلاش کرنے اور بہترین وسائل مہیا کرنے کی فکر رہتی ہے۔

میرے اہل خانہ

اللہ نے مجھے ۶ بیٹے اور دو بیٹیاں دی ہیں میرا بڑا بیٹا عکاشہ مجاہد اب انٹرنیشنل مارکیٹنگ دیکھ رہا ہے۔ دوسرا بیٹا حافظ عبدالغفار مجاہد، میرے تمام ذاتی معاملات اور میننگلز دیکھتا ہے۔ تیسرا بیٹا حافظ طلحہ آئی ٹی کا ماہر ہے۔ پورا شعبہ قائم کر دیا ہے۔ عبداللہ، عبدالرحمن اور محمد ابھی پڑھ رہے ہیں۔

میری اہلیہ حافظہ انیسہ فردوس عالمہ اور مبلغ ہیں۔ وہ ریاض میں انٹرنیشنل سکول چلاتی ہیں جو فیڈرل بورڈ اسلام آباد سے ملحق ہے۔ ۷۰۰ بچے، بچیاں وہاں پڑھ رہے ہیں۔ وہ ریاض میں خواتین کے قرآن و سنت کی تعلیم کے ۲۲ حلقے بھی چلا رہی ہیں جہاں وہ ہفتہ وار درس دیتی ہیں۔

میرے شوق اور احساس

مجھے تاریخ پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ دواڑھانی سو سے زائد کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ سیرت پہ لکھی گئی کتابیں بہت چاہت سے پڑھتا ہوں۔ یوں سمجھیں کتابوں کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ جس ملک میں جاؤں وہاں املاک سنٹر اور بک سنٹرز پہلے ڈھونڈتا ہوں۔ آفس سے آ کر مغرب تا رات ۹ بجے تک لکھنے کا کام کرتا ہوں۔ اب تک ۱۵ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ سعودی عرب کے مقبول اردو اخبار میں کالم بھی لکھتا ہوں۔

میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں۔ بہت اچھی اور بھرپور زندگی کی نعمت ملی ہے۔ ریاض میں ہونے کی صورت بچوں کے ساتھ شام کو واک پہ بھی جاتا ہوں اور باہر کھانا بھی کھاتے ہیں۔ میری مصروفیات کے باعث بچوں کی تعلیم اور کیریئر سارا اہلیہ کے ذمے تھا۔ ۳۲ سال قبل ریاض میں رہتے ہوئے جب دارالسلام ہمارے چھوٹے سے گھر کے کچن سے شروع ہوا تھا کیونکہ اس کا دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ میری اہلیہ نے وہ میرے حوالے کر دیا تھا اور خود کچن دوسری جگہ شفٹ کر لیا۔ میں نے وہاں کمپیوٹر رکھ کر کمپیوٹنگ سے کام کا آغاز کیا تھا۔

میں تنہائی میں رو دیتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی صورت اور سیرت کو موتیوں کی طرح پیش کروں کہ دیکھنے پڑھنے والے اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اب جب دنیا بھر کے ممالک میں دارالسلام کا پیغام اور کام لیے پھرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے اللہ نے میری دعا سن لی ہے۔

(معلومات کے لیے جناب عبدالعظیم اسد، پروفیسر محمد یحییٰ، عکاشہ اہل اور محترمہ انیسہ فردوس کا شکریہ)

میوزک کے بغیر بابا اسلام اور ڈیجیٹل قرآن چند سال قبل جدہ کے ایئر پورٹ پہ میں اپنے چھوٹے بیٹے محمد کے ساتھ شاپنگ ایریا میں گھوم رہا تھا جب اس نے ایک خوب صورت اور من موہنا کھلونا اٹھایا۔ اس نے جونہی ہٹن دیا کھلونے نے حرکت شروع کر دی۔ ساتھ ہی میوزک کی آواز آس پاس بکھرنے لگی، میں نے آگے بڑھ کر کھلونے کا ہٹن بند کرنا چاہا۔ بچے نے مزاحمت کی اسے کھلونا اور اس سے آتی آوازیں اچھی لگ رہی تھیں۔ بار بار سمجھانے، پکڑنے پر بھی وہ کھلونا واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تو میں نے اسے متبادل دینے کے لیے مختلف کھلونے دیکھنے شروع کیے۔ ہر کھلونا شکل سے مختلف تھا مگر ایک سا میوزک اور گانے اس کا حصہ تھے۔ اس لمحے میں نے پہلی بار سوچا کتنے ہی والدین اور بھی ہوں گے جو یہاں وہاں اپنے بچوں کی فرمائش پہ ایسے کھلونے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے جن میں میوزک نہ ہو۔

یہی لمحہ تھا جب میں نے سوچا متبادل یہ مجھے ہی کام کرنا ہوگا۔ وہاں سے میں چین گیا اور ان لوگوں سے ملا۔ جہاں ان سارے کھلونوں میں میوزک فیڈ کیا جاتا ہے، ۲۰۰۳ء وہ سال ہے جب دارالسلام کی طرف سے ”بابا سلام“ کے نام سے ایک خوب صورت پراڈکٹ بھی سامنے آگئی۔ کھلونے کو ہم نے یوں مسلمان کیا کہ اس میں قرأت کے علاوہ دعائیں اور اذکار ڈال دیے۔

اس کے بعد ہم نے عالم اسلام کا پہلا ڈیجیٹل قرآن بھی چین میں ہی تیار کیا جسے آپ قلم کی مدد سے پڑھنے اور ساتھ ہی قاری کی قرأت سنتے جاتے ہیں۔ یہ بے حد خوب صورت اور متاثر کن پیش کش ہے اور انسان کو حیران کر دیتی ہے۔ اس قلم کی مدد سے آپ کوئی بھی آیت ڈھونڈ سکتے ہیں اور مختلف قراء کی آواز میں قرأت سن سکتے ہیں۔

دینی و عصری تعلیم کی شمع

اسے مزید روشن کرنے میں ہمارا ساتھ دیں

محترمی و مکرمی جناب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

■ کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قاعدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی، ثواب آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔

■ اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفیسر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھیجا دیں گے ان شاء اللہ

■ دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں۔ ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقے سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

■ نوٹ:

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دقتی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں شکریہ۔ نیز ادارے کو دیے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

رضیہ پروین

(ایم۔ اے عربی، ایم۔ اے اردو۔ وفاق المدارس)

آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل سکول رجسٹرڈ

چونیاں سٹی ضلع قصور (۵۵۲۲۰)

Ph: 0300-4735932 / 0333-4935205



مستقبل میں معیشت، معاشرت اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی عالمی تبدیلیوں کے حوالے سے معروف کنسلٹنٹ، ٹرینروں کی زاہد سے ملاقات

2050ء سکول اور کلاس روم کا
روائتی تصور ختم ہو جائے گا

عاطف مرزا

ولی زاہد۔ پروفائل



ولی زاہد معروف کنسلٹنٹ، سپیکر، لیڈر شپ ٹرینر اور ایگزیکٹو کوچ ہیں۔ وہ Skill City کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ وہ جنوب مشرقی ایشیا، مشرق وسطیٰ، مشرقی افریقہ، یورپ کے مختلف ممالک میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ گزشتہ ۱۵ برسوں میں بے شمار مینجر اور بزنس لیڈران کی ٹریننگ سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ولی زاہد خود اپنی ٹریننگ اور تعلیم کے لیے امریکا کینیڈا اور کئی دیگر ممالک میں جا چکے ہیں۔ ولی زاہد آئی بی اے اور Szabist جیسے بڑے اداروں میں MBA لیول کے کورس پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ ۷ سال برٹش کونسل میں مینجمنٹ ڈیولپمنٹ کے ہیڈ رہے۔ برٹش کونسل سے پہلے دی نیوز کے سٹی ایڈیٹر رہے۔ اس سے پہلے ڈان اور نیشن میں کام کیا۔ نیوز پیپر سے نکلنے کا فیصلہ Deadline اور ذہنی دباؤ کے کلچر سے نکلنے کے لیے کیا۔ ۲۰۵۰ء ان کا خاص موضوع ہے۔ وہ مدیر محترم سے ملنے تشریف لائے تھے جہاں ان سے اس حوالے سے ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔

ان ۲ ممالک کے درمیان Service Centra کے طور پر بھی موجود ہو تو اس سے پاکستان کی معیشت پر اچھے اثرات ہوں گے۔ اگر اس سے بڑھ کر وہ Value added چیزوں کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ترقی کا عمل تیز ہو جائے گا۔

اگر ٹیکنالوجی کی بات کی جائے تو اس شعبے میں تیزی

”پاکستان ۲۰۵۰ء میں دنیا کی بڑی معاشی طاقتوں میں شامل ہوگا“

سے تبدیلیاں آئیں گی۔ مستقبل کے لوگ ہر چیز فوری حاصل کرنے کے عادی ہوں گے۔ فیس بک اور یوٹیوب کے آنے سے دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ معلومات Gather کرنے کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔ 3D پرنٹرز وجود میں آجائیں گے۔ ٹیکنالوجی کی بدولت موجودہ آفس کا تصور بھی ختم ہو جائے گا۔ Meetings بھی مختصر اور چھوٹی ہو جائیں گی۔ ایک دن کے کام کے گھنٹے بھی کم ہو جائیں گے۔ تعلیم کے میدان میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں گی۔ اسکول

س: ۲۰۵۰ء کے معاشی مستقبل کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟
۲۰۱۰ء کی عالمی معاشی طاقتوں میں امریکا، یورو کا علاقہ، چین، جاپان اور جرمنی شامل تھا۔ امریکی بینکنگ فرم Goldman Sachs کی ۲۰۱۲ء کی رپورٹ میں مستقبل میں ۲۰۵۰ء کی عالمی معاشی طاقتوں میں چین، امریکا، انڈیا، یورو کا علاقہ اور برازیل شامل کیے گئے ہیں۔ اس امریکی فرم کو دنیا کا پرنیمیر انویسٹمنٹ بینک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۹ء میں رکھی گئی تھی۔ ۲۰۱۲ء کی اس رپورٹ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مستقبل کی ۲۰ بڑی معاشی طاقتوں میں پاکستان بھی شامل ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق ۲۰۵۰ء میں بھارت اور چین مستقبل کی ۵ بڑی معاشی طاقتوں میں بالترتیب پہلے اور تیسرے نمبر پر موجود ہیں۔ یہ حقیقت کہ بھارت اور چین، پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں شامل ہیں، پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے بھی بڑی خوش آئند ہے اگر پاکستان

”۲۰۵۰ء میں بھارت اور چین مستقبل کی ۵ بڑی معاشی طاقتوں میں شمار ہوں گے“

ولی: سماجی حوالے سے بات کی جائے تو دنیا مجموعی طور پر صحت مند اور خوشحال ہوگی۔ مغرب میں مسلمانوں کی آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس سے ۲۰۵۰ء کے یورپ کا ثقافتی نقشہ کافی مختلف ہوگا۔ مغرب کی طرف مسلمانوں کی Migration بڑھے گی۔

Toffler Associates نے ۲۰۱۰ء میں اگلے ۴۰ سال کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ اس ادارے کی بنیاد ایلون ٹوفلر نے رکھی تھی۔ اس نے اپنی کتاب Future shock کے حوالے سے عالمگیر مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس نے ۷۰ء کی

اور کلاس روم کا روایتی تصور ختم ہو جائے گا۔ اسکول استاد کے بغیر Teacher Less ہونگے۔ پی ایچ ڈی کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ فون پر بات کرتے ہوئے زبان کا Barrier ختم ہو جائے گا۔ ایک غیر ملکی سے آسانی سے بات کی جاسکے گی اور ترجمے کی سہولت سے وہ آسانی سے آپ کی بات سمجھ جائے گا۔ شاپنگ کرنے میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔ Global Positioning System آپ کے ہوتے کے اندر ہوگا۔

س: ۲۰۵۰ء میں کیا سماجی تبدیلیاں ممکن ہوں گی؟

”۲۰۵۰ء میں گھروں کو آسانی سے موو (Move) کیا جاسکے گا“

نارویجیئن زبان میں بڑا کام

اسلامک کلچرل سنٹر ناروے کے احباب اس کامیابی پر بے پناہ خوش ہیں

ارشاد محمود - اوسلو - ناروے

زبان میں اللہ نے ہمیں ایک بڑا کام کرنے کی سعادت بخشی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور زمانہ تفسیر تفہیم القرآن اپنی اشاعت کے بعد ہی سے متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کا برصغیر کی زبانوں کے علاوہ اہم یورپین زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ اسلامک کلچرل سنٹر ناروے نے اپنی مرکزی عمارت کی تعمیر کے علاوہ ضروری اور اہم لٹریچر کا نارویجیئن زبان میں ترجمہ اپنی ترجیحات میں شامل رکھا ہوا ہے۔ ان کتابوں میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دینیات (Islams Fundamenter) اور حمودہ عبدالعاطی (Hammudah Abdulati) کی تعریف الاسلام (Islam i Fokus) کے علاوہ تمام بنیادی اسلامی معلومات کو نارویجیئن زبان میں فراہم کر دیا گیا ہے۔

۷ سال قبل تفہیم القرآن کے ظفر اسحاق انصاری کے انگریزی ترجمے Towards understanding the Quran کا نارویجیئن زبان میں ترجمہ نو مسلم طور احمد سے کرایا گیا۔ لیکن نظریاتی کے بعد محسوس ہوا کہ اہل زبان اور اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود ترجمے کی زبان میں روانی اور مفہوم کی ادائی میں کافی خامیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مترجم نے سید ابوالاعلیٰ کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی فہم اسلام بھی شامل کر دیا ہے۔ لہذا ۲۰۰۷ء میں تمام ترجمے کو ضیاء الحسن، کامران مجید، محمد رشید جیل، طاہر ریاض، طیب ریاض اور شان سلمان ڈار پر مشتمل کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جن کی تمام تعلیم ناروے میں ہوئی اور جنہیں نارویجیئن زبان پر عبور حاصل تھا۔ کمیٹی کو کسی ایجنس میں کمیٹی اسلامک کلچرل سنٹر کے امام و نائب امام مولانا محبوب الرحمان اور حافظ میاں محمد طیب سے راہنمائی حاصل کرنا تھی۔ ان ۷ سالوں میں عبدالستار طاہر، ارشد فخر الدین محمد اور ارسلان محمد نے بطور پروجیکٹ مینیجر اپنی ذمہ داریاں انجام دے کر کمیٹی کا کام آسان کر دیا۔

سورۃ فاتحہ سے سورۃ النساء جلد اول کی طباعت کا تمام کام پاکستان سے کرایا گیا۔ اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کے ڈائریکٹر محمد منظر احسن کے ہاتھوں ایک نہایت سادہ لیکن باوقار تقریب

ہوں اور اپنی Skill کا لیول بڑھاتے رہیں۔

اپنے گول سے اپنی توجہ نہ ہٹائیں اور اپنی توانائی اس کے لیے استعمال کریں۔ Flow کا نظریہ باہر نفسیات چک سینٹ مہالی نے متعارف کرایا اس کے مطابق جب آپ کسی کام میں ایسے مگن ہوں کہ وقت گزرنے کا احساس ختم ہو جائے تو آپ Flow کی کیفیت میں ہوں گے۔ اس نظریے کے مطابق جب تک Job میں بہاؤ Flow جیسی کیفیت نہ ہو اس سے حقیقی خوشی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مستقبل میں طالب علموں کو Numeracy اور Language Skill دینے کی ضرورت ہو گی۔ ہمارے ہاں کارپوریٹ دنیا میں کام کا تصور بدل رہا ہے۔ کئی کمپنیاں اپنے مینجرز سے کہہ رہی ہیں کہ وہ ایک دن گھر سے کام کریں اس سے ان کی Productivity بڑھ رہی ہے۔

س: آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے خواہش مند نوجوان

کی آپ کیا رہنمائی کریں گے؟ زندگی میں اپنے لیے وہ کام منتخب کریں جس میں آپ کا رجحان Interest ہو۔ پھر اس میں قابلیت پیدا کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ دولت کماتے جانے کی اہلیت کا تعلق آپ کے Curious ہونے سے ہے۔ بل گیس اس کی واضح مثال ہے۔ ہمیں علم نافع مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے یعنی علم (Means to an end) ہے۔ بذات خود مقصد نہیں۔ مستقبل میں ان میں سے بہت تبدیلیاں حقیقت بن جائیں گی لیکن ایک چیز کبھی نہیں بدلے گی اور وہ ہے Human Interaction کی۔ مستقبل میں ہماری ضرورت اپنی جگہ رہے گی کہ ہم اپنے دوست کے ساتھ بیٹھیں گپ شپ لگائیں اور اپنی کسی نئی ڈیجیٹل ڈیوائس کی خامیوں پر بات کریں۔

دہائی کا مطالعہ کیا اور مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے بات کی۔

Toffler Associates کی حالیہ پیش گوئیوں کے مطابق مسلمانوں کی مغرب کی طرف Migration بڑھے گی اور اس کی سماجی اور سیاسی زندگی میں زبردست تبدیلیاں ہوں گی۔ فرانس اور جرمنی میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے۔ مغرب میں اسی لیے مسلمانوں کے حوالے سے سخت رویوں اور پالیسیوں کی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ شاہد ملک برطانیہ کے پہلے مسلمان منسٹر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگلے ۳۰ برسوں میں برطانیہ میں ایک مسلمان وزیراعظم بن سکتا ہے۔ یاد رہے کہ پاکستانی نژاد سعیدہ وارثی برطانیہ کی پہلی مسلمان

خاتون منسٹر رہ چکی ہیں۔ وہ کنزرویٹو پارٹی کی شریک بانی بھی رہی ہیں۔ مستقبل کے گھر بھی ایسے ہوں گے کہ انہیں آسانی سے Move کیا جاسکے گا۔ مستقبل

کی گاڑیاں بھی Multimode ہوں گی ایک ہی گاڑی پانی اور سڑک دونوں پر استعمال کی جاسکے گی۔ خواتین مضبوط کرداروں میں نظر آئیں گی اور عالمی سطح کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں گی۔ ہم اس رجحان کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کو کئی بڑی کمپنیوں Fortune ۵۰۰ کی چیف ایگزیکٹو خواتین نظر آئیں گی۔ س: آج ان رجحانات سے کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ ولی: مستقبل کی ان تبدیلیوں کے عمل سے ہم ابھی سے فائدہ اٹھانا شروع کر سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ پر واضح ہو کہ اگلے ۵ سال میں کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بڑے خواب دیکھے جائیں اس سلسلے میں ۵ چیزیں اہم ہیں۔ Energy, Focus, Skill, Will, Flow۔ مستقبل کا لیڈر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا Goal واضح ہو۔ آپ اسے حاصل کرنے کا جذبہ رکھتے

سلیم کوثر

حوالہ
میری
پسند کا

سلیم کوثر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد جھنگ میں ان کی ریل آکر رکی اور ان کا خاندان جھنگ میں آباد ہو گیا۔ وہاں سے خانیوال چلے گئے، ہائی اسکول وہاں سے پاس کیا۔
۱۹۷۰ء میں کراچی آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اخبار کی ملازمت سے زندگی کا آغاز کیا اور پھر ۱۹۷۵ء میں ٹیلی ویژن میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۲۰۰۷ء کو وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ سلیم کوثر نے زندگی جدوجہد سے گزاری اور پھر اردو دنیا میں اللہ کے فضل سے جو نام پیدا کیا وہ اپنی جگہ مثال ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں زبان زد خاص و عام ہوئیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں، ”خالی ہاتھوں میں ارض و سما“، ”یہ چراغ ہے تو جلا رہے“، ”ذرا موسم بدلنے دو“، ”محبت ایک شجر ہے“ اور ”دنیا میری آرزو سے کم ہے“ شامل ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں شاعری کے حوالے سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں نفسی، گہرائی، وسعت اور نئے خیالوں اور جذباتوں کا اظہار ہے جو انہیں سب سے الگ کرتا ہے۔

غزل

یہ ابرگر یہ غبارِ عصیاں کو، دھو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
کوئی کہیں چھپ کے رونا چاہے تو رو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
جسے ہواؤں کی سرکشی نے بچا لیا دھوپ کی نظر سے
وہ ابر آوارہ دامنِ دل بھگو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
یہ میں ہوں تم ہو، وہ اپنی ہے، غلام ہیں اور وہ راستہ ہے
اب اس کہانی کا کوئی انجام ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
ترے لیے حسن جاگتا ہے ترے لیے عشق جاگتا ہے
سواب تو چاہے تو اپنی مرضی سے سو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
نئی مسافت کے رُت جگوں کا خمار کیسا چڑھا ہوا ہے
سلیم کوثر یہ نشہ تم کو ڈبو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی

مختلف ادوار میں، مختلف وقتوں میں، مختلف شاعروں کی مختلف شاعری طرح سے اچھی لگتی رہی ہے، پوری غزل ذرا مشکل
نی سے ملتی ہے۔ ہاں جتنے جتنے اشعار میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں ان میں سے بہت سے اشعار بڑی شاعری کی مثال کے طور
پر پیش کیے جاسکتے ہیں مگر اچھی شاعری مجھے کثرت سے یاد ہے اور یہ بھی کہ ایسے زمانے کی پڑھی سنی شاعری ہے جو حافظے میں محفوظ
ہے۔ نئی شاعری کہیں کہیں اچھی لگتی ہے مگر یاد کا حصہ نہیں بنتی، اب یہ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا ہے یا شاعری کی اپنی تاثیر۔ اچھا شعر آج
بھی اگر مجھ تک پہنچتا ہے یا میں کہیں پڑھتا ہوں تو پھر اپنے آس پاس اور دور دراز دوستوں کو ضرور سناتا ہوں۔

میر، غالب اور اقبال ہماری شاعری کے ماتھے کا تھومر ہیں۔ یہ تینوں اپنی شاعری کے اسلوب، بیان اور لب و لہجے اور فکری
طرز احساس کی جداگانہ فضا رکھتے ہوئے بھی بڑوں میں شامل ہیں کہ اندر کہیں شاعری کی دیوی ان پر بہت مہربان رہی ہے، فکر و خیال
کی گہرائیاں، وجدان کی کرم فرمائیاں، مشاہدے کی کرشمہ سازیاں مطالعہ اور علم کی آمیزش، طرزِ سخن کی انفرادیت، زبان و بیان کی
سکون آفرینی، کیا کچھ نہیں ملتا ان کے ہاں۔ عظیم شاعروں میں تمام خوبیاں یکجا ہوجاتی ہیں۔

عاشقانِ رسول (ﷺ) توجہ فرمائیں

سرور کائنات حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف حکمرانوں کے نام خطوط ارسال کیے۔ یہ تمام خطوط انتہائی
خوبصورت انداز سے معروف محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ”مکتوباتِ محمد
کائنات ﷺ“ میں شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی ان صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی بھی شامل ہیں جو یہ خطوط مبارک لے کر
جاتے رہے۔ آپ اپنی ذاتی انہیری، گہری دفتر کے لیے آج ہی اپنی کاپی بک کروالیں۔ یاد رکھیں جس گھر میں رحمت
اللہ العالمین ﷺ کے خطوط مبارک موجود ہوں گے وہ گھر دنیا کے باہر کت گھروں میں شامل ہوگا۔

رابطہ: رضویہ ٹرسٹ رجسٹرڈ سنٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

فون نمبر: 0423-5855537 0333-4393422

نئی کتابیں

پیش دستیایں..... از ڈاکٹر وحید قریشی	400/-
تحریکات پاکستان.... از پروفیسر نذیر احمد تشہ	900/-
اردو ضرب الامثال.... از پروفیسر نذیر احمد تشہ	600/-
حمید اختر..... از علامہ عبدالستار عاصم	2000/-
پاکیزہ زندگی..... از علامہ عبدالستار عاصم	500/-
پنجاب کی لوک کہانیاں..... از پروفیسر غلام مرتضیٰ	400/-
سفر آرزو..... از ملک مقبول احمد	600/-
50 نامور ادبی شخصیات..... از ملک مقبول احمد	600/-
سیاحت نامہ ترکی..... از ملک مقبول احمد	600/-
پانی سے علائق..... از ملک مقبول احمد	500/-
کماؤ، ایک محبت وطن پاکستانی کی سچی داستان.... از اے حمید	3000/-

مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور 0423-37324164 0323-4393422

میر تقی میر



میر صاحب ہماری شاعری کا وہ روشن ستارہ ہیں جس کی کرنیں ہر عہد کے افق پر اپنے ہونے کی گواہی ثبت کرتی رہی ہیں۔ یہ تصدیق اعتراف کے طور پر بھی کہ ان کا اعتراف خود ان کو محترم بناتا ہے اور یہی مسافت کا حسن ہے کہ آپ اپنے پیش روؤں کو یاد رکھیں اور پھر یوں بھی ہوا کہ انہی راستوں پر چلتے ہوئے یا گریز کرتے ہوئے بہت سے شاعروں نے اپنے لئے گفتگو کے نئے دائرے دریافت کیے اور کامیاب رہے کہ مختلف ہونا ہی زندہ رہ جانے کا، باقی رہ جانے کا راستہ ہے۔ حالات و واقعات کی تبدیلی نے شاعری کے مزاج کو ہی بدل کر رکھ دیا، مگر وہ جو میر صاحب کے شعر کی چاشنی ہے، رچاؤ ہے، بہاؤ ہے اور جو جمالیاتی حسن ہے یہ تحریریں اس کا کچھ نہیں لگاڑ سکیں۔ میر صاحب کے ہاں زندگی کے پھیلے ہوئے ابر آلود غبار آلود صحراؤں میں، درد بھری آواز کے سائے، ذات و کائنات کے اسرار اور ان کی پراسراریت کے علاوہ بہت کچھ پایا جاتا ہے۔

غزل

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفٹہ سری کا
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنچہ مڑگاں کی تری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا
نک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

اسد اللہ غالب



غالب نے اپنی راہ الگ بنائی۔ وہ بدلتی ہوئی قدروں کے جہل میں ایک زوال آمادہ معاشرہ کا عہد آفریں شاعر ہے اور یوں بھی حقیقی بڑے شاعروں کا عہد بھی ختم نہیں ہوتا۔ ہر بڑی تخلیق وقت سے اپنا مقدمہ خود لڑتی ہوئی آنے والے زمانوں کی سرحدوں کو عبور کرتی رہتی ہے۔ غالب ہماری شاعری کے افق پر ایک افسانوی کردار کی طرح چھا گیا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے سماجی، سیاسی، روحانی، جذباتی اور ذاتی رویوں میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ اپنی مشکل پسندی کے باوجود وہ ہمارے درمیان بڑی آسانی سے موجود ہے۔ اقبال کی طرح غالب ہر زمانے کا شاعر ہے۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مڑگاں کیے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسش جراحیت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامہ دلداد کھولنا
جاں، نذر دلفریبی عنوان کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوں
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دھن مڑگاں کیے ہوئے

اقبال



اقبال کی شاعری ہماری قومی آبرومندی کا استعارہ ہے۔ وہ ہماری تاریخی، سماجی، روحانی اور جذباتی قدروں کا مثبت اشاریہ ہے۔ اقبال نے نظریہ کو شاعری کی بنیاد بنایا اور پھر اس شاعری کو نظریے کے طور پر ارفع و اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا۔ وہ بڑے شاعر ہی نہیں ایک عظیم فلسفی اور دانشور، بکے مسلمان اور سچے عاشق رسول ﷺ بھی تھے۔ اقبال اپنے عہد میں بڑے سوالوں سے نبرد آزما رہے۔ اختلاف و اعتراف کے حسن کو دانش کی سطح پر، مکالمے کی رسم کے ساتھ یا خط و کتابت کے زمرے میں لاتے ہوئے ایک بڑا خزانہ نشر بھی ہمارے لئے چھوڑ گئے جو اپنے اندر حکمت و آگہی کی روشنی رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں شاعری کا جو کُن ترتیب پاتا ہے وہ بے مثال ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں خیال و فکر کی جمالیاتی آمیزش نے ان کی شاعری کو دنیا کی بڑی شاعری کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

غزل

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبح ازل کی انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا
اسی کو کب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

عبد اللہ علیم



عبد اللہ علیم زندگی کے سبھی رنگوں میں شاعر تھا۔ شاعری کے آئینہ خانے میں حسن و جمال کے عکس جو اس نے اپنے خون دل سے کشید کیے ہیں، آج بھی روشن ہیں۔ وہ عشق کی مہذب قدروں کا بے پناہ شاعر تھا اس کے ہاں عشق ہر دو صورتوں میں اپنے اسرار کھولتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے عہد میں اس کی شاعری کے اثرات موجود رہے ہیں، وہ ایک محبوب اور مقبول شاعر کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے، وہ اپنے شاعر ہونے پر نہ صرف فخر کرتا بلکہ شاعری اور شاعر کا مقدمہ ہمہ وقت لڑتا دکھائی دیتا تھا۔ بے خوف، نڈر اور بے باک اور یہ سب موسم اسے اس کی شاعری نے عطا کیے تھے۔ اس کی شاعری جذبول کی صداقت، جمالیاتی و فوری اور ذاتی تجربوں کی مہک سے ایک ایسی دنیا کا پھیلاؤ ہے جہاں اس کی آواز کے سائے پڑھنے سننے والوں کو روکتے ہیں۔ اس کے تین مجموعہ ہائے کلام ”چاند چہرہ ستارہ آنکھیں“، ”میران سرائے کا دیا“ اور ”نگار فوج کی امید میں“ شائع ہو چکے ہیں۔

غزل

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے
ملے ہیں یوں تو بہت آؤ اب ملیں یوں بھی
کہ روح گرمی انفاس سے پکھل جائے
محببتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے
زہے وہ دل جو تمنائے تازہ تر میں رہے
خوشا وہ عمر جو خوابوں ہی میں بہل جائے

10 موجدوں کی دورانِ ایجاد موت

زندگی کی خوبصورتی، آسانی اور ترقی کی بنیادیں اینٹوں پر نہیں انسانی عقل و دانش فہم اور متدبانیوں پر اٹھی ہیں آج ہم جس قدر خوشی سے ہر نئی ایجاد کی تحسین کرتے اور اسے قبول کر کے زندگی آسان کر لیتے ہیں، ہمیشہ سے ایسا آسان نہیں ہے۔ سائنسدانوں اور اہل علم کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے، جس کے لیے عام حالات میں شاید کوئی بھی تیار نہ ہو ہم آپ کے لیے ۱۰ واقعات کی گواہی لائے ہیں

علاء سجاد

ہنری ونسٹلے (Henry Winstale)

ہنری ایک بہت ہی مشہور ماہر تعمیرات اور انجینئر تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ایڈیسن روشنی منار تعمیر کیا تھا۔ ہنری روشنی منار کی قوت جاننے کے لیے ایک طوفان کے وقت روشنی منار کے ساتھ موجود رہا۔ لیکن طوفان اتنا شدید تھا کہ روشنی منار تباہ ہو گیا اور اس کے ساتھ نہ صرف ہنری کی موت واقع ہوئی بلکہ ۵ لوگ اور بھی مر گئے۔

الیکزنڈر بگدونو (Alexander Bogdonov)

الیکزنڈر ایک بہت ہی مشہور روسی ماہر فزیشن، فلاسفر، معیشت دان اور انقلابی شخص تھا۔ اس کے بہت سارے سائنسی تجربات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انتقال خون کے عمل کے ذریعے انسان کو دوبارہ جوان کیا جاسکتا ہے۔ بہت سارے مشہور و معروف لوگوں کو انتقال خون کے ذریعے جوان کیا گیا۔ الیکزنڈر نے خود کو بھی ایک شخص کے خون کے ذریعے جوان کرنا چاہا مگر خون کی عفونت (Infection) کی وجہ سے مر گیا۔



کوپر فیس کولز (Cowper Phipps Coles)

کوپر شاہی نیوی کا ایک مشہور کپتان تھا جس نے جنگ کریمیا کے دوران بحری بیڑے پر استعمال ہونے والا ایک

میرا کلام میرا یہ تحفہ قبول کر
دریا لیے ہوئے ہے یہ قطرہ قبول کر

خلیل رام پوری

خلیل رام پوری ادبی حلقوں میں جانے پہچانے شاعر تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کا کلام پاک و ہند کے کبھی رسائل کی زینت بنا۔ وہ جدید حسیت کے والہانہ شاعر تھے۔ وہ تھلویں، صحراؤں کے علاقے بھکر میں آباد تھے۔ بڑے آدمی تھے روایت کی پاسداری میں گندھے ہوئے، غزلوں کی بنت میں اپنا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ جدید غزل کو سنوارنے میں ان کا بھی حصہ نمایاں ہے۔ بڑے شہروں کی مرکزیت سے دور صحراؤں کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے خلیل رام پوری کو آپ پڑھیں گے تو لگے گا کہ وہ آپ کے دل کے کسی کونے میں پہلے سے آباد تھے بس آپ کو یاد نہیں آرہے تھے۔ وہ کہنے مشق شاعر تھے۔ نئی لفظیات کے ساتھ نئی غزل کو سنوارتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ”چراغ پانی میں“ ۱۹۸۳ میں شائع ہوا تھا۔

غزل

میرا کلام میرا یہ تحفہ قبول کر
دریا لیے ہوئے ہے یہ قطرہ قبول کر
مجھ کو یہ فخر ہے کہ ترا ترجمان ہوں
جو سامنے ہے وہ بھی تماشا قبول کر
کیا مانگتے ہیں ننگے سلگتے پہاڑ سن
کیا چاہتے ہیں ریت کے دریا قبول کر
جو لوگ مانتے نہیں میرے وجود کو
ان کو دماغ دے مرا ہونا قبول کر
وہ بھی ہیں لوگ جن کے لیے دن بھی رات ہے
ان کی نماز ان کا بھی روزہ قبول کر

بہت اداس ہو دیوار دور کے جلنے سے
مجھے بھی ٹھیک سے دیکھو جلا تو میں بھی ہوں

رئیس فروغ

رئیس فروغ ریڈیو پر ملازم تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو پاکستان کراچی کی چار دیواری میں شعرو ادب سے جڑے ہوئے اہم لوگ موجود تھے۔ عزیز حامد مدنی، حمید نسیم، سلیم احمد، قمر جمیل، محشر بدایونی، کرار نوری، اقبال فریدی، رضی اختر شوق، وجد چغتائی، ارشاد الحق قدوسی اور بہت سے نام جوان سے پہلے تھے یا ان کے بعد، ایک طویل فہرست ہے، اسی فہرست میں رئیس فروغ بھی شامل تھے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ اپنی ذاتی شناخت رکھتے تھے۔ رئیس فروغ نے بے شمار فخر تحریر کیے، بچوں کی نظمیں لکھیں، نثری اور پابند نظموں کے جال پھیلائے، مقبول گیت لکھے اور شاندار غزلیں تخلیق کیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار زبان زد عام ہوئے اور پڑھنے والوں نے انہیں اپنے درمیان ایک خوبصورت شاعر کے طور پر ہمیشہ محسوس کیا، وہ اپنی بات کو نئے زاویے سے کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ رئیس فروغ نے شاعری میں اپنی انفرادیت کو اپنی پہچان بنایا۔

غزل

کسی کسی کی طرف دیکھتا تو میں بھی ہوں
بہت بڑا نہیں اتنا بڑا تو میں بھی ہوں
بہت اداس ہو دیوار دور کے جلنے سے
مجھے بھی ٹھیک سے دیکھو جلا تو میں بھی ہوں
زمین پہ شور جو اتنا ہے ہے صرف شور نہیں
کہ درمیاں میں کہیں بولتا تو میں بھی ہوں
عجب نہیں جو مجھی پر وہ بات کھل جائے
برائے نام سہی سوچتا تو میں بھی ہوں
میں دوسروں کے جہنم سے بھاگتا ہوں فروغ
فروغ اپنے لیے دوسرا تو میں بھی ہوں

ولیم بُلوک (William Bulloch)

یہ ایک امریکی موجد تھا جس نے ۱۸۶۳ء میں گھومنے والی چھاپہ مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے چھپائی کی دنیا میں انقلاب آیا۔ ایک مرتبہ وہ مشین ٹھیک کر رہا تھا اور پاؤں سے مشین کی ایک پکی کو ٹھوکر لگائی جس کی وجہ سے پاؤں شدید زخمی ہو گیا اور پاؤں کے آپریشن کے دوران اُس کی موت واقع ہو گئی۔



جے جی پیری تھامس (J. G. Parry Thomas)

یہ ایک انجینئر اور موٹر سائیکل ریسر تھا۔ اُس نے ہمیشہ سے مل کالم Malcolm کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ایک کار ایجاد کی۔ کار میں بہت ساری خوبیاں تھیں۔ ایک لمبی چین کے ذریعے چاروں پہیے انجن سے ملحق تھے۔ ۱۹۲۶ء کو اُس نے مل کالم Malcolm کا ریکارڈ توڑ دیا۔ ایک سال بعد ۱۹۲۷ء میں مل کالم Malcolm نے پھر سے نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ پیری نے بھی اپنا ریکارڈ پھر سے قائم کرنے کے لیے ریس لگائی۔ جس کے دوران کار کی چین ٹوٹ کر اُس کی گردن میں پیوست ہو گئی جس کے سبب وہ مر گیا۔



تھامس میڈگلے جے آر (Thomas Midgley JR)

یہ ایک امریکی کیمیا دان تھا جس نے Lead Petrol اور CFCs ایجاد کیا۔ اپنی زندگی میں وہ اس نام سے مشہور ہوا، ”ایک ایسا شخص جو اپنی ایجادات کی وجہ سے تاریخ میں سب سے زیادہ اموات کا ذمہ دار بنا۔“ اُسے پولیو ہوا اور جسم میں زہر بھر گیا اور معذور ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بستر سے اٹھانے کے لیے رسیوں کی مدد سے پکی تیار کی۔ ایک دن بستر سے اٹھتے ہوئے پکی کے پھسلنے کی وجہ سے اُس کی موت واقع ہوئی۔



میری کیوری (Marie Curie)

یہ ایک فرانسیسی فزکس اور کیمیا دان تھیں۔ اُس نے ریڈیم اور پولونیم کے عناصر دریافت کیے۔ اس کے علاوہ Theory of Radioactivity اور Isolation of Radio Isotopes بھی پیش کیں۔ اُس نے ۱۹۰۳ء میں اپنے خاوند کے ساتھ مل کر نوبل انعام بھی جیتا۔ ۴ جولائی کو وہ Radiation کا عمل کر رہی تھیں جس کے دوران اُس کی موت واقع ہوئی۔



گھومنے والا برج ایجاد کیا۔ جنگ کے بعد کوپرنے اسے اپنے ذاتی بحری بیڑے پر استعمال کرنے کے لیے پینٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے اُس نے اپنے بیڑے میں بہت ساری غیر معمولی اور خطرناک تبدیلیاں کیں جس میں سے ایک بادوباراں کے لیے بنایا گیا جہاز کا عرشہ بھی تھا جس نے جہاز کی مرکزی جگہ کو اونچا کر دیا۔ ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو وہ عرشہ الٹ گیا جس کے باعث کوپرنے ہلاک ہوا اور ۵۰۰/ اور لوگ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔



کارل سووسک (Karel Soucek)

کارل ایک مشہور کینیڈین کرتب باز تھا۔ جس نے اپنا کرتب دکھانے کے لیے ایک بڑا اُبھرا ہوا ڈھول نما گیلن (ڈرم) ایجاد کیا۔ اس تماشے کے لیے ایک کمپنی نے پیسا لگایا، ڈرم کو اوپر سے نیچے تک لڑھکتے ہوئے آنا تھا اور کارل نے اُس ڈرم کے اندر موجود ہونا تھا۔ اس کام کے لیے ۱۸۰ میٹر بلند آبشار کا انتظام کیا گیا۔ کارل نے غلطی سے ڈرم کے سنٹر میں ٹھوکر مارنے کے بجائے سائیڈ والے پول پر ٹھوکر لگائی جس کی وجہ سے ڈرم غلط سمت چلا گیا۔ کارل بہت زیادہ زخمی ہوا اور دوسرے روز مر گیا۔ نیویارک کے میوزیم میں وہ ڈھول نما گیلن آج تک نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔



فرانز رچلٹ (Franz Reichlet)

یہ ایک بہت مشہور درزی تھا اور بہت ہی انوکھے اور منفرد قسم کے اوور کوٹ بناتا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ کوٹ کو پہننے والا شخص اس کی مدد سے اڑ بھی سکتا ہے۔ اُس نے وہ کوٹ پہن کر بہت سارے تماشائیوں کے سامنے ایفل ٹاور سے سیدھا نیچے کی طرف چھلانگ لگائی اور موقع پر ہی مر گیا۔



اوٹو لیلی انتھل (Otto Lilienthal)

یہ وہ شخص تھا جس نے انسان کی سب سے پہلی اڑان کو ممکن بنایا اور بغیر انجن کے اڑنے والا شہنشاہ کہلایا اور اُس نے اس طرح یعنی بغیر انجن کے کئی اڑائیں بھریں۔ اُس نے عوام اور سائنس کے نظریہ کے خلاف یہ بات ثابت کر دی کہ انسان بغیر انجن کے اڑ سکتا ہے۔ ۹ اگست ۱۸۹۶ء کو وہ ایک اڑان کے دوران گر گیا جس کے باعث اُس کی موت واقع ہوئی۔



قبائلی اور بنگالی

انگریز سرداروں کے ذریعے ہی بلوچستان پر حکومت کرتے رہے۔ گو وقتاً فوقتاً بعض بلوچ سرداروں نے انگریز راج کو لاکھارا تاہم مجموعی طور پر وہ ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ چنانچہ انگریزوں کی مدد سے سرداروں نے اپنے قبائل پر گرفت مزید مضبوط کر لی۔ حتیٰ کہ اس مسئلے نے جنم لیا! ”سردار کے علم کی پاس داری قبیلے کے ہر فرد کا اولین فرض ہے۔“ جنگ ہو یا صلح، سردار کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ قبائل اپنے سردار کی خوشنودی کے لیے جان تک قربان کر دیتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں زمین داری نظام منہدم کرنے کے بعد بنگال میں انگریزوں نے جا بجا اسکول کھولے۔ مدعا یہ تھا کہ بنگالیوں میں اپنا نظام معاشرت و سیاست متعارف کرایا جائے۔ ان اسکولوں میں عام بنگالیوں نے بھی داخلہ لیا۔ یوں ہندوستان میں سب سے پہلے بنگالی ہی جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے نظریات سے آگاہ ہوئے۔ لہذا بنگال ہی میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں اقوام کی اولین سیاسی تحریکوں نے جنم لیا۔ بنگال میں تعلیم عام ہونے کا فائدہ یہ پہنچا کہ بنگالی عوام اپنے حقوق و فرائض سے آشنا ہو گئے۔

دوسری سمت بلوچ سردار اپنے علاقوں میں اسکول کھولنے کے سخت مخالف تھے۔ انھیں علم تھا کہ اگر بلوچ عوام تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق سے آگاہ ہوئے، تو ان کی آمریت کا سورج غروب ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ تعلیمی ادارے کھولنے کی مخالفت کرتے رہے۔ آج بھی بلوچستان کے دیہی علاقوں میں اسکول بمشکل ہی کھل پاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان سے بلوچستان تک

بلوچستان کا مسئلہ

گڈ گورننس کی عدم موجودگی ہے

سہولتیں دے کر مگر جانیں لے کر بلوچوں کو اپنا بنایا جاسکتا ہے؟

سید عامر محمود

ہے۔ لیکن ان کے دور میں اس سرداری یا قبائلی نظام کو زندہ نہ بچنی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گیا۔

آبادی کی تقسیم

بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے حالات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر علاقہ کل پاکستانی رقبے کا ۴۲ فیصد رقبہ رکھتا ہے۔ تاہم یہ لحاظ آبادی وہاں صرف ۴ فیصد پاکستانی آباد ہیں۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں کل پاکستانی آبادی میں سے ۵۲ فیصد لوگ آباد تھے۔

مزید برآں مشرقی پاکستان کی ۹۵ فیصد آبادی بنگالیوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ بلوچستان میں بلوچ اکثریت نہیں رکھتے، اس پاکستانی صوبے میں تقریباً ۸۰ لاکھ افراد بستے ہیں۔ ان میں سے ۵۰ لاکھ لوگ پشتون، برہوئی اور مکرانی نسل کے ہیں۔ نیز انہی میں ہزار ہا پنجابی و سندھی آباد کار بھی شامل ہیں۔

بلوچستان میں ۳۰ لاکھ بلوچ آباد ہیں۔ یہ کم و بیش ۱۵۰ قبائل میں تقسیم ہیں۔ قبائل کے تین طبقے ہیں..... سردار قبائل، متوسط قبائل اور زیر دست قبائل۔

سردار قبائل زمین رکھتے اور صنعت حرفت کی وجہ سے دولت کے بھی حامل ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر و رسوخ بلوچ معاشرے میں سب سے زیادہ ہے۔ باغی بلوچوں کی اکثریت کا تعلق تین سردار قبائل مری، بگتی اور مینگل ہی سے ہے۔ متوسط قبائل کھیتی باڑی، باغبانی اور گلہ بانی سے پیٹ پالتے ہیں، جب کہ زیر دست قبائل درج بالا قبیلوں کی نوکری چاکری کرتے ہیں۔

عام طور پر سردار کا بڑا بیٹا ہی اس کی وفات کے بعد باپ کی گدی سنبھالتا ہے، تاہم ولی عہدوں کے مابین خانہ جنگی بھی ہو سکتی ہے مثلاً آج کل اکبر بگتی کے ۳ پوتے..... براہمدار بگتی، میر عالی بگتی اور شاہ زین بگتی دادا کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ نواب خیر بخش مری جب رخصت ہوئے، تو ان کی اولاد بھی جائیداد کی خاطر لڑ پڑے گی۔

سرداری نظام کی خوبیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فوری انصاف مہیا کرتا، نیز غریبوں کو تحفظ دیتا ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ سردار انصاف پسند، غریب دوست، رحمدل اور شریف ہو۔ لہذا ایک آمر سردار

ہے۔ آئیے تاریخ و حقائق کی روشنی میں ان دونوں پاکستانی علاقوں کا جائزہ لیں جہاں علیحدگی کی تحریکوں نے جنم لیا۔

قوم اور معاشرہ

مشرقی پاکستان میں سرداری نظام غنقا تھا۔ جب انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کیا، تو انھوں نے ٹیکس لگا لگا کر بڑے زمین داروں کو اتنا نیچوڑا کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ صرف شہروں میں ان کی باقیات رہ گئی۔ ماضی کے نوابوں کی یہ اولاد بھی مالی طور پر مستحکم نہ تھی، لوگ صرف معزز خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔

دوسری سمت سرداری نظام بلوچ معاشرے کا سب سے مضبوط ستون ہے۔ (یہ اب آکر کچھ کمزور ہوا ہے) وہاں جس قبیلے کا سردار نہ ہو، اسے عزت و وقار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ عجیب بات یہ کہ ۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے بلوچستان پر قبضہ کیا اور پھر ۱۹۴۷ء تک حکومت کرتے

میں بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ سردار اختر مینگل دہی سے اسلام آباد پہنچے۔ وہ دہی میں جلا وطنی کی پُر آسائش زندگی گزار رہے تھے۔ موصوف مسئلہ بلوچستان کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں بیان دینے پاکستان آئے۔ سپریم کورٹ میں اور پاکستانی سیاست دانوں سے ملاقاتوں کے دوران بھی انھوں نے چھ مطالبات دہرائے۔ سردار مینگل نے اپنے مطالبات کو شیخ مجیب الرحمن کے ”چھ نکات“ سے ملتا جلتا قرار دیا۔ اس بات نے قومی سطح پر خاصی ہلچل مچائی اور یہ سوال اٹھا کہ کیا بلوچستان میں مشرقی پاکستان جیسی شورش اور بغاوت کے تانے بانے تو نہیں بنے جا رہے؟

حالات کے مطالعے سے افشا ہوتا ہے کہ سردار مینگل اپنے مطالبوں کو ۶ نکات سے تشبیہ دے کر محض محبت وطن پاکستانیوں کو خوفزدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی شورش میں زمین آسمان کا فرق

قبیلے والوں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ تاریخ کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ سرداروں کی اکثریت ظالم و جابر رہی ہے۔

شورش کی وجوہ

قیام پاکستان کے بعد جلد ہی بلوچستان بھی شورش کا نشانہ بن گیا۔ وجہ یہ ہے کہ جب بڑے سرداروں نے دیکھا کہ جمہوری نظام ان کا اثر و رسوخ اور بادشاہی محدود کر سکتا ہے، تو انھوں نے صوبائی خود مختاری کا نعرہ بلند کر دیا۔ گویا انھوں نے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر حکومت پاکستان سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں بلوچ عوام کا کوئی کردار نہ تھا، لیکن سرداروں کی رعایا اور ناخواندہ وفادار ہونے کے باعث انھیں بھی مجبوراً بغاوت میں حصہ لینا پڑا۔ بلوچستان میں گیس کی رائٹھی کا معاملہ بھی وفاقی حکومت اور سرداروں کے مابین وجہ نزاع بنا۔

بنیادی طور پر مری، مینگل اور بگٹی قبائل کے سردار بغاوت میں پیش پیش تھے۔ آج بھی انہی کے علاقوں مثلاً کولہو، خضدار اور سبی میں باغیوں کا زور زیادہ ہے۔ ان کی تعداد ۲ سے ۱۵ ہزار کے مابین بتائی جاتی ہے۔ یہ بھی پیارے اپنے سرداروں کے انتہائی وفادار اور ان پر جان نثار کرنے والے ہیں۔

غرض مشرقی پاکستان میں بغاوت کو اس لیے کامیابی ملی کہ بنگالی عوام نے اسے بہت پذیرائی بخشی جب کہ بلوچستان میں بغاوت کا مرکز چند بڑے سردار اور ان کے زر خرید غلام ہیں۔ ورنہ بلوچوں اور پشتونوں کی اکثریت ”عظیم بلوچستان“ قائم کرنے کا خواب نہیں دیکھتی۔ اسی لیے بلوچستان کا پاکستان سے علیحدہ ہونا ناممکن ہے۔

بھارت کا کردار

بھارتی حکومت شروع سے پاکستان کو سالم برصغیر کا حصہ سمجھتی ہے۔ لہذا حکمران طبقہ پاکستان کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ

بھارتی فوج ہی نے مشرقی پاکستان کے باغیوں کو جنگی تربیت دی اور اسلحہ فراہم کیا۔ اگر مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدیں نہ ملی ہوتیں، تو شاید بغاوت ناکام ہو جاتی۔

باغی بلوچ سردار اکثر بھارت میں چلے اور تقاریب منعقد کرتے اور وہاں تقریروں میں پاکستان کے خلاف زہر اگلے ہیں۔ مزید برآں ۲۰۰۲ء کے بعد افغانستان میں بھارت کا اثر و نفوذ بڑھا، تو بھارتیوں کے لیے بلوچستان تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ خود پاکستانی حکومت کا دعویٰ ہے کہ باغی بلوچ افغانستان میں قائم بھارتی فوجی اڈوں میں جنگی تربیت پاتے اور پھر بلوچستان آ کر تفریق آمیز کاروائیاں کرتے ہیں۔ بھارتیوں کا باغیوں کو جنگی تربیت اور اسلحہ فراہم کرنا..... شاید مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی بغاوتوں کے مابین یہ واحد مماثلت ہے۔

امریکا کی غرض و غایت

افغانستان (اور پاکستان کی بھی) جغرافیائی حیثیت کے باعث امریکا یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ یہ علاقہ قدرتی وسائل سے مالا مال خطے کے قلب میں واقع ہے۔ نیز یہاں سے تین بڑی طاقتوں چین، روس اور بھارت کی سرحدیں ملتی ہیں۔ امریکا چاہتا ہے کہ چین اور روس کا مقابلہ وہ بھارت کے ساتھ مل کر کرے۔ اسی لیے امریکیوں کی خواہش ہے کہ پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کر لے۔

لیکن پاک فوج یہ حکم تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اسی لیے امریکا کی تمنا ہے کہ علاقائی جنگیں چھیڑ کر پاک فوج کو کمزور کیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت بعید نہیں کہ سی آئی اے اور را کے ایجنٹ بلوچستان، خیبر پختون خواہ اور سندھ میں قتل و غارت کر رہے ہوں۔ مثلاً بلوچستان میں وہ چاروں نسل کے افراد اور پنجابی و سندھی آباد کاروں کو مار گرتے رہے ہیں تاکہ مختلف پاکستانی نسلوں کے مابین دشمنی ابھاری جائے۔ اسی طرح کراچی میں بھی غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹ فساد میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

عالمی طاقتوں کے کھیل کی ایک جہت ایران سے بھی وابستہ ہے۔ بلوچستان کے تاریخی خطے کا ایک حصہ ایران میں شامل ہے۔ باغی بلوچ پاکستانی و ایرانی حصوں کو ملا کر ”عظیم بلوچستان“ نامی آزاد مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ زوری میں بعض امریکی ارکان کانگریس نے اس مملکت کے قیام کی حمایت کی۔ مدعا ایران پر دباؤ ڈالنا بھی تھا جو امریکی استعمار کے خلاف نبرد آزما ہے۔

اختر مینگل کے ۶ نکات

اب آئیے شیخ مجیب الرحمن اور اختر مینگل کے چھ نکات کا جائزہ لیں۔ شیخ صاحب کا ۶ نکاتی منصوبہ کچھ یوں تھا:

- ۱۔ وفاق پاکستان کو مضبوط بنایا جائے اور پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کی جائے۔
- ۲۔ وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ اپنے ہاتھ رکھے، بقیہ محکمے ریاستوں (صوبوں) کے مابین تقسیم کر دیے۔
- ۳۔ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ کرنسی اور اسٹیٹ بینک تشکیل دیا جائے۔
- ۴۔ ٹیکس لینے کا نظام ریاستوں کو ملنا چاہیے۔
- ۵۔ مشرقی پاکستان کے لیے غیر ملکی زرمبادلہ کا الگ اکاؤنٹ کھولا جائے۔

۶۔ اسی طرح ریاست کے لیے ملیشیا یا نیم فوجی دستے علیحدہ سے بنائے جائیں۔

اختر مینگل نے مسئلہ بلوچستان حل کرنے کی خاطر پیر ایم کوٹ اور وفاقی حکومت کے بھی سامنے یہ ۶ نکات پیش کیے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ باغیوں کے موجودہ سردار یورپ میں پُر آسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ جب کہ ان کی نام نہاد فوج کے سپاہی پہاڑوں میں چھپ اور خاندان سے کٹ کر بڑے گھٹن حالات میں زندگیاں گزار رہے ہیں۔ ہر دم ان کے سروں پر موت کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ وہ اپنے حقوق کی خاطر نہیں سرداروں کی حکومت بچانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ انہی احساسات کے باعث باغیوں میں بددلی بھی پھیل رہی ہے۔

۱۔ بلوچستان میں قبائل کے خلاف تمام خفیہ و عیاں آپریشن ختم کیے جائیں۔

۲۔ جتنے بھی گمشدہ لوگ سیکورٹی فورسز نے گرفتار کر رکھے ہیں، عدالتوں میں لائے جائیں۔

۳۔ آئی ایس آئی اور ایم آئی (ملٹری انٹیلی جنس) کی رہنمائی میں جتنے بھی خفیہ قاتل سکواڈ کام کر رہے ہیں، وہ ختم کیے جائیں۔

۴۔ تمام بلوچ سیاسی جماعتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ آزادی سے اپنی سرگرمیاں انجام دیں۔ خفیہ ایجنسیاں ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔

۵۔ بلوچ رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل اور تشدد میں جو بھی لوگ ملوث ہیں، انھیں عدالتی کٹہرے میں لایا جائے۔

۶۔ متاثرہ علاقوں سے ہجرت کرنے والے ہزار ہا بلوچوں کو مناسب طریقے سے آباد کیا جائے۔

شیخ مجیب الرحمن اور اختر مینگل کے ۶ نکاتی منصوبوں سے عیاں ہے کہ اول الذکر واضح طور پر علیحدگی کی راہ پر چل رہے تھے۔ جب کہ اختر مینگل نے وہی مطالبات پیش کیے جو قومی سیاسی جماعتیں بھی سامنے لا چکی ہیں۔ ان نکات سے شاید ہی کوئی باشعور فرد اختلاف کرے۔

اچھے انتظامات کی عدم موجودگی

ہمارا پیارا صوبہ بلوچستان لذیذ پھلوں، خوبصورت دست کاروں، قیمتی قدرتی وسائل اور حسین باشندوں کا خطہ ہے۔ جو کچھ عرصہ کسی بلوچ شہر میں گزار دے وہ پھر علاقے کے فطری حسن کو بھول نہیں پاتا۔ افسوس کہ پچھلے ایک عشرے سے اس دلکش خطے کو گہن لگ گیا۔ اب وہاں سے خوفناک خبریں ہی آتی اور دل دہلا جاتی ہیں۔

حمود الرحمن کمیشن

رپورٹ 29 سال تک کیوں منظر عام پر نہ آ سکی؟

کمیشن کے مطابق یحییٰ خاں کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی؟

عبدالاحد



بھٹو نے چیئرمین کمیشن کو خط کیوں لکھا؟

جسٹس حمود الرحمن یکم نومبر ۱۹۱۰ء میں بھارت کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اور یونیورسٹی آف لندن سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ حمود الرحمن نے اپنا کیریئر ایک وکیل کے طور پر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ ہائی کورٹ سے شروع کیا۔ وہ ۱۹۴۰ء میں کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں کلکتہ کے ڈپٹی میئر بنے۔ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء وہ بنگال کی جونیئر مینسٹری کونسل کے ممبر رہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے شہر ڈھاکا چلے آئے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ

جنرل بنے اور ۱۹۵۴ء میں ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج بننے پر ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے اقبال حمود الرحمن اسلام آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ نومبر ۲۰۰۷ء میں پرویز مشرف نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کی تو انھوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے بحال ہونے کے بعد لاہور ہائیکورٹ سے کام شروع کیا۔ جسٹس حمود الرحمن ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج اور ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ وہ کراچی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ سپریم کورٹ آف پاکستان

انٹر مینگل نے وہی مطالبات پیش کیے جو قومی سیاسی جماعتیں بھی سامنے لا چکی ہیں۔ ان نکات سے شاید ہی کوئی باشعور فرد اختلاف کرے

میں نفرت پھیلانے کا بھی سبب بنتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ مشرقی پاکستان پر مرحوم حبیب جالب نے کہا تھا۔ محبت گولیوں سے ہو رہے ہو وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

حاصل کلام

حقائق و حالات سے عیاں ہے کہ مشرقی پاکستان اور بلوچستان میں بغاوت کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اول الذکر میں عوام بغاوت کا حصہ تھے۔ لیکن آخر الذکر میں شورش کا محور صرف چند بڑے سردار ہیں۔

دوسرا امر یہ ہے کہ بلوچ بغاوت کو اکثر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ خصوصاً جب سپریم کورٹ حکومت وقت کے خلاف سرگرم ہو، تو اچانک بلوچستان میں فساد بڑھ جاتا ہے۔ تب پریس بلوچ بغاوت کی طرف متوجہ ہوتا اور اس کے متعلق خوب خبریں دیتا ہے۔ اس ہنگامے میں حکومت کے خلاف سپریم کورٹ کی سرگرمی دب سی جاتی ہے۔

بہر حال ضروری ہے کہ مسئلہ تدبیر و صبر سے سلجھایا جائے۔ جب مشرقی پاکستان میں طاقت استعمال ہوئی تو حالات مزید بگڑ گئے اور پھر قابو میں نہ آئے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ پاک فوج بلوچ عوام کے لیے مختلف خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس نے وہاں تعلیمی ادارے اور ہسپتال تعمیر کرائے نیز ملازمتیں فراہم کرنے والے ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔ بلوچ عوام کو ان کے حقوق دے کر ہی انھیں محبت وطن بنایا جاسکتا ہے۔

البتہ بلوچ عوام کا کہنا ہے کہ سہولتیں دے کر اور جانیں لے کر کسی کو اپنا کیسے بنایا جاسکتا ہے.....!

بلوچستان کا ایک بڑا مسئلہ اچھے انتظام یا گڈ گورنس کی عدم موجودگی ہے۔ اب موجودہ صوبائی حکومت ہی کو لیجیے۔ اس کے وزیر اعلیٰ سال کا بیشتر عرصہ اسلام آباد میں رہتے اور قیمتی گاڑیوں میں گھومتے گزارتے ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے ۶۵ رکن ہیں اور ایک کے سوا سب وزیر یا مشیر ہیں۔ یہ اکلوتا صوبہ ہے جہاں ارکان اسمبلی ایک دوسرے پر ہی نہیں وزراء پر بھی الزام لگاتے ہیں کہ وہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث ہیں۔

مزید برآں صوبے میں کرپشن کا دور دورہ ہے۔ ارکان اسمبلی کو ترقیاتی منصوبوں کے لیے حکومت کی طرف جو کروڑوں روپے ملیں، اس کا بیشتر حصہ ان کی تجویزوں میں جاتا یا پھر ان کے ایجنٹ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جب حکمران طبقہ ہی کرپٹ ہو، تو صوبے میں لاقانونیت، غربت، جہالت اور احساس محرومی نے قدرتنا پھیلنا ہی ہے۔

سیکورٹی فورسز پر الزامات

قوم پرست بلوچ رہنما پاک فوج سمیت مختلف سیکورٹی فورسز پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے پچھلے ۱۰ برس میں ۸ تا ۱۰ ہزار بلوچ باشندے غائب کر دیے۔ سیکورٹی فورسز اس الزام سے انکاری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غائب شدہ بعض افراد بلوچستان یا افغانستان کے فراری کیمپوں (علیحدگی پسندوں کے اڈوں) میں مقیم ہیں۔ یا پھر وہ قبائلی جنگ کا نشانہ بن چکے۔

ماہرین یہ امر بھی آشکار کرتے ہیں کہ علیحدگی پسندوں سے نمٹنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہے ورنہ وہ شیر ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے، اگر بلوچستان میں سیکورٹی فورسز امن و امان قائم نہ کرتیں، تو حالات مزید خراب ہو جاتے۔ تاہم طاقت کا غیر ضروری استعمال اور تشدد عوام



جسٹس حمود الرحمن جنرل ضیاء الحق سے ملنے کیوں گئے؟



along with other senior military colleagues.[8]

The report accused General Yahya Khan, of being a womanizer and an alcoholic.[2] According to the report "Firm and proper action would not only satisfy the nation's demand for punishment where it is deserved, but would also ensure against any future recurrence of the kind of shameful conduct displayed during the 1971 war" [Wikipedia])

۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ء جسٹس حمود الرحمن نے کمیشن کی تفتیش سے متعلق کئی سینئر ملٹری آفیسرز اور بنگالی قوم پرستوں کے انٹرویوز کیے۔ گورنمنٹ پر تنقید کرنے اور سیاستدانوں پر سنجیدہ الزامات ثابت ہونے کے باعث اس رپورٹ کو عوام کے سامنے لانے کے بجائے "ٹاپ سیکرٹ" کہہ کر دبا دیا گیا۔

اس رپورٹ میں کئی سینئر ملٹری آفیسرز کا کورٹ مارشل کرنے اور کئی کا ٹرائل کرنے کی پُر زور سفارش کی گئی تھی۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پاکستان آرمی کے کمانڈر ان چیف جنرل یحییٰ خان، اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، جنرل عبدالحمید خان، لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم ایم پیرزادہ، لیفٹیننٹ جنرل گل حسن، میجر جنرل عمر اور میجر جنرل مٹھا، (آرمی کے ایس ایس گروپ کے کمانڈر) کو ایوب خان کی حکومت کے خلاف سازش کرنے پر قرار واقعی سزا دی جائے۔ دیگر ۵ لیفٹیننٹ اور ۳ بریگیڈیئرز جن میں لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی، محمد جمشید، محمد رحیم خان، ارشاد احمد خان، بی ایم مصطفیٰ اور بریگیڈیئر

کی ادائی سے دور ہو گئے۔ جس کے باعث ملٹری کے کئی بڑے عہدیدار اپنی قابلیت کے باوجود لڑنے سے عاری رہے۔ رپورٹ کے مطابق جنرل یحییٰ خان نے جان بوجھ کر ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ رپورٹ نے یحییٰ خان پر الزام لگایا کہ وہ زانی اور شرابی تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ قوم صرف ایسے اقدامات سے خوش نہیں ہوگی کہ ان غداروں کو صرف سزا دی جائے بلکہ آئندہ ایسی کوئی شرمناک غلطی نہ ہو، اسے یقینی بنایا جائے۔

(The report accused the generals of what it called a premature surrender and said the military's continued involvement in running the government after 1958 was one reason for the corruption and ineffectiveness of senior officers. 'Even responsible service officers,' the report said, 'have asserted before us that because of corruption resulting from such involvement, the lust for wine and women and greed for lands and houses, a large number of senior army officers, particularly those occupying the highest positions, had lost not only their will to fight but also their professional competence.' [8] The report said Pakistan's military ruler at the time, General Yahya Khan, who stepped down after Pakistan's defeat in December 1971, 'permitted and even instigated' the surrender, and it recommended that he be publicly tried

۱۹۷۴ء کو لاہور میں ایک میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایبٹ آباد سے دوبارہ تفتیشی کارروائی شروع کی جائے گی۔ ۱۹۷۴ء میں کمیشن نے مزید ۳۷ بیوروکریٹس اور ملٹری ہائی کمان کے آفیسرز کے انٹرویوز کیے۔ کمیشن نے تقریباً ۳۰۰ لوگوں کے انٹرویوز اور سیکڑوں ڈاکومنٹس سے متعلق چھان بین کی حتمی رپورٹ جسے سپریم کورٹ نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں پیش کی۔ رپورٹ ثابت کرتی ہے کہ کس قدر سیاسی، انتظامی، اخلاقی پستی، بدانتظامی، بدینیتی اور بد اعمالی مشرقی پاکستان میں پاکستانی فورسز کے سرنڈر کی وجہ بنی۔

کمیشن کے اہم نتائج

کمیشن نے بنگلہ دیش کے راہنماؤں کی طرف سے جاری کردہ دعوؤں پر مبنی رپورٹ کو چیلنج کیا۔ ان کے مطابق پاکستانی آرمی پر ۳۰ ملین بنگالیوں کے قتل اور ۲ لاکھ بنگالی عورتوں کی عصمت دری کے الزامات تھے جبکہ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق مرنے والوں کی یہ تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۶ ہزار ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی آرمی نے پورے بنگلہ دیش میں لوگوں کا بے ہیمات قتل کیا جن میں عام شہری، دانشور، پیشہ ور اور دوسرے لوگ شامل ہیں اور ان سب کو اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا۔

بنگالی فوجیوں اور سپاہیوں کو ان کی بغاوت کی وجہ سے قتل کیا اور کئی مشرقی پاکستانی صنعت کاروں اور کاروباری حضرات کا قتل کیا اور بہت ساری مشرقی پاکستان کی عورتوں کی جان بوجھ کر انتقام کی غرض سے عزت لوٹی گئی اور ان پر تشدد کیا۔ اقلیتی ہندوؤں کو جان بوجھ کے قتل کیا۔ کمیشن نے سوال اٹھایا کہ ملٹری جنرلز نے ہتھیار کیوں ڈالے؟ ۱۹۵۸ء میں حکومتی معاملات کو چلانے میں آرمی کیوں ملوث رہی، آرمی کا حکومتی کاموں میں ملوث ہونا مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے میں بڑی وجہ ثابت ہوا۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق کئی ذمے دار آفیسرز بھی شراب، شباب، زراور زمین کے لالچ میں آکر فرائض

کے حج منتخب ہوئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۶۸ء میں چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے اور پاکستان کے ساتویں چیف جسٹس بنے۔ وہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد انھوں نے اپنی شہریت تبدیل کر کے پاکستان سے منسوب کر لی۔ انھوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو کراچی میں وفات پائی۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے نائن امتیاز اور ہلال امتیاز بھی عطا ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکہ کے اسباب کی چھان بین کے لیے جسٹس حمود الرحمن کی سربراہی میں "حمود الرحمن کمیشن" بنایا تو یہ زیادہ مشہور ہوئے۔

حمود الرحمن کمیشن میں سپریم کورٹ کے جسٹس انوار الحق اور چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ طفیل علی عبدالرحمن کے علاوہ بلوچستان ہائی کورٹ کے ۲ ممبر شامل تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) الطاف قادر کمیشن کے ملٹری ایڈوائزر تھے۔

حمود الرحمن کمیشن کی پہلی رپورٹ جولائی ۱۹۷۲ء میں صدر ہاؤس میں صدر بھٹو کو پیش کی گئی۔ کمیشن کے مطابق یہ ابتدائی رپورٹ تھی کیونکہ کئی ایسے لوگوں کا انٹرویو ہونا باقی تھا جو کہ اس وقت بھارت کی قید میں تھے۔ کمیشن نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور دوسرے معاملات سے متعلق ہمارے مشاہدات اور نتائج صرف مشرقی کمانڈ کے کمانڈنگ آفیسر اور اس کے ساتھ کے کئی دوسرے سینئر آفیسرز کے انٹرویو کے بعد ہی حتمی قرار پاسکتے ہیں۔ شروع میں کمیشن نے ۲۱۳ لوگوں کے انٹرویوز کے لیے رپورٹ کی ۱۲ کاپیاں مرتب کیں، جس میں سے ایک کاپی بھٹو صاحب کو دی گئی جبکہ بقیہ کاپیاں یا تو ضائع کر دی گئیں یا پھر چرائی گئیں۔

بھارت سے قیدی رہا ہونے کے بعد ۱۹۷۴ء میں کمیشن کی کارروائی دوبارہ شروع کی گئی۔ اس وقت کئی اور محب وطن لوگوں نے بھی کمیشن کو انٹرویو دیے جو کہ کمیشن کی تفتیش میں مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ کمیشن نے ۳۷ جن



اُردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضرہ

صغیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

بچوں کی رنگت خراب ہو رہی ہے

س: میری ۲ جڑواں بیٹیاں ہیں۔ عمر ۱۳ سال ہے۔ ان کا رنگ پہلے سفید تھا اب عجیب سی رنگت ہو گئی ہے۔ بیٹا ساڑھے گیارہ سال کا ہے ۱۷ سال پہلے یرقان ہو گیا تھا۔ جب سے وہ بہت سست رہتا ہے۔ تھک جاتا ہے۔ ناک پر تل نکل رہے ہیں۔ ناک سے خون بھی آتا ہے۔ بچوں کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ بتائیے کیا کروں؟ (دردانہ۔ لاہور)

ج: دردانہ آپ لاہور میں رہتی ہیں۔ آپ کسی اچھے حکیم سے بچوں کے متعلق مشورہ کریں۔ اس عمر میں تو رنگ نکھرتا ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟ پیٹ میں کیڑے تو نہیں۔ بھائی عبدالوحید سلیمانی صاحب کے پاس اچھی دوائیاں ہیں۔ آپ بچوں کو دکھا کر دوا لیجیے۔ اسی طرح یرقان کے بعد غذا کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کا اثر رہتا ہے۔ پہلی فرصت میں بچوں پر توجہ دیں۔ دوا کھلائیے، بچوں کو بڑھتی ہوئی عمر میں متوازن اور اچھی غذا دینی چاہیے۔ اناج، بیج، سبزی اور پھل روزانہ خوراک میں شامل ہونے چاہئیں۔ شہد قدرت کا انمول تھنہ ہے۔ گردے، جگر کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ اس کے کھانے سے چہرے کی رنگت نکھرتی جاتی ہے۔ جسم کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیماری کے بعد کی کمزوری دور ہوتی ہے۔ چند روز بچوں کو گیہوں کا دلیا دودھ میں پکا کر شہد ڈال کر کھلائیے۔ موسم کے پھل کھلائیے۔ گاجر کا جوس بچوں کو پلائیے اور گاجر کا حلوہ بنا کر کھلائیے۔ ذرا کی فروٹ بھی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ ۱۵ بادام اور چھ بھر کشمش رات کو دودھ کے ساتھ بچوں کو دیجیے۔ اس سے حافظہ بہتر ہوگا اور صحت بھی۔ مناسب دوا اور اچھی غذا سے بچوں کی بڑھوتری صحیح رہے گی۔ قد، کٹھ بھی بڑھے گا۔

جسمانی کمزوری

س: قاری رحمان حیدر ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتے ہیں کہ ”آپ کا مشورہ حاضر ہے۔“ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ میرا چہرہ بے رونق ہے اور جسم بھی ڈبلا پتلا ہے۔ جس کی وجہ سے میں احساس کمتری کا شکار ہوں۔ دوستوں میں سب سے کمزور ہوں۔ مجھے بتائیے کیا کروں؟ کیسے میری صحت بہتر ہو سکتی ہے۔

حمود الرحمن کمیشن نے ۱۹۷۱ء کے بحران میں بھٹو کو ملوث پایا اور اس کے کردار پر گرفت کی۔ جسٹس حمود الرحمن کے مطابق یہ بچکی خان کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ وہ سیاست میں آئے۔ جسٹس حمود الرحمن کی رپورٹ کے مطابق ملک کے دو تخت ہونے کی ذمہ داری اس وقت کی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ جب رپورٹ بھٹو کو پیش کی گئی تو اس نے چیئر مین کمیشن کو جواب لکھا کہ کمیشن نے متعین کی گئی حدود میں زیادتی کی ہے۔ کمیشن کو ملٹری کی ناکامیوں کے متعلق تفتیش کے لیے کہا گیا تھا نہ کہ سیاسی ناکامیوں سے متعلق اور بھٹو نے رپورٹ پر ٹاپ سیکرٹ کی مہر لگا کر فائل ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ جلد ہی نیول انٹیلی جنس والے وزیر اعظم سیکرٹریٹ سے وہ رپورٹ کسی طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے حمود الرحمن کو بتایا کہ کمیشن کی رپورٹ پرائم منسٹر سیکرٹریٹ سے گم ہو گئی یا پھر چرائی گئی ہے اور وہ کہیں بھی نہیں مل رہی۔ جسٹس حمود الرحمن چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ رپورٹ کو منظر عام پر لایا جائے مگر ضیاء الحق نے بھی وہی جواب دیا کہ رپورٹ کہیں نہیں مل رہی اور کوئی نہیں جانتا کہ رپورٹ کہاں گئی ہے؟ تاہم اگست ۲۰۰۰ء میں رپورٹ کے کچھ حصے بھارتی میگزین انڈیا ٹو ڈے میں شائع ہوئے اور کچھ دنوں بعد پاکستان کے انگلش اخبار ڈان نے سپلمنٹری رپورٹ کی تفصیل شائع کی۔ دسمبر ۲۰۰۰ء میں ۲۹ سال بعد صدر پرویز مشرف نے پہلی بار پوری رپورٹ منظر عام پر لانے کی منظوری دی۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ملک ٹوٹ گیا۔ افواج پاکستان کی عزت، نام اور وقار پر دھبا لگا مگر کمیشن بنانے سے زیادہ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا۔ زندہ قومیں اپنی غلطیوں سے سیکھتی اور آئندہ ویسی غلطیاں کرنے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ اول تو غلطی مانتے نہیں اور مان لیں تو اس سے کچھ سیکھتے نہیں۔ یقین نہیں آتا تو نمونے کے طور پر بلوچستان اور وزیرستان کو دیکھ لیں۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ملک ٹوٹ گیا۔ افواج پاکستان کی عزت، نام اور وقار پر دھبا لگا مگر کمیشن بنانے سے زیادہ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا۔ زندہ قومیں اپنی غلطیوں سے سیکھتی اور آئندہ ویسی غلطیاں کرنے سے محفوظ ہو جاتی ہیں

=====

جنرل جی ایم باقر صدیقی، محمد حیات اور محمد اسلم نیازی کو فرائض کی ادائی میں کوتاہی کی وجہ سے سزا دینی چاہیے۔ کمیشن کے مطابق جنرل مصطفیٰ کا بھارت میں راجستھان کے علاقے رام گڑھ پر قبضہ کرنے کا جارحانہ منصوبہ نہایت ہی غیر معتبر اور حقیرانہ تھا۔ جس کے نتیجے کے طور پر صحراؤں میں ڈیمیکلو اور ساز و سامان چھوڑ کر آنا پڑا۔ اس کمیشن نے پاکستان فضائیہ کے لیفٹیننٹ جنرل انعام الحق مشرقی پاکستان نیول کمانڈ کے کمانڈر وائس ایڈمرل محمد شریف، لیفٹیننٹ جنرل نکا خان، مشرقی پاکستان آرمی کے جنرل کمانڈنگ آفیسر اور پاکستان آرمی کے سابقہ جنرل عامر خان نیازی اور راؤ فرمان علی کا کورٹ مارشل کرنے کی بھی سفارش کی تھی، تاہم بھٹو اور اس کی حکومت نے کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا نہ کسی سفارش کو عملی جامہ پہنایا اور رپورٹ مردہ خانے میں پھینک دی گئی۔ حمود الرحمن نے فوجی اور سیاسی پہلوؤں کے حوالے سے رپورٹ میں ۵ الگ الگ ابواب لکھے اور ذوالفقار علی بھٹو کے متنازع کردار کے متعلق بھی وضاحت سے لکھا۔

ج: کچھ لوگ وراثت میں ہی دبلا پن لے کر آتے ہیں۔ اب مجھے معلوم نہیں آپ کے گھر والے جسامت میں کیسے ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کھاتے بکری کی طرح اور سوکھتے ہیں لکڑی کی طرح۔ بہر حال آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت ڈالیں۔ مسجد میں جا کر باجماعت نماز فجر ادا کیجیے اور پھر آدھا گھنٹہ صبح کی سیر کیجیے۔ ۲/۲ اخروٹ اور ۵/۵ بادام کھائیے۔ پھر جو بھی ناشتا کرتے ہیں وہ کر لیجیے۔ دن میں ۳/۳ کیلوں کا ملک شیک ضرور پیئیں۔ آپ نے ایک ماہ روزانہ یہ معمول جاری رکھنا ہے۔ صحت کے لیے کیلا بہت مفید ہے۔ اب سردی کا موسم آرہا ہے۔ بخنی ہوئی شکر قندی بھی جسم کو موٹا کرتی ہے۔ آپ کے چہرے پر رونق آجائے گی۔ رنگ بھی صحیح ہو جائے گا۔ اس عمر میں زیادہ گرم چیزیں نہیں کھانی چاہئیں اور نہ ہی رات کوئی وی پر فضول پروگرام دیکھنے چاہئیں۔

دل کی دھڑکن

س: ماہرہ کمپیوٹر سینٹر راجن پور سے پوچھتی ہیں۔ میرے دل کی دھڑکن ہر وقت تیز رہتی ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور نماز پڑھتے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ رات کی نیند بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سکول میں پڑھانی ہوں۔ آپ اس بارے میں کچھ مشورہ دیں گی۔

ج: آپ کا طویل خط میرے سامنے ہے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ دل کی تیز دھڑکن کا ہے۔ پچھلے دنوں میرے سامنے تین چار خواتین کے تھائی رائیڈ غدد کا کردگی کی کمی اور زیادتی کے مسائل آئے۔ یہ غدد گٹے میں زرخرے کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ جسم کے تمام خلیوں کو توانائی پہنچانے کے عمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں عموماً خواتین اس بیماری کا شکار ہوتی ہیں جبکہ ایک جائزے کے مطابق دنیا کی ۱۵ فیصد آبادی اس مرض میں مبتلا ہے۔ اس کی کارکردگی بڑھ جائے یا کم ہو جائے دونوں صورتوں میں صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ خون کا ٹیسٹ کرانے سے پتا چل جاتا ہے۔ آپ پہلی فرصت میں کسی اچھے ڈاکٹر سے دوائیں۔

کولیسٹرول

س: رحمان علی پوچھتے ہیں۔ کولیسٹرول کم رکھنے کے لیے کوئی سادہ اور اچھا سا مشورہ دیں تاکہ میری طبیعت جلد بہتر ہو جائے اور میں چٹ پٹے کھانے دوبارہ کھا سکوں۔

ج: زندگی ہے تو کھانے کا بھی مزہ ہے۔ آپ کولیسٹرول کے مریض ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ سادہ اور متوازن غذا کو معمول بنالیں۔ بازار کے تلے گروے، کپورے، بھیجا، سری پائے اور نہاری کھانا چھوڑ دیں۔ ان میں بہت کولیسٹرول ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں سلاواور کچی سبزیاں ضرور شامل کریں۔ گوشت کم سے کم کھائیں۔ خصوصاً بڑا گوشت، دیسی گھی، مکھن، کریم والا دودھ نہ لیں۔ اسی طرح اگر آپ کو انڈے پسند ہیں تو صرف سفیدی استعمال کریں۔ بیکری کی چیزیں کیک، پیسٹری، بسکٹ، برگر، شوارمانہ کھائیں۔ گاجر، موٹی وغیرہ آپ کے لیے مفید ہیں۔ اسی طرح آپ کو لڈ ڈرنک، کافی اور بازاری جوس نہ لیں۔ پرہیز سے آپ بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔

نکسیر

س: مجھے نکسیر کا مرض ہے۔ بعض مرتبہ ناک سے بہت خون نکلتا ہے۔ آپ اس بارے میں کوئی مشورہ دے سکیں گی کیونکہ اس وجہ سے میں اب بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ (عمیر)

ج: نکسیر سے واقعی خوف آتا ہے۔ کسی نے ایک ٹوٹکا بتایا کہ مٹی کے گھڑے میں رکھا پانی لے کر اس پانی کو ناک میں

ڈالیں۔ عام طور پر اسے پانی کی نسوار بھی کہا جاتا ہے۔ مٹی کے لوٹے میں پانی لے کر روزانہ ۷/۷ دن تک یہ عمل کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ پھر زندگی میں کبھی نکسیر نہیں پھوٹی۔ بے شمار لوگوں کو یہ ٹوٹکا بتایا اور سب اللہ کے حکم سے شفا یاب ہو گئے۔ آپ بھی آزمائیے۔ اسی طرح ناریل کا ایک ٹکڑا ۲/۲ انگلیوں کے برابر لے کر رات کو مٹی کے پیالے میں بھگو کر صبح کھایا جاتا ہے۔ یہ پانی بھی پی لیتے ہیں۔ ایک ہفتہ تک ناریل کھانے سے نکسیر نہیں آئے گی۔ گرم چیزوں سے پرہیز کریں۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔

باتھو کا ساگ

س: سرسوں کے ساگ کے ساتھ باتھو ملتا ہے۔ اس کی جڑیں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ ہے یا صرف گھاس پھوس ہے؟ (شاہین)

ج: اللہ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی فائدہ رکھا ہے حتیٰ کہ گھاس پھوس میں بھی۔ مختلف قسم کی گھاس میں بھی اثرات ہیں اور باتھو جسے جھو بھی کہتے ہیں اس کے بغیر ساگ اچھا نہیں پکتا۔ اس میں باتھو کی وجہ سے خاص ذائقہ آ جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کھانسی بہت پرانی ہو، سینہ میں بلغم جم گیا ہو اور کسی طرح نکلتا نہ ہو تو اسے پکا کر کھانے سے آرام آ جاتا ہے۔ ایک چمچ زیتون کا تیل لیں، سفید زیرہ، چھلا ہوا لہسن کٹا ہوا اور ثابت مرچ ڈال کر اس میں باتھو کا ساگ ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر اپنے ہی پانی میں پکنے دیں پھر بھون کر اتار لیں۔ چند روز روٹی کے ساتھ کھالیں، بہت فائدہ ہوگا۔ اسی طرح جب پیٹ میں پانی بھر جائے تو پرانے طبیب کہتے ہیں کہ گیہوں کا دلیہ پکا کر اس میں باتھو کا ساگ ڈال کر کھانے سے فرق پڑتا ہے اور کچھ نہ کھائیں۔ صبح شام یہی دلیہ اور ساگ پیٹ بھر کر کھائیں۔ ورم دور ہو جاتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو باتھو کو اچھی طرح کوندی ڈنڈے سے کوٹ کر پانی ملا کر مختلف عرقیات اور دواؤں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ اسے گھاس پھوس نہ جلیے بڑے کام کی اور صحت بخش غذا ہے۔ اسی طرح باتھو کے پراٹھے بہت لذیذ بنتے ہیں۔ نمک، مرچ، لہسن، سفید زیرہ، ادراک اور ہری مرچ کوٹ کر باتھو کا ساگ باریک کاٹ کر ہلکی آنچ پر بھون لیتے ہیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آٹے میں گوندھ کر تندور میں پراٹھے بنائیں یا گھر میں خود بنا کر کھائیں تو آپ کو بہت اچھے لگیں گے۔ اسی طرح میتھی کے پراٹھے بنتے ہیں۔ میتھی کے پتے صاف کر کے کاٹ کر نمک مرچ ملا کر آٹے میں ملا کر روٹی یا پراٹھا بناتے ہیں۔ اس طرح کی چیزیں کھانی چاہئیں، ان سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور صحت بھی بہتر رہتی ہے۔ صرف گوشت کھانے سے صحت نہیں بنتی اور وہ بھی برا کر مرغی کا۔ جس کے کھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سگریٹ پیتی ہوں

س: کالج میں مذاق مذاق میں سگریٹ پینے لگی اور پھر ایسی عادت پڑی کہ دن میں دو تین بار چپکے سے سگریٹ پینے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ شادی ہوئی تو میاں بھی خوب سگریٹ پیتے تھے۔ اب ان کے ساتھ میں بھی پینے لگی۔ اب میں اُمید سے ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ سگریٹ چھوڑ دو بچے پر برا اثر پڑے گا۔ اب مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ ایسا مشورہ دیں جس سے سگریٹ بھی نہ چھوڑنی پڑے اور بچے پر بھی کوئی اثر نہ پڑے۔ مہربانی ہوگی۔ (ش)

ج: بی بی!..... ایسا کوئی ٹوٹکا نہیں جس سے آپ کا بچہ سگریٹ نوشی کے اثرات سے محفوظ رہے۔ سگریٹ نوش ماؤں کو چاہیے وہ اپنے بچے کو تحفظ مہیا کریں۔ بچے کا سر چھوٹا رہ جاتا ہے بعض اوقات بچہ پہلے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ فوت بھی ہو جاتا ہے۔ کئی دوسرے امراض لگ جاتے ہیں۔ آپ کی ڈاکٹر ٹھیک کہتی ہیں کہ حاملہ خواتین کو سگریٹ چھوڑ دینی چاہیے۔

ماہِ رواں کی شخصیات

ماہِ رواں سے ایک نئے سلسلے کا بھی آغاز کر رہے ہیں۔ بہت محنت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا
محمد خلیل چودھری (دیند)

ماہِ دسمبر میں پیدا ہونے والی اہم شخصیات

- ۱۹۲۷ء دسمبر ۱۲ء سلیم احمد (اردو شاعر ادیب نقاد)
۱۹۲۸ء دسمبر ۱۲ء سرفراز نواز (کرکٹر)
۱۹۱۲ء دسمبر ۱۲ء یوسف ظفر (شاعر)
۱۸۲۵ء دسمبر ۲ء شہرت بخاری
۱۷۵۳ء دسمبر ۳ء سر رولینڈ ہل (ڈاک ٹکٹ کے موجد)
۱۸۸۴ء دسمبر ۳ء راجندر پرشاد (بھارت کے پہلے صدر)
۱۹۰۸ء دسمبر ۴ء غازی علم الدین شہید
۱۹۲۸ء دسمبر ۴ء ڈاکٹر انور سدید (ممتاز ادیب نقاد و شاعر)
۱۸۹۸ء دسمبر ۵ء جوش ملیح آبادی (شاعر)
۱۹۰۵ء دسمبر ۵ء شیخ عبداللہ (کشمیری رہنما)
۱۹۱۸ء دسمبر ۵ء جگن ناتھ آزاد (سیاسی رہنما)
۱۸۳۶ء دسمبر ۶ء ڈپٹی نذیر احمد (اردو کے ناول نگار)
۱۹۳۰ء دسمبر ۶ء ایس ایم ظفر (ماہر قانون)
۱۷۶۱ء دسمبر ۷ء مادام تساؤ (موی مجسموں کے عجائب گھر کی بانی)
۱۹۳۲ء دسمبر ۷ء ڈاکٹر تنویر عباسی
۱۹۲۵ء دسمبر ۸ء ناصر کاظمی (عظیم شاعر)
۱۸۷۵ء دسمبر ۸ء سرتیج بہادر سپرو (بھارت کے سیاسی لیڈر)
۱۸۳۷ء دسمبر ۹ء نواب محسن الملک (آزادی کے رہنما)
- ۹ دسمبر ۱۶۰۸ء جان ملٹن (انگریز شاعر)
۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء مولانا محمد علی جوہر (کامریڈ اور ہمدرد کے بانی)
۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ء پریشان خٹک (ماہر تعلیم)
۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء جہانگیر خان (اسکوائش کے عظیم کھلاڑی)
۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء دلپ کمار (بھارتی فلمی اداکار)
۱۱ دسمبر ۱۹۶۸ء محمد موسیٰ خان شنواری (پشتو ادیب)
۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (شاعر، ادیب، معلم)
۱۲ دسمبر ۱۹۲۸ء جسٹس افتخار محمد چودھری (چیف جسٹس پاکستان)
۱۳ دسمبر ۱۹۲۶ء پرنس کریم آغا خان (اسماعیلی امام)
۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء اسد ملتان (شاعر، گلوکار)
۱۴ دسمبر ۱۸۹۵ء جارج ششم (برطانیہ کا بادشاہ)
۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء اوپندر ناتھ اشک (ادیب)
۱۴ دسمبر ۱۹۳۵ء جون ایلینا (شاعر)
۱۵ دسمبر ۱۹۳۰ء اقبال فرید (ممتاز شاعر اور براڈ کاسٹر)
۱۶ دسمبر ۱۵۶۳ء حضرت باقی باللہ (سلسلہ نقشبندیہ کے بانی)
۱۶ دسمبر ۱۷۷۰ء بیٹھوون (ممتاز موسیقار)
۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء پیٹر اسنیل (مشہور ایتھلیٹ نیوزی لینڈ)
۱۸ دسمبر ۱۸۹۲ء سید عطا اللہ شاہ بخاری (امیر شریعت)



نواب محسن الملک مولانا محمد علی جوہر سلیم احمد ڈپٹی نذیر احمد جون ایلینا جان ملٹن

۱۸ دسمبر ۱۸۵۴ء لین پول

۱۹ دسمبر ۱۹۰۶ء بریٹن (سابق روسی صدر)

۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء مشفق خواجہ (ممتاز ادیب)

۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء باقی صدیقی (شاعر)

۲۰ دسمبر ۱۹۱۱ء قاری حکیم احمد پبلی بھیتی

۲۱ دسمبر ۱۸۷۹ء اسالین (روسی صدر)

۲۱ دسمبر ۱۹۲۳ء انتظار حسین (ممتاز افسانہ نگار)

۲۲ دسمبر ۱۸۹۶ء ڈاکٹر دین محمد تاثیر (ادیب، سیاسی شخصیت)

۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء ڈاکٹر خلیق انجم

۲۳ دسمبر ۱۸۹۲ء نور الامین (پاکستانی پہلے نائب صدر)

۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء مظفر وارثی (شاعر)

۲۴ دسمبر ۱۱۷۷ء چنگیز خان منگول (جابر حکمران)

۲۴ دسمبر ۱۹۲۳ء محمد رفیع (گلوکار)

۲۵ دسمبر ۱۸۷۵ء قائد اعظم محمد علی جناح (بانی پاکستان)

۲۵ دسمبر ۱۶۴۲ء نیوٹن (ممتاز سائنس دان)

۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء انور السادات (مصر کے سابق صدر سیاستدان فوجی افسر)

۲۵ دسمبر ۱۹۵۰ء معین اختر (ٹی وی فنکار)

۲۶ دسمبر ۱۸۹۳ء ماورے تنگ (چینی رہنما)

۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء مولوی نور الحسن کاکوری (نور اللغات کے مولف)

۲۷ دسمبر ۱۵۷۱ء جوہانس کپلر (جرمن ریاضی دان/ماہر فلکیات)

۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء مرزا غالب (شاعر)

۲۷ دسمبر ۱۸۷۸ء خواجہ حسن نظامی (ادیب)

۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء انتخاب عالم (کرکٹر)

۲۹ دسمبر ۱۹۳۷ء مامون عبدالقیوم (مالدیپ کے سابق صدر)

۲۹ دسمبر ۱۹۷۶ء ثقلین مشتاق (پاکستانی کرکٹر)



شیریں جناح پطرس بخاری نور الامین

۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء رڈ یارڈ کپلنگ (برطانوی ادیب)

۳۰ دسمبر ۱۹۴۲ء ڈاکٹر صفدر محمود (ممتاز ادیب - محقق)

۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کرٹل غلام سرور (ادیب)

۳۱ دسمبر ۱۸۳۰ء اسماعیل پاشا (خدیو مصر)

ماہِ دسمبر میں وفات پانے والی شخصیات

یکم دسمبر ۱۹۸۰ء چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان)

یکم دسمبر ۱۹۹۳ء میاں محمد شفیع (م۔ش۔)، (ممتاز صحافی)

۲ دسمبر ۱۹۸۱ء شیریں جناح (قائد اعظم کی بہن)

۲ دسمبر ۱۹۸۶ء ننھا (اداکار)

۳ دسمبر ۱۹۸۴ء استاد دامن (پنجابی شاعر)

۳ دسمبر ۱۹۸۹ء علامہ صفدر حسین نجفی (عالم دین)

۴ دسمبر ۱۹۹۰ء علامہ حسین بخش جاڑا (ممتاز شیعہ عالم دین)

۴ دسمبر ۱۹۹۴ء مولانا صلاح الدین شہید (تکبیر کے مدیر)

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء احمد شاہ پطرس بخاری (مزاح نگار مصنف، اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب)

۵ دسمبر ۱۹۶۳ء حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان)

۵ دسمبر ۱۹۸۲ء روشن آرا بیگم (ملکہ موسیقی)

۶ دسمبر ۱۹۷۱ء میجر شبیر شریف شہید (نشان حیدر)

۶ دسمبر ۲۰۰۰ء عزیز میاں (معروف قوال)

۷ دسمبر ۱۹۶۸ء مولوی محمد یوسف (میر واعظ)

۷ دسمبر ۱۷۸۲ء حیدر علی (میسور کا حکمران)

۸ دسمبر ۱۹۷۴ء علامہ ظفر احمد عثمانی (تحریک پاکستان کے رہنما)

۸ دسمبر ۱۹۷۵ء مشیر کاظمی (شاعر، نغمہ نگار)

۹ دسمبر ۱۹۷۰ء ملک فیروز خان نون (سابق وزیر اعظم پاکستان)



خالجہ حسن نظامی دین محمد تاثیر شالین



مطالعہ کی میز پر

نوید اسلام صدیقی

دیباچہ

ڈاکٹر محمود الرحمن لکھتے ہیں: سنہری بنگال کی رنگینی و رعنائی اپنی مثال آپ ہے، یہ زرخیز خطہ جہاں ہمیشہ سے سمندری طوفانوں کی آماجگاہ بنا رہا وہاں اس دھرتی نے ہزاروں سیاسی طوفانوں کو بھی جنم دیا اور تیز طرار بنگالیوں کی زندگی میں ہلچل مچا کر رکھ دی۔ ایسا ہی ایک طوفان بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں برپا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں انسانوں کی بحیثیت اپنی آغوش میں لے کر چلتا بنا۔ چین کے زوال کے بعد یہ اسلام کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

ایک سچا مسلمان ”ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست“ پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہمیشہ وطنیت سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے۔ تاریخ عالم میں بہت سے ممالک کے ساتھ عبرتناک شکست کے حوادث پیش آئے اور ان کے علاقے دھرتی کے سینہ پر اُسی طرح موجود رہے لیکن پاکستان کا معاملہ ان سے مختلف تھا۔ پاکستان کسی خطہ زمین کا نام نہیں، ایک مقصد اور نظریے کا نام تھا۔ پاکستان ایک امانت کا نام تھا، جسے ہم نے خدائے لم یزل سے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اس میں خدا کا قانون



مشرقی

پاکستان کیسے بنگلہ دیش بنا، اندرا گاندھی نے کیوں کہا کہ ہم نے ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا۔ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم آج آپ کے سامنے ڈاکٹر محمود الرحمن کی کتاب ’سونار بنگلہ‘ (سنہری بنگال)، ایک سچی کہانی پیش کر رہے ہیں، اس کہانی کا ہیرو ابوالکلام ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔

تعارف کتاب ’سونار بنگلہ‘

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ظفر جمال بلوچ رقم طراز ہیں ”اس کتاب میں محض ان مجاہدوں کے کارناموں ہی کا تذکرہ نہیں ہے، جنہوں نے اسلام کی سر بلندی کے لیے پاک فوج کے ساتھ مشرق میں تعاون کیا، بلکہ ایک حد تک اُس دور کی سیاسی تاریخ کا تذکرہ بھی ملے گا، جس میں جہاں آپ کو حب الوطنی کے پیکر چلتے پھرتے نظر آئیں گے، وہیں راہبروں اور راہنماؤں کے روپ میں میر جعفر و صادق بھی ملیں گے، جنہیں پہچاننا اہل نظر کے لیے مشکل نہ ہوگا۔“

- ۲۰ دسمبر ۱۹۹۰ء مولانا ظفر احمد انصاری (عالم دین، رہنما تحریک پاکستان)
- ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء حفیظ جالندھری (قومی ترانے کے خالق)
- ۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (دینی رہنما، عظیم صوفی)
- ۲۲ دسمبر ۱۸۸۰ء جارج ایلینٹ (انگریز ناول نگار)
- ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء ساقی (اداکار)
- ۲۳ دسمبر ۲۰۰۰ء ملکہ ترنم نور جہاں (گلوکارہ)
- ۲۳ دسمبر ۱۹۳۷ء ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (ماہر تعلیم، ریاضی دان)
- ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء عبدالعلیم شرر (ممتاز ادیب)
- ۲۳ دسمبر ۱۵۲۳ء واسکو ڈے گاما (پرتگالی مہم جو)
- ۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء پروین شاکر (ممتاز شاعرہ)
- ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء مسعود کھدر پوش (معروف دانش ور)
- ۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء باباجی اسے چشتی (مشہور موسیقار)
- ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء ظہیر الدین بابر (مغل حکمران)
- ۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء ہیری ایس ٹرومین (سابق امریکی صدر)
- ۲۶ دسمبر سردار سکندر حیات (سیاستدان)
- ۲۷ دسمبر ۱۹۸۸ء ظہور عالم شہید (ممتاز صحافی)
- ۲۷ دسمبر ۱۹۷۸ء بو بدین (الجزائر کے سابق صدر)
- ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء حکیم اجمل خان (مسلم لیگی رہنما، عظیم ماہر طب)
- ۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء میاں محمد حسین نقش بندی (عالم دین، پنجابی شاعر)
- ۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء شیر محمد اختر (نامور صحافی و ادیب)
- ۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ء محمد ادریس (مشہور صحافی و براڈ کاسٹر)
- ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء انور بہزاد (ممتاز نیوز ریڈر)
- ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء مولانا الطاف حسین حالی (مصنف اور شاعر)
- ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء مفتی کفایت اللہ (عالم دین)

- ۹ دسمبر ۱۹۹۰ء نرالا (فلمی اداکار)
- ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سوار محمد حسین شہید (نشان حیدر)
- ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء الفریڈ نوبل (نوبل انعام کا بانی)
- ۱۱ دسمبر ۲۰۰۰ء بیگم شائستہ اکرام اللہ (تحریک پاکستان کی رہنما)
- ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء باری علیگ (اردو کے ممتاز مصنف نقاد)
- ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء شیخ عطاء محمد (علامہ اقبال کے برادر بزرگ)
- ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء ظہیر کاشمیری (شاعر)
- ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء میجر محمد اکرم شہید (نشان حیدر)
- ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء علامہ شبیر احمد عثمانی (تحریک پاکستان کے رہنما)
- ۱۳ دسمبر ۱۹۸۷ء ڈاکٹر عابد حسین (ممتاز دانشور)
- ۱۴ دسمبر ۱۹۹۹ء جارج واشنگٹن (امریکی صدر)
- ۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ء اے ایم مالک (سابق گورنر مشرقی پاکستان)
- ۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء والٹ ڈزنی (ڈزنی لینڈ کا خالق، اداکار، فلم ڈائریکٹر)
- ۱۵ دسمبر ۱۹۷۲ء عابد حسین اختر مراد آبادی (اردو کے شاعر)
- ۱۵ دسمبر ۱۹۸۶ء ارقام چغتائی (معروف صحافی اور ادیب)
- ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء مولانا سید محمد داؤد غزنوی (عالم دین)
- ۱۶ دسمبر ۱۹۸۱ء حکیم آفتاب احمد قرشی
- ۱۷ دسمبر ۱۹۷۳ء مولانا جلال الدین رومی (مثنوی معنوی کے خالق)
- ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء فضل احمد کریم فضلی (معروف شاعر، فلم ساز، ہدایتکار)
- ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء لانس نائیک محمد محفوظ شہید (نشان حیدر)
- ۱۸ دسمبر ۱۱۱۱ء امام غزالی (عظیم مسلمان فقیہ)
- ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء علامہ رشید ترابی (ممتاز شیعہ عالم دین)
- ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی (ممتاز ادیب، مورخ)
- ۱۹ دسمبر ۱۸۵۷ء احمد خان کھرل (مجاہد جنگ آزادی)
- ۲۰ دسمبر ۱۹۸۱ء جسٹس جمود الرحمن (سابق چیف جسٹس)



الفریڈ نوبل



جارج ایلینٹ



نور جہاں



حکیم اجمل خان



شیخ عطاء محمد



مولانا جلال الدین

زندگی کی سب سے قیمتی کتاب
اچھی کتاب
زیادہ کچھ اور نہیں

آئیے..... کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریں

کتابوں کی کہکشاں

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا

نویسہ اسلام آباد

کتابوں کی کہکشاں اس مرتبہ سجائی گئی ہے کچھ دینی مذہبی کتابوں سے، نئی نسل کے لیے زندگی میں 'کامیابی' کے موضوع پر ایک اہم کتاب سے، آپ کو گھر بیٹھے امریکا کی سیر کرائیں گے اور ۲۰ کتب شاعری کی بھی ہیں، ایک ذرا 'مختلف' ہے اور دوسری 'گدگدی' کرنے کے لیے ہے

عہد نامہ جدید، دونوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اس پوری انجیل سے انہوں نے یہودیوں کے مزاج، کردار، تباہی اور

یوم الغضب

یہ کتاب "The Day of Wrath" کا اردو ترجمہ ہے، یہ عظیم تصنیف بلاذ عرب کی ایک علمی اور معروف شخصیت کی ہے جس کا اسم گرامی عبدالرحمن الحوالی ہے۔ آپ جرأت سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں اور آپ نے حق گوئی کی پاداش میں بے پناہ صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ آپ امریکہ اور یہودیوں کی سازشوں سے عالم اسلام کو آگاہ کر رہے ہیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس خوفناک تباہی سے محفوظ رہ سکیں۔

اس کتاب میں مصنف نے خود یہودیوں کی تمام مذہبی کتابوں سے وہ مواد نکال کر اکٹھا کر دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان پر پھٹکار برسائی اور مستقبل میں انہیں ایک بڑی ہولناک سزا کا سامنا کرنے کی پیشین گوئی کی ہے۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حوالی نے یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں، عہد نامہ قدیم اور

حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ مکتی باہنی اور عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر رکھا تھا۔ اپریل کے آغاز میں فوج اُس علاقے میں آگئی، جب اسے اس قتل عام کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے بھی ۸۰ افراد کو بغیر کسی قسم کا عذر سنے گولی مار دی۔ پاکستان کے بعض حامی بھی مارے گئے۔ ۲۳ مئی ۱۹۷۱ء کو "البدز" وجود میں آئی اس کے ممبر البدر کیڈٹ کہلاتے تھے۔ "البدز" کا نام سننے ہی دشمن پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا۔ پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں سمٹنے لگیں، فوج کے جانی تحفظ کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ ۱۶ دسمبر کی صبح تک کچھ بھارتی فوج ڈھاکہ کے گرد و نواح میں پہنچ چکی تھی اور آخر ملک کا آدھا حصہ جدا ہو گیا۔ ابوالکلام نے ۱۹ ماہ کا عرصہ سنٹرل جیل میں گزارا۔ آخر نومبر ۷۳ء میں ریڈ کراس کے نمائندوں نے پاکستان جانے والوں کی فہرست میں اس کا نام بھی درج کر لیا۔ ۲۳ اپریل ۷۴ء میں ان کی روانگی قرار پائی۔

ڈھاکہ کی پیاری سرزمین الوداع

ابوالکلام سب سے الگ تھلگ گہری سوچوں میں گم تھا۔ ابوالکلام مضطرب ہو گیا اور بار بار پہلو بدلنے لگا، سنہرے بنگال کی یادیں اس کے ذہن کے درپچوں سے جھانک رہی تھیں۔ وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں، وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا: "میں ضرور واپس آؤں گا..... اپنی قوم کی آزادی کے لیے..... اسلام کی سر بلندی کے لیے..... اے سونار بنگلہ! اگر خدا نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا..... اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے....." طیارہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑنے لگا۔ ابوالکلام نے جلدی سے ڈھاکہ کی سرزمین پر الوداعی نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد طیارہ بنگال کی خنک فضاؤں میں بلند ہو کر گھنے بادلوں میں روپوش ہو چکا تھا۔

چلائیں گے اور اسے اسلام کا قلعہ بنا کر چھوڑیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر لڑنا عین جہاد اور اس کی آبرو پر جان دینا عین شہادت قرار پایا۔ ابھی ایک نسل بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس امانت پر ڈاکہ پڑا اور ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔ امانت کے چھن جانے کے بعد ہم نے اپنے روٹھے ہوئے ان بھائیوں کو فراموش کر ڈالا، جنہوں نے سبھی مسلم لیگ کی بنیاد رکھ کر پاکستان کی تعمیر میں اپنا خون دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جتنی مساجد، دینی درسگاہیں اور اسلام کا درد رکھنے والے افراد مشرقی بنگال میں پائے جاتے ہیں، دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ملتے۔ پاکستان کے ساتھ بھی ان کی ہمدردیاں بدستور برقرار ہیں۔

اس کتاب میں بنگلہ دیش کے بحران کے دوران قربان ہونے والے سرفروشوں کی خونچکاں داستان رقم کی گئی ہے اور اس بے رحم سیاست کی حقیقی تصویر کھینچی گئی ہے جس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر ڈالا۔ کتاب کے تمام کردار حقیقی ہیں۔ اس کے مرکزی کردار ابوالکلام پاکستان میں زندہ وسلامت موجود ہیں۔

ابوالکلام اپنے آٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ابوالکلام کے والد بدیع الزماں علاقہ کے بڑے بااثر زمیندار تھے، سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ تحریک اسلامی کے ساتھ انھیں دلی لگاؤ تھا۔ کالج گیا تو شنگھو کے چند سرگرم کارکنوں سے اس کا تعارف ہو گیا اور اس نے بھی اسی روز شنگھو کا سپورٹر فارم پر کر دیا۔ ابوالکلام نے ۲۵ مارچ ۷۱ء کو مارشل لا کے نفاذ کا اعلان سنا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ ہمیں ٹریننگ حاصل کر کے پاکستان آرمی کی مدد کرنا چاہیے۔ پاک فوج کے لیے اپنے محدود وسائل اور بے پناہ رکاوٹوں کے سبب دور دراز علاقوں میں پہنچنا مشکل تھا۔ لہذا ان سے مدد ملنے کے امکانات معدوم تھے۔ منصوبہ کے مطابق ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں سمیت مکتی باہنی کے رضا کاروں کے ساتھ عوامی لیگ سے ٹریننگ



من گھڑت فخر و مباہات وغیرہ کے معاملات میں جگہ جگہ متعلقہ اہم آیات پیش کی ہیں جن کے باعث حقیقت حال کی ایک بہت صحیح تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔

ملنے کا پتہ: توکل اکیڈمی، کاشانہ خلیل، بالمقابل کالج برائے خواتین۔ اردو بازار، کراچی

فون: 0321-8762213

قیمت: ۲۲۵ روپے

☆☆

پاکیزہ زندگی

عبدالستار عاصم نے ایک انتہائی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق صفائی نصف ایمان ہے۔ جب ایک چیز کی اتنی اہمیت ہے تو اس کے بارے میں ہر مسلمان کو مکمل علم ہونا چاہیے کہ اسلام کی منشا کیا ہے؟ اسلام ایک مسلمان سے کیا چاہتا ہے؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ صفائی کے آداب سے ناواقف ہیں اور نہ ہی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ صاحب نے اس کتاب میں تمام ضروری مسائل جمع کر دیے ہیں۔



علامہ عبدالستار عاصم

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: زیر نظر کتاب ”پاکیزہ زندگی“ کے مصنف عزیزی عبدالستار عاصم نے پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے احادیث اور جدید علوم کے مشوروں کو یکجا کر کے عظیم کام انجام دیا ہے جس کی عصر حاضر میں شدید ضرورت تھی کیونکہ بعض مسلمان پاکیزگی کو بھول کر صفائی کے چکر میں پڑ گئے ہیں لیکن اسلام اپنے ماننے والوں سے پاکیزگی کا تقاضہ کرتا ہے نہ کہ صرف صفائی کا۔ مصنف نے یہ کتاب ترتیب دے کر اسلام کے اسی پاکیزگی کے حکم کی تعمیل کروانے کی کوشش کی ہے۔

ناشر: مقبول اکیڈمی، چوک اردو بازار، سرکلر روڈ، لاہور فون نمبر: 042-37324164

☆☆

رسول اللہ ﷺ کے دو ہزار معجزات

ڈاکٹر محمد اختر نواز خان قادری کی یہ تصنیف ۱۹۷۶ء صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے دو ہزار معجزات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ معجزہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو لفظ عجز سے بنا ہے



اس کا مطلب ہے عاجز کرنا یعنی ایسا فعل جس کو عام مخلوق سمجھنے سے عاجز ہو۔ معجزہ کی تعریف علمائے اسلام نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ معجزہ ایسے عظیم الشان واقعہ یا خرق قدرت واقعہ کو کہا جاتا ہے جس کا وقوع پذیر ہونا عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا اور یہ فقط قدرت خداوندی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

ناشر: زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

فون نمبر: 051-5551519

قیمت: ۸۰۰ روپے

☆☆

کامیابی

Promod Betra کی شہرہ آفاق کتاب Management Thoughts کا یہ اردو ترجمہ احمد فرہاد نے کیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر کموں لوگ اپنی زندگیوں میں انقلاب لایچکے ہیں۔ احمد فرہاد دینا چے میں لکھتے ہیں: یہ کتاب ہر اس شخص



ترجمہ: احمد فرہاد

کے لیے ہے جس کی زندگی میں مقاصد اور کامیابی کی کوئی اہمیت ہے۔ جو لوگوں کے اس ہجوم میں خود کو منفرد اور ممتاز حیثیت میں دیکھنے کا خواہاں ہے اور جو اپنے میدان میں ایک بے مثل تاریخ رقم کرنے کا جنوں رکھتا ہے۔

کامیابی کیا ہے؟ اس کے کیا تقاضے ہیں؟ اسے کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اور اسے حاصل کرنے والے کون ہیں؟ یہ کتاب انہی باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب قاری کو تھکا کاٹ اور بوریٹ سے دو چار نہیں کرتا۔

ناشر: زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

فون: 051-5551519

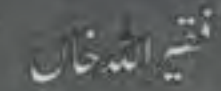
قیمت: ۳۰۰ روپے

☆☆

امریکا: جیسے میں نے دیکھا

فقیر اللہ خاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلی کالج آف کامرس، لاہور سے ایم کام کرنے کے بعد پی آئی اے کے فنانس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے، ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ کا رخت سفر باندھا۔ وہاں مجموعی طور پر ۱۰ سال مختلف شہروں میں قیام رہا۔ یوں امریکہ کے مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک گھومنے کا موقع ملا۔ خاں صاحب نے اس کتاب میں واشنگٹن ڈی سی، نیویارک، لاس اینجلس، شکاگو، ٹیکساس، سان فرانسسکو، جزائر ہوائی، فلوریڈا، الاباما اور اٹلانٹا کی دلچسپ اور معلوماتی باتوں کے علاوہ وہاں کا جغرافیہ اور تاریخ بیان کی ہے۔

کتاب اپنے دامن میں معلومات کا ایک بہت بڑا خزانہ چھپائے ہوئے ہے، یہاں کچھ مثالیں درج کرنے کو دل کرتا تھا لیکن صفحات کی کمی آڑے آرہی ہے۔ ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں مثلاً نیویارک شہر کی بات ہو رہی ہے وہاں آپ اقوام متحدہ کے بارے میں مکمل تفصیلات پائیں گے، نیویارک سے نکلنے والے اخبارات میں سب سے اہم نیویارک ٹائمز ہے اس کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ



قیمت: ۳۰۰ روپے

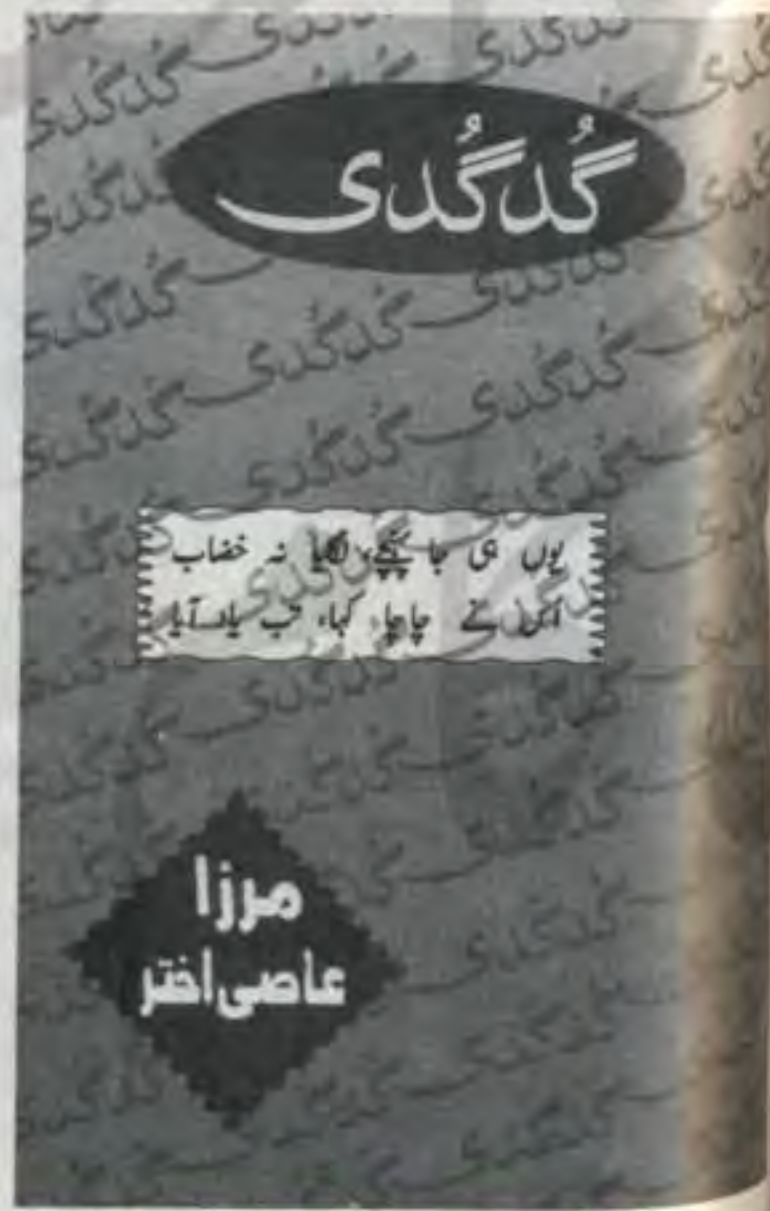
ایک غزل کے چند اشعار:

فریده خانم

مُخْتَلَف

☆☆

مرزا عاصی اختر کی کتاب 'گدگدی'، یہ مزاحیہ شاعری کی
ن کی دوسری کتاب ہے۔ امجد اسلام امجد مرزا صاحب
کے بارے میں لکھتے ہیں، ”آج کل طنز و مزاح کے حوالے
سے کی گئی شاعری مقبول تو بہت ہو رہی ہے، لیکن اس
 میدان کے نو واردان شوق میں بہت کم نام ایسے ہیں، جن
کے کلام کو معیاری کہا جاسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک نام مرزا



پروفیسر

دیکھو وہ کھوئے کھوئے سے جو سب سے الگ آتے ہیں نظر دیتے ہیں درسِ فلسفہ یہ ہیں قابلِ قدر پروفیسر کل رات سہاگ کی تھی لیکن محلے میں گئے تو چیخ اٹھے تم کون ہو کمرے میں میرے کیوں بیٹھی ہوئی ہو بن ٹھن کر ملنے کا پتا: فضلی بک، سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

قیمت: ۱۶۰ روپے

کتاب کا تعارف الطاف حسن قریشی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ ایک متوسط گھرانے کی تعلیم یافتہ اور دردمند خاتون محترمہ شاہین فردوس کی تصنیف ”صبح ضرور ہوگی“ اپنے دامن میں اصلاح معاشرہ کا ایک بیش بہا خزانہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور قرآن و حدیث کی لافانی تعلیمات سے جو کچھ اخذ کیا ہے، اسے لوگوں کی معاشرتی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں طہانیت



موضوع سخن

اسی لیے گردنیں کٹ رہی ہیں....

وصی شاہ

تک کی سب سے اہم فتح تھی۔ جس کے انعام کے طور پر اسے مزید عمر، مزید زندگی حاصل ہوئی۔ اسی سال اس نے اس موذی مرض کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہوئے اپنے نام سے ایک فاؤنڈیشن بنائی یعنی لانس آرم سٹراٹک فاؤنڈیشن۔ یہ تاریخ کے عظیم ترین سپورٹس مین لانس آرم سٹراٹک کی زندگی کی داستان کا ایک حصہ ہے۔ جو یقیناً کامیابیوں اور جدوجہد سے عبارت ہے مگر لانس آرم سٹراٹک کی زندگی کی داستان کے اگلے حصے اس سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں کینسر کو شکست دینے کے بعد لانس آرم سٹراٹک نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۵ء تک ۷ مرتبہ ٹور ڈی فرانس جو سائیکلنگ کی دنیا کا عظیم ترین ٹائٹل قرار دیا جاتا ہے کا فاتح رہا۔ اس کے علاوہ آرم سٹراٹک کی فتوحات کی ایک طویل فہرست ہے جو یقیناً ایک کالم میں نہیں سما سکتی۔ جون ۲۰۱۲ء تک اپنی ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصے بعد تک آرم سٹراٹک دنیا میں جدوجہد، کامیابی، مہارت اور محنت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

جون ۲۰۱۲ء میں (USADA) یو ایس اینٹی ڈوپنگ ایجنسی نے آرم سٹراٹک پر کھیلوں کے مقابلوں کے دوران ممنوعہ ادویات لینے کا الزام ثابت کیا۔ جس کے بعد آرم

پیار سے قریبی لوگ "باس" کے نام سے پکارا کرتے۔ وہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو امریکی ریاست ٹیکساس میں پیدا ہوا۔

وہ جب چھ سات برس کا تھا تب سے ہی اسے سائیکلنگ کا بے پناہ شوق تھا وہ اپنی سائیکل لے کر باہر گلیوں پارکوں میں نکل جاتا اور گھنٹوں تھکے بغیر اس کی پریکٹس کرتا رہتا۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو اس نے سائیکلنگ کے منعقد ہونے والے مختلف مقابلوں میں حصہ لینا اور انہیں جیتنا شروع کر دیا۔ اس کی سپیڈ، مہارت، سٹیمنا اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں حیرت انگیز ہوا کرتا۔ ۱۹۸۹ء میں وہ قومی سطح کے سائیکلنگ کے مقابلوں میں شریک ہونے لگا۔ وہ شروع سے ہی اپنے ساتھیوں میں فائز مشہور تھا اور آخری وقت تک اپنی پوری قوت صرف کر کے مقابلہ جیتنے کی کوشش کرتا۔ ۱۹۹۲ء میں وہ پروفیشنل سائیکلسٹ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ پروفیشنل کیریئر کے آغاز میں ہی ۱۹۹۶ء تک یعنی چار سال کے اندر اندر وہ ورلڈ چیمپئن شپ سمیت سائیکلنگ کے کئی بین الاقوامی مقابلے جیت چکا تھا۔

اکتوبر ۱۹۹۶ء میں جب اس کی عمر صرف ۲۵ برس تھی تو وہ اپنی سپیڈ اور مہارت کی بدولت اپنے کیریئر کے عروج پر تھا۔ اس پر یہ انکشاف ٹیم بم کی طرح پھٹا، صرف اس پر نہیں پوری دنیا میں اس کے چاہنے والے اس خبر پر حیران و پریشان سخت افسردہ ہوئے کہ ان کا محبوب سائیکلسٹ اپنے کیریئر کے عروج پر کینسر جیسی موذی بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ کینسر اس کے پیچھے والوں اور دماغ تک پھیل چکا تھا مگر اس نے ہار ماننا نہیں سیکھا تھا وہ تو بچپن ہی سے فائز تھا اور آخری سانس تک زندگی کی سائیکل کا پیڈل چلانا جانتا تھا۔ اس نے ہار ماننے سے انکار کر دیا اور بے جگری سے کینسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے مقابلے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

۶ ماہ کی صبر آزما اور تکلیف دہ جنگ کے بعد فروری ۱۹۹۷ء میں وہ کینسر کو شکست دینے میں کامیاب ہو کر زندگی کی اس ریس میں بھی سرخرو ٹھہرا۔ یہ شاید اس کی زندگی کی اب

اُسے

سلاست اور ذہنوں کو متاثر کرنے والی خوشبو پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب قرآنی آیات، احادیث اور بر محل اشعار سے آراستہ ہے اور اس میں رضائے الہی کی خوشبو اور اخلاص کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ محترمہ نے روزمرہ کے مشاہدے میں آنے والے دلچسپ واقعات بیان کر کے عامتہ الناس کو یہ احساس دلانے کی مخلصانہ کوشش کی ہے کہ قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ ان زنجیروں سے نجات دلانا چاہتے ہیں جن کے اندر ہم نے نمود و نمائش، جھوٹی آنا، حسد و رقابت اور خود غرضی کی صورت میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا اور دنیا کو ایک عذاب خانہ بنا دیا ہے۔ کتاب کا سرورق اور پرنٹنگ کوالٹی اور بہتر ہو سکتی تھی۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

ملنے کا پتا: عمران احمد 1/S, 3-A زبیدہ چوک

ملت چوک، بمن آباد، لاہور

فون: 0321-4064747



مصنف
شاجین فردوس

قلب، روحانی بالیدگی اور ذہنی سکون عام کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ اپنے اندر ایک بے پناہ تڑپ اور ایک ناختم ہونے والی لگن رکھتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں بلا کی

ترقی کی دوڑ

(حاصل گھاٹ۔ بانو قدسیہ)

انسان اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں میں اس درجہ مگن ہو گیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوس قیدی (روح) کی پروا نہیں رہی۔ کھانا پہننا، اوڑھنا بچھونا اب Priority میں مقدم ہیں۔ انسان جسم سے وابستہ ہو کر بازاروں کا رہتا جوگی بن گیا ہے۔ انڈسٹری، میڈیا، انٹرنیٹ بھاگ بھاگ انسان کو اس کی ضروریات کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اب خواہشات کو دبانا مسابقت سے پرہیز کرنا فساد سے ہاتھ اٹھانا نئی ترقی کے گناہ ہیں۔ تمام رشتے اقدار، رسم و رواج، تہذیبی فارمولے مذہبی احکامات منہ اٹھائے انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومتے پھرتے ہیں۔ نئی ترقی کے پاس وہ بلند و زر ہے جو مذہبی باڑھوں کو اکھاڑتا پچھاڑتا ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔ صرف محنت کا عزم اور کام کی اخلاقیات کے رولز کو پکڑ کر اپنا راستہ سیدھا کر لیتا ہے اور نئی سڑکوں پر ہیومن رائٹس کی کوٹار بچھا کر انسان کو جس قدر زیادہ مشینی اور وقت کا پابند بنا سکے بنا ڈالتا ہے۔ اس بلند و زر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے۔ اس کی پروا نہیں۔ اقدار، رسم و رواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

(انتخاب: عادل مشتاق۔ آزاد کشمیر)

اس طرف توجہ نہیں ہوگی تو صحت مستقل خراب رہے گی

جذباتی کھانے

کے طلسم کو کیسے توڑا جائے؟

نوشین ناز

ماہر غذائیات / نیوزیٹس
0301-4585405



اب کھانے پینے کی چیزیں بیچنے کے لیے ان کے
”جذباتی اثرات“ کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے

کمفرٹ فوڈ کسی طور صحت بخش نہیں یہ جسم میں بڑی مقدار
میں چربی بنانے کا باعث بن رہے ہیں

چپس کا مطلب ہے ایکسٹ منٹ۔
کمپلان سے مراد ہے طاقت۔

نوڈلز سے مراد ہے آسانی اور مزہ لیکن اگر زیادہ کھانا
آپ کا جذباتی مسئلہ بن جائے یعنی آپ اپنے جذبات و
احساسات کی کیفیت پر پردہ ڈالیں، انہیں ٹھنڈا کرنے یا
بھلانے کے لیے بہت زیادہ کھانے لگیں تو پھر بسیار خوری
کا ایک نہ ختم ہونے والا (Vicious circle) چل پڑتا
ہے۔ جس کے نتیجے میں آپ کا وزن بڑھنے کا باعث بنتا
ہے اور ان بیماریوں کا باعث ہوتا ہے جو جسم میں زیادہ
مقدار میں چربی پیدا ہونے سے لاحق ہوتی ہیں۔

کمفرٹ فوڈ (چپس کے والے کھانے) صحت بخش
کھانوں کی جگہ لے رہے ہیں یعنی سکون دینے والے
کھانے مثلاً آئس کریم، چپس، چاکلیٹ اور کیک وغیرہ
اگر خواتین کی صحت بخش غذاؤں کی جگہ لے لیں تو وہ جسم
میں توانائی پیدا کرنے اور بیماریوں کی روک تھام اور
ہڈیوں کو مضبوط بنانے والے ضروری غذائی اجزاء سے محروم
رہ جاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ آپ کے اندر کوئی



کھانے

سے آرام ملتا ہے۔ جب
آپ بیمار ہوتے ہیں تو
چکن سوپ کا بڑا پیالہ، کسی
جذباتی مسئلے سے دو چار
ہوتے ہیں تو آئس کریم کا ایک بڑا کپ آرام دیتا ہے۔
بچپن میں جب آپ سائیکل چلاتے ہوئے گر جاتے ہیں تو
مٹی بڑے پیار سے آپ کو کیک یا بسکٹ پیش کرتی ہیں۔
تمام افراد کے بچپن، تمام تہذیبوں اور زندگی کے ہر شعبے
میں ”کھانے سے آرام دینے کی صلاحیت“ مسلمہ تسلیم کی
جاتی ہے اور سائنسدان بھی اس کو مانتے ہیں۔
”آج کل کھانے پینے کی چیزوں کو بیچنے کے لیے ان
کے جذباتی اثرات سے بڑی مدد لی جا رہی ہے۔

چاکلیٹ کا مطلب ہے پیار۔
کوئیز کا مطلب ہے خوشی اور کینڈی بار کا مطلب
ہے لطف اندوزی۔
اس لیے آپ نے اکثر سنا ہوگا ”فن سائز کینڈی
بار“ وغیرہ وغیرہ۔

اس کی جگہ ہنسائی ہوتی اور اس کی فتوحات، تمغے اس
سے واپس چھین لیے جاتے.....؟؟
یقیناً اس کا جواب نہیں میں ہے..... کیونکہ ہم قانون اور
انصاف سے نہیں شخصیات سے محبت کرنے والی قوم ہیں اور
محبت بھی شخصیت کی خوبیوں، سچ اور حق کی بنیاد پر نہیں، چھوٹے
چھوٹے ذاتی، گروہی ادارہ جاتی مفاد کی خاطر کرتے ہیں۔ ورنہ
دنیا بھر میں کسی کی کسی بھی شعبے میں چاہے وہ سیاست ہو، فوج
ہو، عدلیہ ہو، صحافت ہو، یا اور کوئی سماجی شعبہ ہو کسی بھی شعبے میں
چاہے کتنی ہی خدمات کیوں نہ ہوں لیکن اگر وہ غلطی کرتا ہے تو
اپنے کیے کی سزا بھگلتا ہے اور کوئی ادارہ یا فرد، انفرادی یا اجتماعی
طور پر جرم ثابت ہونے والے کے حق میں نہ کوئی آواز بلند کرتا ہے
نہ احتجاج کرتا ہے نہ حمایت..... نہ مجرم کے حق میں جلوس نکالتا
ہے نہ جلسے کرتا ہے..... اسلامی فلسفہ بھی یہی ہے تب ہی تو
میرے آقا سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا.....
”خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو
اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا.....“

دنیا لائس آرم سٹراٹگ سے اس کے سارے ”تمغے“ واپس
لے سکتی ہے تو کیا ہم اپنے قومی مجرموں کو چاہے وہ سیاستدان
ہوں، نظریہ ضرورت والے جج ہوں، بیوروکریٹ ہوں، فوجی
ہوں یا صحافی یا دوسرے شعبوں کے قومی مجرمان ان سے ان
کے ”تمغے“، ”خطابات“ واپس نہیں لے سکتے.....؟؟ ان کو
واپس لینے کے لیے قانون سازی نہیں کر سکتے.....؟؟ ان کی
تصاویر ان تمام معتبر اداروں کی دیواروں سے ہٹا نہیں سکتے
جہاں آج بھی وہ ہمارا منہ چوڑا رہی ہوتی ہیں..... اگر ہم یہ نہیں
کر سکتے تو کم سے کم ان کی تصویروں کے نیچے ”قومی مجرم“ یا
”سزایافتہ“ تو لکھ ہی سکتے ہیں..... لیکن نہیں..... ہم ایسا بھی
نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے بحیثیت قوم ہمیشہ جرم ثابت
ہونے کے باوجود ہر شعبے کے ہر طرح کے مجرموں کو بچانے کی
کوشش کی..... انہیں سزا نہیں دی..... ان کا سماجی بائیکاٹ نہیں
کیا..... انہیں مطعون نہیں کیا.....

جرم پر جن کے ہاتھ کاٹنے چاہیے تھے نہیں کاٹے
اسی لیے آج ہماری گردنیں کٹ رہی ہیں۔ بھگتی بات

سٹراٹگ نہ صرف کھیلوں کی دنیا میں بلکہ پورے امریکا اور
پوری دنیا میں اپنے مداحین کی نظر میں ہیرو سے ”زیر“ ہو گیا۔
حالانکہ آرم سٹراٹگ امریکی تھا۔ امریکا کا فخر تھا مگر امریکی اینٹی
ڈونگ ایجنسی نے ہی اس کا جرم پکڑا اور اسے مجرم ثابت کیا۔
امریکا میں اس پر تمام سائیکلنگ کے مقابلوں پر لائف
ٹائم بین لگادیا گیا اور ۱۹۹۸ء کے بعد اس کے تمام جیتے گئے
ٹائٹلز یہاں تک کہ ان کی رقم انعامی بھی واپس وصول کرنے کا
اعلان کیا گیا۔ امریکی ایجنسی نے اپنے ہی ملک کے ایک ہیرو
کو ”سیریل چیٹر“ یعنی ”سیریل دغا باز“ کا خطاب دیا۔ جس
کے بعد بین الاقوامی سائیکلسٹ کی یونین نے بھی امریکی
ایجنسی کے فیصلے کی تائید کی اور ٹور ڈی فرانس کے جیتے ہوئے
سارے یعنی ساتوں کے ساتوں ٹائٹلز بھی اس سے واپس لے
لیے گئے۔ ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۱۲ء تک لائس آرم سٹراٹگ کی
کینسر فاؤنڈیشن نے ہزاروں لوگوں کو فائدہ پہنچایا تھا اور آرم
سٹراٹگ نے اس کیلئے لاکھوں ڈالرز کی فنڈ ریزنگ کی تھی مگر
لائس آرم سٹراٹگ کو اپنے ہی بنائے ہوئے ادارے کی سربراہی
سے بھی استعفا دینا پڑا کیونکہ آرم سٹراٹگ کے مجرم ثابت
ہونے کے بعد اس ادارے کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔
کیونکہ مہذب دنیا میں انسان کا اعتبار کیا تو سب کچھ گیا۔ کل کا
ہیرو، تاریخی فتوحات والا کھلاڑی کینسر فاؤنڈیشن چلانے والا
عظیم سماجی کارکن آج کا زیر ہو چکا ہے۔

ذرا غور کیجیے اگر اتنا کامیاب شخص، عظیم سپورٹس مین جو
اپنی قوم کیلئے بے شمار فتوحات حاصل کرے۔ جس کی مقدس
ہستیوں کی طرح پوجا کی جاتی ہو جس کے سماجی کاموں کی
وجہ سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو اگر وہ ہمارے
معاشرے میں پیدا ہوتا تو کیا ہمارے معاشرے، ہمارے
اداروں کی اتنی جرأت ہوتی کہ ہم اس کے کسی جرم پر یا غیر
قانونی حرکت پر اسے اس طرح ”ذلیل“ کرتے (یہ مجرم کو
ذلیل کرنا بھی ہمارے ہاں کے محاورے ہیں ورنہ مجرم کے
جرم کو سامنے لانا، حقیقت سے پردہ اٹھانا ہوتا ہے اسے ذلیل
کرنا نہیں۔ دنیا بھر میں اسے ذلالت نہیں حقیقت کا نام دیا
جاتا ہے۔) اس کے جرم کو یوں سامنے لاتے کہ دنیا بھر میں

ایسی شے ہے جسے آپ نظر انداز کر رہی ہیں۔

”جذبائی کھانا“ کب مسئلہ بنتا ہے؟ جب کھانا صحت کا متبادل یا خود کو ”بے ہوش“ کرنے والی دوا بن جاتی ہے۔ جب زیادہ کھانے کی مدد سے آپ دراصل غیر ارادی طور پر اپنی اندرونی کیفیات مثلاً غصہ، ڈپریشن، ذہنی دباؤ، تنہائی اور بوریٹ کو بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات آپ کے کھانے پینے میں اہم عوامل کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اس لیے ہمیں اپنے وزن میں کمی اور پھر اس کی برقرار رکھنے کے لیے ان جذباتی عوامل کی جانب توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے جو اس بسیار خوری کی وجہ بن رہے ہوتے ہیں۔

آئس کریم، کیک اور کینڈیز وغیرہ جیسی غذائیں کاربوہائیڈریٹس یعنی نشاستے سے بھرپور ہوتی ہیں اور ہمارے دماغ کے اچھا محسوس کرنے میں کردار ادا کرنے والے کیمیائی مادے ”سیروٹون“ کی سطح کو بلند کرتی ہیں اور ان کو کھانے سے خواتین عارضی طور پر اچھا محسوس کرتی ہیں۔ خواتین کی ماہواری کے چکر کے دوسرے نصف اور بیضے کے اخراج (Ovulation) کے بعد کاربوہائیڈریٹس کا یہ کردار بہت طاقتور ہوتا ہے۔ اس موقع پر پروجیسٹرون کی سطح بہت بلند ہوتی ہے جس کے نتیجے میں بلڈ شوگر میں کمی اور کھانے کی شدید طلب ہوتی ہے۔

طلسم کو توڑیں، اپنی ”جذبائی خوراک“

کی ڈائری بنائیں

سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان حالات اور عوامل سے نمٹیں جو آپ کو زیادہ کھانے پینے اور بسیار خوری کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس طلسم کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کھانے کے بجائے براہ راست اپنی جذباتی ضروریات کو پورا کریں۔

اس اہم مسئلے کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو صحت کی

مستقل خرابی کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ آپ کے دوست احباب اور پورا ماحول اس حوالے سے معاون نہیں بنتا بلکہ مستقل آزمائش کی وجہ بنتا ہے۔ مگنی، شادی کی خوشی ہو تو مٹھائی، سالگرہ کی آمد ہو تو کیک، ترقی و تبادلوں ہو تو شاندار ڈنر یا لنچ، گیٹ ٹو گیدر ہو تو ہائی ٹی حد تو یہ ہے کہ موت کا بھی موقع ہو تو مرغن کھانے مطلوب و مقصود ہوتے ہیں۔ یہ سارے مواقع پر کھانے پینے کی ان گنت نعمتوں کا سامنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی نہ کھائیں تو میزبان کی ناراضی کا الگ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مروت سے مجبور ہو کر شام کو اپنا وزن بڑھانے کا پورا اہتمام و انتظام کیے آپ واپس گھر آ کر سو جاتے ہیں۔ اب وزن نہ بڑھے اور صحت خراب نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہوتا یہ پتھر پہ لکیر والا محاورہ اس موقع کے لیے تھا تو نہیں مگر اب آپ نے خود ہی خرابی صحت کے حوالے سے پتھر پر لکیر کو نشانی بنالیا۔

اب آتے ہیں اس ماہ کے خطوط،

سوالات اور جوابات کی طرف

س: میری عمر ۲۱ سال ہے میرا وزن ۵۰ کلو قد ۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے؟

(فیضان احمد - کراچی)

ج: آپ کو ضرورت ہے ۱۰ کلو مزید بڑھانے کی۔ اپنے آئیڈیل وزن کو پانے کے لیے آپ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ اپنی زندگی میں ورزش کو شامل کریں۔ Junk Food اور Fizzy drinks بند کر دیں۔ یہ جسم میں سے ٹیکشیم کم کرنے کا باعث بنتے اور ہڈیوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔ ایسے کھانے کا استعمال کریں جو آئرن اور ٹیکشیم میں زیادہ ہوں۔ Weight lifting کی ورزشیں آپ کے لیے بہت اچھی ہیں۔ آپ Lean protein کا استعمال رکھیں جو مسلز بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اپنے دن کا آغاز Heavy Breakfast سے کریں اور کم از کم ۳ سے ۴ اور کھانے ضرور کھائیں اور پانی کا استعمال کھلا رکھیں۔

س: میری عمر ۱۴ سال ہے اور وزن ۶۰ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ۳ انچ ہے۔ میں قد کیسے بڑھا سکتی ہوں اور وزن کیسے کم کروں؟ (شازیہ رابعہ)

ج: آپ کو اپنا وزن ۱۰ کلو کم کرنا پڑے گا۔ اپنا آئیڈیل وزن حاصل کرنے کے لیے آپ کی عمر میں وزن عموماً بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ کھانے کی بری عادات اور Harmonal Imbalance ہوتے ہیں۔ آپ اپنے Harmonal test بھی کرا لیں۔ بازاری کھانے بند کر دیں، گھر کا بنا کھانا کھائیں۔ بہت زیادہ چاکلیٹ، کولڈ ڈرنک، پیزا، برگر اور فرائیڈ آئٹم سوائے وزن بڑھانے کے کچھ نہیں کرتے۔ ہائیٹ بڑھانے کے لیے آپ گیمز کریں Hanging exercise کریں۔

تیرا کی بہت بہترین ورزش ہے قد کے لیے۔ اس کے علاوہ ۳ گلاس دودھ بنا چکنائی کے استعمال کریں۔

س: میری عمر ۲۵ سال ہے میرا وزن ۹۰ کلو ہے۔ قد ۵ فٹ ۳ انچ ہے۔ میں Hypothyroidism کی مریضہ ہوں اور مجھے پیریڈز بھی بند ہو گئے ہیں۔ میرے لیے Diet plan تجویز کر دیں۔ (طیبہ جواد - کھاریاں)

ج: آپ کا وزن کم کرنے کا ٹارگٹ ۲۰ کلو ہے۔ آپ وزن Gain کریں گی جیسے کہ آپ Menopause پر پہنچ چکی ہیں۔ آپ ۷۰ کلو پر پہنچنے کا ٹارگٹ بنائیں۔ آپ اپنی غذا پر کنٹرول کریں ساتھ ساتھ ورزش کو بھی اپنائیں۔ اچھی صحت کے لیے کچھ Permanent تبدیلیاں لائیں۔ اس عمر میں Metabolic rate کم ہو جاتی ہے۔ High intensity کی ورزش آپ کی مدد کر سکتی ہے۔

Sit up ۲۰ کے سیٹ تین دفعہ کریں۔ صبح، دوپہر، شام ۲۵، ۲۵ منٹ کی واک اور اس کے علاوہ Breathing exercise بھی بہت مدد کریں گی۔ سبز اور جگر چائے دونوں استعمال کریں۔ ۳ سے ۵ بادام کا استعمال Snack ٹائم پر ضرور رکھا کریں۔ اپنا وٹامن ڈی اور ٹیکشیم کا لیول چیک کرائیں۔ کمی کی صورت میں اپنے

فزیشن سے فوراً رابطہ کریں۔ آپ کی غذا میں ٹیکشیم کا استعمال کم از کم ۴ سے ۶ مرتبہ ضرور ہو۔ اپنے آپ کو Hydrate رکھیں، پانی کا استعمال کریں ہر کھانے سے پہلے ایک کپ ضرور استعمال کریں۔

س: میری عمر ۱۹ سال ہے میرا وزن ۶۷ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ پلیز باجی! مجھے وزن کم کرنے کے لیے Diet Plan دیں ورنہ میں ڈپریشن سے مر جاؤں گی۔

ج: چندا آپ کو کم از کم ۱۵ کلو وزن کم کرنا ہے۔ آپ کی عمر کم ہے آپ بہت آسانی اور جلدی وزن کم کر سکتی ہیں۔ آپ ورزش اور متوازن غذا سے جلد رزلٹ لے سکتی ہیں۔ آپ ریگولر برسک واک شروع کریں۔ آپ شوگر کے بجائے شہد کا استعمال کریں۔ فرائڈ آئٹم بند کریں۔

آپ اپنے مین میل (meal) میں Carbohydrate کے بجائے سلاڈ کا استعمال کریں۔ جب بھوک زیادہ لگے تو سنیک ٹائم میں دہی کا استعمال کریں۔

آپ Clear سوپ لنچ اور ڈنر میں لے سکتی ہیں۔ ایک گلاس دودھ اور ۳ بادام ناشتے میں لے لیں۔ گوشت ہمیشہ سفید استعمال کریں جو کہ steam یا گرل ہو۔

س: میری عمر ۱۵ سال اور وزن ۴۸ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ایک انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے۔ (مازہ کلثوم - میانوالی)

ج: آپ کا موجودہ وزن آپ کی عمر اور قد کے لحاظ سے بالکل Perfect ہے۔ آپ اپنے وزن کو برقرار رکھیں۔ اس کے لیے آپ آئرن اور وٹامن سی پر مشتمل غذا کا استعمال زیادہ رکھیں۔ آپ روز اور لنچ جوس کا استعمال کر سکتی ہیں ساتھ میں وٹامن سی کا کوئی Supplement لیں یہ وزن کم کرے گا اور قبض بھی توڑے گا۔ اس کے علاوہ چہرے کا گلو بڑے گا۔ وٹامن سی آپ کے Immune سسٹم کو بہتر کرتا اور کینسر اور دل کے امراض سے بچاتا ہے۔

س: میری عمر ۱۴ سال ہے اور وزن ۶۸ کلو ہے۔ قد ۵ فٹ ایک انچ ہے۔ مجھے وزن کم کرنا ہے میری مدد کریں۔ (سدرۃ الحسنی - آزاد کشمیر)

حمد حصال

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سب کا کام



ادبی کانفرنس کا احوال اور رضیہ بٹ

”خوف کا تحفہ واپس کرنے کا خوف“ کہ یہ رب کے پسندیدہ بندوں کی صفت ہوتی ہے کہ محبت بھی بس ایسی کی اور خوف بھی۔ بہت خوب عنوان کا حق ادا کر لیا اللہ نے آپ سے اور حقیقت یہ بھی کہ ”اردو ڈائجسٹ“ بلاشبہ ایک بڑا کام ہے۔ اللہ اس کو قبول کرے اور اس کو مزید با اثر بنائے۔

ادبی کانفرنس کا احوال مجھے بہت اچھا لگا۔ ایسی چیزیں برابر دیا کریں۔ دیکھیں ناں جو ناک شوز آتے ہیں ۷۷ سے ۱۲ بجے تک مختلف چینلوں پر تو سوچتی ہوں کہ علم سے تو ہمارا ناطہ ٹوٹا ہی تھا اب ادب سے بھی ٹوٹ گیا۔ کیسی بے ادبی، بے لگامی۔

الامان والخفیظ.....!!!

اقبال سے مل کر بہت اچھا لگا۔ کوئی سچ جج اقبال سے مل لے تو اس کا اقبال بلند ہو سکتا ہے۔ ہاں میں اس بات سے متفق نہیں بھائی کہ بکری کا دودھ پی کر بھینسوں سے کیسے مقابلہ ہو سکتا ہے یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ ۱۴ سو برس پہلے وہ بکریوں کا دودھ پینے والے ہی تو تھے جنہوں نے بھینسوں سے نہیں دنیا بھر کی NATO فورسز سے تنہا خالی پیٹ اور پوشیدہ لباسوں میں جنگیں لڑیں اور اندلس تک پہنچے اور مستشرقین آج بھی

وغیرہ کا مسئلہ تھا۔ نام لکھنے سے اس نے منع کیا تھا۔ آپ دوبارہ رابطہ کریں۔

میں نے اپنا فون نمبر 0301-4585405 صرف میسج کرنے کے لیے ہے۔ آپ اس پر صرف اپنا مسئلہ میسج کر دیں میں باری آنے پر جواب دوں گی۔ کوئی فوری مسئلہ ہو تو بے شک وقت طے کر کے مجھے کلینک پر آ کر مل سکتے ہیں لیکن پلیز رات گئے تک فون کالز اور مس کالز کر کے تنگ نہ کریں۔ میں آپ سب کی مشکوٰۃ رہوں گی۔ ان کالز سے کوفت ہوتی ہے۔

کچھ قارئین نے اپنے جسمانی اور جنسی مسائل بھیجے ہیں یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ کسی سائیکیاٹرست سے رابطہ مفید رہے گا۔ یاد رکھیے اپنے ذاتی مسائل کو صرف متعلقہ ڈاکٹروں کے ساتھ شیئر کر کے مشورہ لینا چاہیے۔ غیر متعلقہ جگہ مشورہ کرنے والوں کے لیے آنکھوں کے ڈاکٹر کو ملنے کا اس لیے تجویز کیا جاتا ہے کہ آپ کیوں نہ دیکھ سکے کہ مشورہ اس سے لینے آئے جو اس شعبے کا ہی نہیں۔ اگر یہ شوقیہ ہے تو پھر اور بھی برا شوق ہے۔ اللہ رسول ﷺ نے جن باتوں کو حیا گنا ہے۔ اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں سب کو ہدایت دے۔ آمین عام طور پر ایسے مسائل جسم میں نہیں ذہن میں ہوتے ہیں۔ ذہن کو پاک صاف رکھنا آسان حل ہوتا ہے، نماز اور ورزش کے علاوہ اچھی صحبت، اچھا مطالعہ اور اللہ رسول سے محبت آپ کو اچھی زندگی گزارنے میں مدد دے گی۔ اللہ کا دیا پیٹرن آف لائف ہی سب سے عمدہ ہے۔ پاکیزہ اور بے حد صحت مند زندگی کو کچی پنسل کی طرح شارپ کر کے ختم نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ کیونکہ اللہ جی نے ایک سوال یہ ضرور پوچھنا ہے، ”صحت، جوانی کہاں اور کیسے گزاری۔“

بہت ساری اچھی دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ مجھے میرے اہل خانہ اور بچوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، شکریہ!

ج: آپ کا آئیڈیل وزن ۵۲ کلو ہے۔ آپ اپنا وزن ورزش اور متوازن غذا سے حاصل کر سکتی ہیں۔ آپ Canned اور Processed غذاؤں کا استعمال بند کر دیں۔ Hunger pangs میں کھیر یا سیب کا استعمال کریں۔ صبح اسکمڈ دودھ اور بادام لیں۔ دس بجے ایک گریپ فروٹ۔ ۱۲ بجے گھر کا بنا سالن ۳ سپون، ایک چپاتی جو فور گرین ہو، سلاد ایک پلیٹ اور سبز چائے لیں۔ شام ۴ بجے کے قریب اسکمڈ دودھ لیں۔ ۶ بجے کے قریب سیب یا مٹھی بھر مونگ پھلی، رات کے کھانے میں اُبلّا ہوا اٹّھ اور اسکمڈ دودھ لیں یا گھر کا ڈنر ہلکا پھلکا لے لیں۔ واک اور گیمرز میں خود کو مصروف کریں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھیں، رکوع اور سجدہ احتیاط سے کریں۔

مبارک ہو

ماہم۔ لاہور
آپ نے ۶ کلو وزن کم کیا۔ ۸۶ کلو سے ۸۰ پر آئیں۔
نوادا کبر۔ کراچی
۱۰۸ سے آپ ۹۹ کلو پر آئے مبارک ہو۔ آپ کا ڈنر تبدیل ہو گا کرا لیں۔
عائشہ بیگ۔ آزاد کشمیر
۹۶ سے ۸۹ کلو ہوا مبارک ہو۔
خدیجہ الیاس۔ گوجرانوالہ
آپ کو ۲۴ سال کی عمر میں ۶ سال بعد دوسری مرتبہ پیریڈ سٹارٹ ہوئے اور نارمل سرکل شروع ہوئے تین ماہ ہو گئے۔ مبارک ہو۔ بتائے ہوئے ڈائنٹ پلان پر عمل جاری رکھیں۔

ایک درخواست

کشمیر سے ایک لڑکی کا پرسنل خط آیا تھا۔ میں نے اسے جوابی خط لکھا لیکن میرے پاس اس کا ایڈریس کم ہو گیا ہے۔ آپ لوگ برائے مہربانی ایسی صورت میں جوابی لفافہ ضرور ساتھ بھیجا کریں۔ اسے مسلسل بخار اور پیریڈز

اپنے خوف یاد آگئے

یہ شمارہ گزشتہ شمارے سے بھی زیادہ خوبصورت لگا۔ بہت خوبصورت تحریریں ہیں۔ رضیہ بٹ کے بارے میں پڑھ کر گویا ان

سے ملاقات ہو گئی۔ گاندھی جی کے بارے میں لکھی گئی تحریر تاریخ کے تاریک گوشوں سے پردہ اٹھا رہی تھی۔

آپ کو اور آپ کی ٹیم کو ڈھیروں شاباش کہ کہاں کہاں سے کیا کیا نکال لاتے ہیں۔ (دردل پہ دستک) پڑھ کر اپنے بھی خوف یاد آ گئے۔ مزید ایک ”تحریر ایک مشاہدہ لکھا ہے جو بھیج رہی ہوں اس سے پچھلی تحریر مختصر مگر پر اثر“ کے اصول پر لکھی تھی۔ اگر یہ تحریر بھی ان فٹ قرار پائی تو یقیناً مایوسی تو ہوگی مگر اصلاح کا موقع تو ملے گا۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیں گے۔ (عشرت جہاں۔ ٹاؤن شپ لاہور)

ایسے ریکارڈ کا کیا فائدہ؟

کیم نو ممبر کو ہی اپنے پاس تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بہتر سے بہترین ہوتا ہوا یہ میگزین بھرپور اور سنجیدہ محنت کی بولتی تصویر ہے۔ کالم دردل پر دستک ایک بار پھر رضیہ بٹ کی سوانح آپ کی زبانی پرانے دروازے پر چلی گئی۔ گریٹ کیم، رازق رازق اور دیگر... سب اعلیٰ۔ چمن خیال میں محترمہ بشری رحمن کا مراسلہ ایک خاصے کی چیز تھی۔ واہ۔ ہمارے یوتھ فیسٹول میں بہت سے ریکارڈ بنے۔ چند ایک کے سوا باقی ہم سب دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ریکارڈ ہمارے مسلمانوں کے شایان شان ہیں؟ ورلڈ ریکارڈ کے لیے کاش ہم ادب، سائنس یعنی کیمسٹری، فزکس، بائیو میں بھی غیر مسلموں کو شکست دے سکیں اور ان چھوٹے چھوٹے، بے محض ورلڈ ریکارڈز سے ہم چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ میرے خیال میں تو بہت کچھ اس سے بھی زیادہ Productive ہو سکتا تھا۔ وقت کی قدر و قیمت کی اہمیت پر ہارون الرشید کے وقت کا یہ واقعہ بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ہارون الرشید کے دربار میں ایک دفعہ ایک شخص حاضر ہوا اور اپنا ایک کارنامہ دکھانے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر اس نے زمین پر ایک سوئی گاڑی اور کئی فٹ دور جا کر ایک اور سوئی کا نشانہ لے کر تاک کر پھینکی کہ پہلی سوئی کے ناکے سے گزر گئی۔ پورے دربار میں واہ واہ کا شور مچ گیا۔ ہارون الرشید نے انعام کے طور پر اشرافیوں بھری تھیلی عطا کی اور ساتھ ہی پوچھا کہ یہ مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنا وقت صرف کیا۔ اس شخص نے جواب دیا حضور! کوئی ایک برس اور کچھ دن کی مدت تو لگ گئی ہے۔ ہارون الرشید نے فوراً اسے جیل میں بھجوا دیا کہ اتنی مدت ایک لا حاصل کام پر صرف کر دی اور اتنی مدت کے لیے جیل میں ڈالوا دیا۔ (جاوید احمد صدیقی۔ راولپنڈی)

درست تجزیہ

رازق رازق تو ہی رازق، حکیم کا ورد خدا پر مکمل بھروسے کا مظہر ہے۔ حسین احمد شیرازی نے کرپشن پر تفصیل سے لکھا ہے جو بڑا صحیح تجزیہ ہے۔ (محمد صدیق۔ نارووال)

دل کی دنیا بدل گئی

اقبال تیرے عشق نے سب مل دے نکال
جسٹس ایم آر کیانی کا خطبہ تو واقعی فکر انگیز اور ڈائجسٹ کی جان تحریر ہے۔ رازق رازق نے خیالات کی دنیا بدل دی۔ واقعی یقین ہو تو تقدیر ہی بدل جائے۔

(محمد اویس دانش خان زادہ۔ نواب شاہ)

مصر کا ڈھائی سو سالہ دور

گزشتہ شمارہ میں ”سات عادات.....“ کے مصنف (اسٹیفن کووے) سے متعلق آپ کا مضمون بہت اچھا تھا۔ اس میں عہد قدیم کے حوالے سے حضرت یوسف کی مثال سبق آموز تھی۔ قرآن مجید کا طالب علم تو پیغمبروں کی حیات طیبہ کو مثال سمجھتے ہوئے مختلف عملی اسباق کشید کرنے سے مانوس ہوتا ہے۔ البتہ مغربی معاشرے میں جہاں بائبل اور اس کے حصوں کو بسا اوقات اساطیر کہہ کر ان کی اہمیت کم کر دی جاتی ہے، کووے کی جانب سے یوں تذکرہ کرنا کچھ مختلف معلوم ہوا۔

اگرچہ آپ نے چوکھٹے میں صرف عہد قدیم کا حوالہ دیا ہے مگر ہمارے ہاں قصہ یوسف مقبول ہے۔ اس لیے قرآن اور بائبل کے بیان میں ایک تاریخی فرق شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ کووے نے بائبل کے مطابق حضرت یوسف کے دور میں شاہ مصر کو فرعون لکھا ہے (یا آپ نے یہ ترجمہ کیا ہے؟) جبکہ قرآن میں ہر جگہ اس کے لیے ”ملک“ (بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ (سورۃ یوسف ۴۳، ۵۰) جدید ماہرین مصریات (Egyptologists) مصرف تاریخ کے ایک ڈھائی سو سالہ سنہرے دور کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ۲۰ء تا ۱۵۶۷ء ق م میں مصر پر چرواہا (Hyksos) خاندان برسر اقتدار تھا، جو حضرت اسماعیل کے خاندان سے تھے اور عرب سے مصر آئے تھے۔ یہاں کے مقامی فرعون کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تخت مصر پر قابض ہو گئے۔ چونکہ حضرت یوسف انہی بادشاہوں کے دور میں مصر لائے گئے تھے۔ قبلی مصری چرواہا بادشاہوں کے عہد کا تذکرہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ تورات کے اصل نسخے میں نامعلوم کیا

ایک امریکن کا ناسٹلجیا



منج کے پونے دو بچے ہیں۔ ”سینڈی“ طوفان کی بچری ہوائیں تھم جانے کے بعد واشنگٹن کی فضاء اب قدرے پرسکون ہے۔ میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھی ہوں۔ میز پر بھاپ اڑاتا کافی کا بڑا سا گم ہے اور ذہن دور بہت دور ان پگڈنڈیوں پر گامزن ہے جن کا سرمایہ منی سے جاملتا ہے۔ شہر، جدہ۔ عمر، لڑکپن کی..... دل پڑھائی سے زیادہ ادبی کتابوں اور رسالوں میں لگتا ہے اور کیوں نہ لگے؟ والدہ شاعرہ ہیں اور والد صاحب شاعر۔ اقبال (علاوہ اقبال) کے قتل اور نثر مسعود (مسعود مختار) کے قاتل ہیں۔ جدہ میں واقع ہمارا گھر گویا اردو ادب کا ایک ڈیرہ ہے، جہاں ہر ماہ مشاعرہ ”فرض عین“ کی طرح ”ادا“ کیا جاتا ہے۔

ہمارے دوست احباب رات کوئی وی دیکھتے ہیں لیکن ہمارے گھر کی روایت مختلف ہے۔ یہاں رات کو سب کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ ہوتا ہے..... ہم ”پھول“ شوق سے پڑھتے ہیں۔ معیاری ہے اور معلوماتی بھی۔ جی چاہتا ہے کہ کہانیاں لکھیں۔ ایک کہانی لکھ کر ایڈیٹر بھیا کو بھیجی ہے۔ کہانی ”پھول“ میں چھپ جاتی ہے۔ اسکول میں استانیات خوش ہیں اور سماجی طالبات پر جوش۔ پھول سے محبت اور کہانیاں لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اچانک سڑک پر سامنے آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آنکھوں میں پڑتی ہیں اور میں یک دم ماضی سے حال میں لوٹ آتی ہوں۔ یہ Nostalgia بے سبب نہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اختر عباس صاحب سے کئی برسوں کے وقفے کے بعد لاہور بات ہوتی ہے۔ اتفاق دیکھئے، وجہ تسمیہ اس مرتبہ بھی ایک رسالہ ہے۔ ہم برطانیہ میں رہنے والوں کا حال بھی عجیب ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اپنے وطن کے رنگ ڈھونڈتے ہیں۔ جب کبھی دیسی سٹور جانا ہوتا ہے تو پہلی نگاہ پاکستانی رسالوں پر ہی پڑتی ہے۔ ”اردو ڈائجسٹ“ سے پرانی شناسائی کی وجہ سے میں سب سے پہلے یہی رسالہ اٹھاتی ہوں۔ جو گزشتہ کچھ عرصے میں بدل سا گیا ہے۔ تحریروں کا انتخاب پہلے بھی عمدہ ہوتا تھا لیکن اب تو جیسے نئے اور منفرد سلسلوں کے ساتھ ساتھ جدت نے اسے ایک بالکل نیا انداز عطا کیا ہے صرف ایک ہی گلہ ہے کہ اردو ڈائجسٹ یہاں واشنگٹن ڈی سی میں بہت دیر سے دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن ایک اچھی خبر یہ ہے کہ رسالہ باقاعدگی سے ویب سائٹ پر شائع کیا جاتا ہے۔

(مدیر انور۔ وائس آف امریکا۔ واشنگٹن ڈی سی)

صاحب ہر ماہ کسی اہم شخصیت کا انٹرویو کرتے تھے۔ اب میں عمر عزیز کے ۷۲ سال میں ہوں۔

اکتوبر ۲۰۱۲ء سے ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ”ماہ رواں“ میں پیدا ہونے والی اہم شخصیات، اسمائے گرامی، مگر ماہ اکتوبر ۲۰۱۲ء میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حکیم محمد سعید صاحب شہید جو کہ ۱۷ اکتوبر کو شہید ہوئے تھے ان کا نام شامل نہیں ہے۔ میری

لفظ ہوگا جس کا ترجمہ موجودہ نسخوں میں فرعون کیا گیا ہے جب کہ قرآن کا بیان تاریخی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے۔

(تیمہ صبیحہ۔ خیابان سرسید راولپنڈی)

اردو ڈائجسٹ جوانی سے پڑھ رہا ہوں

میں ”اردو ڈائجسٹ“ جوانی سے پڑھ رہا ہوں۔ اس وقت اردو ڈائجسٹ کی قیمت غالباً ڈیڑھ روپیہ تھی۔ الطاف حسن قریشی

پوتی ”بوجھو تو جانو“ میں حصہ لیتی ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء کے ایک سوال میں حضرت حمزہ کو شہید کرنے والے کا نام پوچھا تھا جس کا جواب وحشی لکھا تھا مگر آپ نے وہ جواب تسلیم نہیں کیا۔ کیوں؟ (عقیل احمد خان۔ کراچی)

(وحشی غلام کا اصل نام اجیہ تھا۔ وہی پوچھا گیا تھا)

سالانہ قیمت

مدیر اردو ڈائجسٹ نے فون کر کے اردو ڈائجسٹ کے بارے میں رائے معلوم کی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اختر عباس صاحب ہمیں فون کریں گے۔ جناب کے فون سے دل باغ باغ ہو گیا اور حوصلہ کافی بلند ہوا۔ ایک مدیر کا اپنے قاری کو فون کرنا حوصلہ افزائی کے لیے بہت کچھ ہے۔ جناب ایک سالانہ خریدار کے لیے موجودہ قیمت یعنی ۵۰ روپے ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ ایک متوسط آمدنی والے آدمی کے لیے مشکل ہو گا۔ کم از کم ایک، دو سال کے لیے تو یہی قیمت مناسب ہے۔ ”درد دل پہ دستک“ بے حد پسند ہے۔ خدا کرے کہ ہمارا معاشرہ اس سے سدھر جائے۔ ڈائجسٹ کے لیے میں بھی لکھنا چاہتا ہوں مگر حوصلہ نہیں ہو رہا۔ مہربانی کر کے کوئی مشورہ دیجیے۔ (رحمت اللہ بلوچ۔ فورٹ منرو)

(مشورہ یہ ہے کہ حوصلہ کیجیے)

تعلیم کے حوالے سے حکمرانوں کی بے بسی

تعلیم کے سلسلے میں حکمرانوں کی بے بسی اور مجرمانہ غفلت کی بالکل صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ لہذا پرائمری جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک معیار تعلیم اس قدر گر چکا ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اس موقع پر مجھے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر (Tony Blair) کا وہ تاریخی جملہ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ جب اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد اخباری نمائندوں نے ان سے پوچھا کہ بطور وزیر اعظم ان کی ترجیحات (Priorities) کیا ہوں گی تو انھوں نے کہا:

"My first priority will be education, my second priority will be education and my third priority will be education."

(میری پہلی ترجیح تعلیم، میری دوسری ترجیح تعلیم اور میری تیسری ترجیح تعلیم ہوگی)

ملک میں معیار تعلیم جس تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہا

ہے اس سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص منصوبے کے تحت قوم کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتہ سلطانی و ملانی و پیری

(پروفیسر عطاء الحق سبحانی)

ذہن ساز رسالہ

میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تعریف کر سکوں کہ اردو ڈائجسٹ کس قدر اچھا رسالہ ہے۔ میں دسویں جماعت کی طالبہ ہوں اور گورنمنٹ گرلز ہائیر سیکنڈری میں پڑھتی ہوں۔ میرے گاؤں کا نام کرنوڑ ہے۔

اردو ڈائجسٹ ساتویں میں میرے ایک ٹیچر نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا۔ مجھے پڑھ کر بہت اچھا لگا اور پھر میں باقاعدگی سے پڑھتی آرہی ہوں یہ واقعی ذہن ساز رسالہ ہے۔ اس سے پہلے میں ”ماہنامہ روشنی“ میں لکھ چکی ہوں اور اس میں بہت سی کہانیاں چھپی ہیں اور حال ہی میں مجھے روشنی کی طرف سے بیسٹ رائٹر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میں نے ”ماہنامہ روشنی“ میں ”فقتہ“ سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ ”ماہنامہ المدد“ اور ”ماہنامہ پھول“ میں اقوال زریں اور پونہز شائع ہو چکی ہیں۔ پھول میں لیٹرز کے علاوہ کچھ شائع نہ ہوا۔ بہت کوشش کے باوجود آج ”اردو ڈائجسٹ“ میں ایک مختصری تحریر بھیجی ہے۔ امید ہے ضرور شائع کریں گے۔ اگر آپ کو پتا چل جائے کہ میں کتنی سردی میں آپ کے ڈائجسٹ کے لیے تحریر اور لیٹر لکھ رہی ہوں اور اتنی محنت کر رہی ہوں تو شاید آپ بھی میری تحریر رومی کی نوکری کے پیٹ میں نہ ڈالیں۔ پلیز ضرور جگہ دیجیے گا۔ (کہری شاہین۔ دھیر کوٹ آزاد کشمیر)

خاص چیزیں

اردو ڈائجسٹ اس لحاظ سے زبردست ڈائجسٹ ہے کہ انفارمیشن اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسی چیزیں جن پر دوسرا توجہ نہیں دیتا وہ ایک ہی رسالے میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ثقافت، سیاست، مذہب، ایڈز، معلومات اور سائنس۔

میری میر پور خاص سندھ میں کتابوں کی دکان ہے۔ میں ڈائجسٹ خرید کر نہیں پڑھتا ہوں۔ اردو ڈائجسٹ ریک میں لگا ہوتا ہے تو اس کو نکال کر پڑھنے، دیکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ بہت زبردست رسالہ ہے۔ اخبار جہاں کو مکمل دیکھنے میں جتنا ٹائم لگتا

ہے اس سے زیادہ ٹائم اس رسالے کو دیکھنے میں لگ جاتا ہے۔ مکمل اس کو نہیں پڑھتا مگر جو چیزیں اپنے مطلب کی ہوتی ہیں ضرور پڑھتا ہوں۔ (ظفر اقبال۔ میر پور خاص)

۳ ماہ گزرنے کے بعد

بغیر کسی تمہید کے اصل بات کی طرف آتا ہوں کہ بندہ آپ اور اردو ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سرخ سلام پیش کرتا ہے وہ اس لیے کہ بندہ نے اپنے مدرسے کے سالانہ امتحان سے پہلے جون کے شمارے قصہ کوئز اور اسلام کوئز کے صحیح جوابات بھیجے اور پھر اسے بھول کر مدرسے کی تعطیلات میں اپنے شہر کوئے آ گیا۔ میرا یقین تھا کہ یہ انعامی سکیم صرف ایک دھوکا ہے انعام تو صرف ڈائجسٹ والے اپنے رشتے داروں کو ہی دیتے ہیں۔ کون چیک کرتا ہوگا۔

تعطیلات گزار کر واپس کراچی آیا اور اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا اتنے میں جولائی، اگست، ستمبر ۳ ماہ گزر گئے۔ اکتوبر میں ایک دوست نے بتایا کہ آپ کو انعام میں کون سی کتابیں ملیں، میں نے پوچھا کیسا انعام؟ تب اس نے بتایا کہ بھائی! آپ کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ مجھے افسوس ہوا کہ ارے یار! یہ کیا ہوا؟ خیر ڈرتے ڈرتے میں نے اردو ڈائجسٹ کا منیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض صاحب کا نمبر ملا یا، ذہن میں یہ تصور تھا کہ وہاں سے ڈانٹ پڑے گی کہ جون کا انعام اکتوبر میں مانگ رہے ہوں لیکن معاملہ بالکل الٹ ہوا۔ انھوں نے بڑے پیار سے سمجھایا کہ اس نمبر پر رابطہ کرو، آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور یاد رہے میرے فون کرنے پر وہ مصروف تھے بعد میں فون انھوں نے خود کر کے نمبر دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا میں پاکستان میں ہوں؟ جہاں دفاتروں میں لوگ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے اور ان ملائے ہوئے نمبر پر جب میں نے رابطہ کیا تو وہاں مدیر صاحب کے اسٹنٹ غلام سجاد صاحب سے بات ہوئی۔ انھوں نے بھی بڑے اخلاق سے میری بات سنی پھر میرا نام، پتا وغیرہ نوٹ کر کے کہا کہ آپ کا انعام آپ کو مل جائے گا۔ کچھ دنوں بعد مجھے میرا انعام مل گیا، میں نے پھر ایڈیٹر صاحب سے رابطہ کیا تو اختر عباس صاحب نے بتایا، ”بھائی یہ انعام تو آپ کو مروانا، اخلاقاً اعزازی طور پر بھیجا گیا ہے ورنہ آپ کا انعام تو آپ کو ہم نے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ یہ سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میرا خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اردو ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کروں اور دوسرے

لوگوں کو بھی ترغیب دوں کہ اخلاقی معیار اونچا ہونا کس قدر خوشی دیتا ہے۔ (محمد افضل کاسی۔ کوئٹہ)

ہمہ گیری

ایک چیز آپ کی خدمت میں کروں کہ رسالے کے اندر ہمہ گیری لانے کی کوشش کریں۔ سراغ رسانی، شکاریات اور تاریخی مضامین کو بالخصوص جگہ دیجیے گا نیز مختلف موضوعات پر خصوصی نمبرات بھی ضرور شائع کیجیے۔ (عبدالجیب خان۔ قلمت بلتستان)

سلسلہ وار کہانی ضرور دیں

آپ کسی مشہور رائٹر کا ناول لیں اس کو اردو میں لکھا کر اردو ڈائجسٹ میں سلسلے وار کہانی ضرور دیں۔ بے شک آپ اپنے قارئین سے رائے لے لیں، میں آپ کو دوبارہ خط نہیں لکھوں گا کیونکہ اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔ دسمبر میں شاید میں لاہور آؤں تو آپ کے دفتر آنے کی کوشش کروں گا۔ (محمد اشفاق۔ سرانے عالمگیر گجرات)

زندہاں میں رسالہ حاصل کرنا آسان نہیں

اردو ڈائجسٹ سے میرا تعارف زندہاں میں ہی ہوا۔ پھر تعلق اتنا مضبوط ہو گیا کہ ۳ رسالے سے کوئی شمارہ میں نہیں ہوا۔ زندہاں میں اسے حاصل کرنا بھی آسان نہیں مگر درد دل پہ دستک سے اب تک کتنے ہی دلوں کے در کھلے ہوں گے۔ مہینے میں ایک دفعہ دستک ہوتی ہے اس لیے پہلے دستک پہ سنتا ہوں۔ باقی مضامین اور کہانیوں کا نمب بعد میں آتا ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے شمارے میں جدت آگئی ہے۔ اگرچہ جیب پر بوجھ بھی بڑھا ہے مگر اس قیمت میں بھی شمارہ سستا ہے۔ اکتوبر کے شمارے کا سرورق دیکھ کر ہی پیسے پورے ہو گئے تھے۔ باقی مطالعہ مفت میں رہا۔ نومبر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے دستک سن کر نچھٹا قب کی ابا بلیں پڑھی تو دل اُداس ہو گیا پھر نفاست کی واپسی نے مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ باقی ابھی پڑھنا ہے عبدالمالک مجاہد کی آپ بیتی کا انتظار ہے۔

(محمد رفاقت۔ امیریل اسٹرنل جیل اڈیالہ راولپنڈی)

آپ جیسا صاحب ذوق اور شائستگی مزاج زندہاں میں! مجھ میں نہیں آتا۔ کبھی قلم اُٹھائے عبرت انگیزی کے لیے ہی کہیں۔ شاید اوروں کا بھلا ہو جائے۔ حقائق اکثر فکشن سے زیادہ موثر ہوتے ہیں

دلچسپی، معلومات
اور کچھ کرگزر نے کا جذبہ،
یہی ہے اس
کوئز کا اصل مقصد



یہی ہے قصہ کوئز

انچارج کوئز:
عسلام سجاد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکتانہ اور زندگی کو با مقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کرگزر نے کا جذبہ، اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۳ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہونے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۶ شماروں کی انعامی دادرازی ترسیل کے علاوہ وہی شاہ کی شاعری کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجئے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ نومبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) بوعلی سینا (ب) الشفاء۔ القانون فی الطب قصہ کوئز ۲۔ (الف) نیل آرمسٹرانگ (ب) اپالو ۱۱
قصہ کوئز ۳۔ (الف) نیلسن منڈیلا (ب) افریقن نیشنل کانگریس

درست جوابات دینے والوں کے نام

شعیب شاہد (لاہور)، حافظ احمد باغی (لاہور)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، پروفیسر خان محمد (پشاور)، شمیمہ نئی رشید اعوان (گوجرانوالہ)
سلطان محمود (کھاریاں)، ماہ نور عرفان (کراچی)، اقبال بانو (ڈیرہ اسماعیل خان)، پاپس احمد (کوٹلی لوہاراں)، مظہر علی (کراچی)
مشرت جہاں (لاہور)، عبدالسلام (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، طہ اللہین (حیدرآباد)، مرزا فرحان بیگ (حیدرآباد) آصف کریم (حیدرآباد)
محمد یاسین راندوری (حیدرآباد)، عقیل احمد خان (کراچی)، عبدالمنان شاہ (تلہ گنگ)، حافظ محمد فیصل ندیم (تلہ گنگ)، بلی رضوی (کراچی)
محمد شعیب (حیدرآباد)، حبیب احمد صدیقی (بہاولپور)، منظور احمد بھٹی (نواب شاہ)، وقاص احمد (لاہور)، فوزیہ فیاض (چکوال)
محمد غلیل چودھری (دینہ)، ڈاکٹر حبیب انوار (لاہور)، سید محمد فضل (اسلام آباد)، محمد ذوالقرنین خان (کوئٹہ)، امیرین (لاہور)
محمد میر گل (لاہور)، عرفان طارق (جہانیاں)، مشرف حسین شاہ (دہاڑی)، محمد (گڑھی یاسین)، الفت حسین (شیخوپورہ)
راشد علی (لاہور)، محمد جہانگیر، ذوالفقار علی شاہ (چترال)، محمد زبیر مدنی (بھکر)، محمد غلیل حامد انصاری (لاہور)، اعجاز الحق پٹان (چترال)
نگزار عثمانی (لاہور)، غازی ہاشم (ننڈوالہ پار)، محمد عرفان (لاہور)، عرفان رفیق (میرپور)، منظور سعید (سکرٹ)
عبدالحمید (کراچی)، وقاص سعید (چکوال)، عبدالاحد (گھوٹی)، محمد عمر بخش (حیدرآباد)

قصہ کوئز ۱

وہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ کی فوج میں افسر تھا۔ جب نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا تو افغانی قبائل کی مجلس شوریٰ نے اسے تخت نشین کر دیا۔ فقیر درویش سید صابر شاہ نے اسے "دُر دوراں" کا خطاب دیا۔ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۶ء تک وہ دہلی کو تاخت و تاراج کر چکا تھا۔

۱۷۶۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دعوت پر آخری بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور سکھوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی مگر اس کی اپنی سلطنت میں ہونے والی سازشوں نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ جس کے بعد سے پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ وہ ۱۷۷۳ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

(الف) کس شخص کا ذکر ہے اس واقعہ میں؟
(ب) اس نے ہندوستان پر کتنے حملے کیے؟

قصہ کوئز ۲

افریقہ، ایشیا اور یورپ کے اکثر علاقوں کی سیاحت کرنے والا عظیم مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان مراکش کے شہر طنجة میں پیدا ہوا۔ ابھی ۲۲ سال کا تھا کہ جون ۱۳۲۵ء میں سفر حج پر روانہ ہوا۔

یہ قافلہ اسکندریہ اور قاہرہ سے ہوتا ہوا جدہ پہنچا۔ اسکندریہ میں اس کی ملاقات برہان الدین سے ہوئی جس نے اس کے دل میں چین اور ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا کر دیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد وہ معلومہ دنیا کے اس عظیم سفر پر نکل کھڑا ہوا جس کی روداد آج بھی علمائے تاریخ و ادب کے لیے ماخذوں کے ایک سنگ میل کی

جوابات بھیجنے والے قارئین اپنا رابطہ ضرور بھیجا کریں تاکہ انعام بھیجنے میں آسانی رہے

انعامات کے لیے تعاون
منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ستمبر ۱۳۳۳ء میں کوہ و ہندوکش کے راستے ہندوستان پہنچا۔ ۱۳۳۵ء میں وہ لنکا، بنگال، سلہٹ اور کمبوڈیا کے راستے پیکنگ اور کینٹن کی طرف بھی گیا۔ واپسی پر ساٹرا، مالا بار، ظفار، عمان، جنوبی فارس اور بغداد سے ہوتا ہوا چوٹی پارچ کے لیے مکہ پہنچا۔ اس نے مجموعی طور پر ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ مراکش کے حکمران ابو عنان کے کہنے پر اس نے اپنی آپ بیتی لکھی۔

(الف) اس سیاح کا نام بتائیں اور وہ کب ہندوستان پہنچا؟
(ب) اس کی لکھی ہوئی آپ بیتی کا نام اور سفر کا مجموعی فاصلہ بتائیں جو اس نے طے کیا؟

قصہ کوئز ۳

فاطمی دور کا سب سے بڑا مسلمان سائنسدان، ماہر فلکیات، ریاضی دان اور طبیب بصرہ میں پیدا ہوا اور علوم طب و فلسفہ و ریاضی میں کمال حاصل کیا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ الحاکم نے اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے مصر بلایا تاکہ اسوان کے قریب دریائے نیل پر بند بنانے کا منصوبہ تیار کرے لیکن وہ یہ کام کسی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ الحاکم کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تصانیف کی طرف توجہ دی اور علم ہیئت اور علم نور کی بنیادی سائنسی تحقیقات پیش کیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد ۲۲۰ سے اوپر ہے۔ اس کی تحقیقات کے مطابق شفق کی ابتداء اور انتہا اس وقت ہوتی ہے جب سورج افق سے ۱۹ درجے نیچے ہو۔ اس نے گرہن کی صحیح توجہ کی اور عددہ کی قوت پر تحقیقات کیں۔

(الف) اس شخص کا نام بتائیں اور اُس نے کل کتنی تصانیف لکھیں؟
(ب) اس نے روشنی کی کتنی اقسام بتائیں اُن کے نام بتائیں؟

جوابات بھیجنے والے قارئین اپنا رابطہ ضرور بھیجا کریں تاکہ انعام بھیجنے میں آسانی رہے

خوبصورت اور معیاری کتب
منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

آپ کو ۶ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے اور وہی شاہ کی کتب بطور تحفہ ملیں گی

حافظ محمد فیصل ندیم
شمیمہ نئی رشید اعوان
V.P.O سگوالہ تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال
محلہ محمد گرنو شہرہ روڈ گلی نمبر ۱ گوجرانوالہ

قرعہ اندازی میں
جیتنے والوں کے نام

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھیج سکتے ہیں

میری جان...! آج پھر ۱۶ دسمبر ہے

میری جان آج پھر ۱۶ دسمبر ہے
بہت سے سرخ آنسو آج پھر آنکھوں میں اترے ہیں
ہوا پھر سے

بہت سے زرد پتے ساتھ لائی ہے
محبت کے نگر میں پھر وہی حسرت کے ڈیرے ہیں
تمہارے بعد آنگن میں بہت گہرے اندھیرے ہیں
وہ سورج نہیں اترتا

جو پہلے روز آتا تھا
امید کرنوں میں بھر کے لاتا تھا
میرے آنگن میں گہری نیم کے سائے
وہ ہم سائے

سبھی تم کو بلاتے ہیں
مگر منڈیر پہ بیٹھی ہوئی وحشت یہ کہتی ہے
ارے پاگل

جو جاتے ہیں کبھی واپس نہیں آتے
۴۰ سال گزر گئے، جانے والے واپس آئے نہ بھیجئے

والوں نے واپسی کی
کوئی کوشش کی۔ زمینی
فاصلے بے شک کم نہیں
ہو سکتے تھے مگر دلوں کو
پائے، زخموں پہ پھاہا
رکھنے، اپنی غلطیوں کا
اعتراف کرنے،

در دل پہ
دستک
اختر عباس



ہوٹل میں ۱۹۹۶ء کی ایک شام اس عہد کے یکتا دانشور
اشفاق احمد نے ”پھول زاویہ“ میں کہا ”میں اپنے بنگالی
بھائیوں پر ہونے والی ہرزیا دہی اور ظلم پر پوری قوم کی طرف
سے معافی مانگتا ہوں۔ معافی مانگنا ایک بڑا وصف ہے اور
ہم اسی سے بے بہرہ ہیں۔“ معافی مانگ لیتے تو دلوں کو
جوڑنے کے کئی راستے نکل آتے۔ لوگ دشمنوں کو اپنا رہے
ہیں وہ تو پھر ہمارے اپنے تھے۔ اس ملک کی بنیاد رکھنے
والے، اس کا خواب دیکھنے والے۔ بڑے قابل اور تیز،
بے چین روحوں کو محبت سے منایا جاتا ہے۔ غصے اور گولیوں
سے کون مانتا ہے۔ ہم ۴۰ سال بعد بھی یہ نہیں جان پائے
اور وہی کلیہ پھر آزمانے پر لگے ہوئے ہیں۔

خدا جانے یہ قومی بے نیازی کی صفت ہے یا بے حسی
کی، ہم اس سے بری طرح متصف ہیں۔ ہر سال ۱۶ دسمبر
نہ آئے تو ہمیں کوئی یاد بھی نہ دلائے کہ کبھی سنار بنگلہ مشرقی
پاکستان ہمارے دل کا حصہ تھا اور ہمارے ساتھ دھڑکتا تھا۔
آج وہ ۱۶ کروڑ سے کہیں زیادہ ہیں۔ مطمئن، آسودہ، تعلیم
اور ترقی دونوں میں ان

کی رفتار ہم سے زیادہ
ہے۔ ہاں بے چینی میں
بھی کمی نہیں۔ جس جس
نے ان کی توقعات کا
خون کیا، اسے اختیار و
اقتدار پر رہنا نصیب نہیں

ہوا چاہے وہ ان کا بنگلہ بدھو شیخ مجیب الرحمن ہی کیوں نہ ہو۔
۱۶ دسمبر کا زخم اس وقت پھر سے ہرا ہو گیا جب
انٹرنیٹ پر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے تصاویر اور مضامین
کی ایک نہ ختم ہونے والی سیریز سے واسطہ پڑا۔ کہیں

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکراتے چہرے
والے افسر تھے، کہیں روتے ہوئے فوجی جوان، کہیں مکتی
باہنی کے رہنما اور کارکن تھے اپنے ہی ان بنگالی اور غیر بنگالی
دوستوں کے گلے کاٹنے کی تصویریں جو آخری سانس تک
پاکستان سے محبت کا دم بھرتے رہے۔ مکتی باہنی کے کارکنان
بھارت کے ”مجیب نگر“ سے آتے اور مشرقی پاکستان کے
بنگالیوں کو آزادی کے خواب دکھاتے اور دیکھنے پر آمادہ نہ
ہونے والوں کو موت کی وادی میں پہنچاتے۔ اس ویب
سائٹ پر ان کے ٹریننگ کیمپ اور تربیت کی تصاویر بھی
تھیں، جس طرح بھارت آج بلوچوں کو تربیت دیتا ہے۔
البدھر کے رضا کاروں پر ظلم و زیادتی کے مناظر بھی تھے اور
بے گور و کفن پڑی محبت وطن پاکستانیوں کی لاشیں بھی جس کا
اب ذکر بھی ”آؤٹ آف فیشن“ ہے۔

میں انھیں دیکھتا..... اور سوچتا رہا کہ قومیں بنانے اور
برباد کرنے والوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے اور بنیادی
فرق لوگوں کے جذبے، شکلوں، تعداد کا نہیں، مقصد زندگی
کے فہم اور حصول کے جنون کا ہوتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ
اتنے برسوں میں جغرافیہ اور تاریخ تو بگڑی ہی بگڑی تھی، اپنی
سوچ اور مستقبل تک بگاڑ لیا۔

چلیں آج لمحہ بھر کو اندرا گاندھی، مجیب، بھٹو اور یچکی کو
برا بھلا نہیں کہتے اور صرف یہ سوچتے ہیں کہ کیا کوئی اکیلا
آدمی اتنی بڑی شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، کیا اس
کے ساتھی، وزیر، فوجی افسر، صلاح کار، شریک، اقتدار کی
کشتی کے سیاسی سوار معصومیت کے کسی دودھ سے دھلے
ہونے کے دعوے دار ہو سکتے ہیں کہ ان معصوموں کے نام
ہی نہ لیے جائیں، جنھوں نے ہماری زندگیاں دکھ اور کرب
سے بھر دیں۔ میں چار دہائیوں کے بعد بھی اس لمحے کی
اذیت نہیں بھول پاتا۔

انور بہزاد نے اپنی بھاری اور گھمبیر آواز میں ریڈیو
پاکستان لاہور سے ۱۶ دسمبر کی سہ پہر ۴ بجے کی خبریں
پڑھنا شروع کیں تو وہ صدر پاکستان جنرل یحییٰ خاں کے
”جنگلوں میں پہاڑوں میں، میدانوں میں دشمن سے جنگ“

جاری رکھنے والے خطاب اور مشرقی محاذ پر پاک فوج کی
کامیابیوں اور بھارتی فوج کی جگہ جگہ ناکامیوں سے عبارت
تھیں۔ سکول سے چھٹی تھی اور ہم گھر پر تھے، خبریں ختم
ہونے والی تھیں جب آخری ۳۰ سیکنڈ میں انور بہزاد کی
آواز بھرا گئی اور بظاہر ایک عجیب بے معنی سی خبر انھوں نے
پڑھ ڈالی ”مقامی کمانڈروں نے باہمی معاہدے کے تحت
فائر بندی کر لی ہے اور ایک فوجی معاہدے کے تحت بھارتی
فوجیں آج ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں۔“

ہمارا گھر چشتیاں میں ”قمر کے کارخانے“ اور کمہاروں
کی آویوں کے درمیان ایک کھلی سی سڑک پر واقع تھا۔ گھر
کے بالکل قریب ایک دوسرے کارخانے سے جڑی ایک
آوی سے دھواں نکل رہا تھا اور گھر کے اندر بے چینی کا
دھواں بھرا تھا، ابو جان اس خبر کی تصدیق اور تردید کے لیے
بی بی سی سننے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ یونہی بی بی
سی نے بے دردی سے بتایا کہ آج پاکستانی افواج نے
ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیے تو مجھے یاد ہے ہم سبھی یوں
روئے تھے جیسے جسم کا کوئی ٹکڑا الگ ہو گیا ہو۔ آنے والے
دنوں میں نہ تو ”ہتھیار بر زمین شو“ کی تفصیل سن سکے اور نہ
جنرل نیازی کے بے شرمی سے اپنا پستول جنرل اروڑہ کے
حوالے کرنے کی شرمناک تفصیل جان سکے۔ تب بھی اپنے
جسم کٹنے کی خبر غیروں نے دی تھی۔ ہمارا اپنا ریڈیو تو ہتھیار
ڈالنے کا ذکر ہی گول کر گیا تھا۔ کیا یوں خبریں چھپانے سے
تاریخی حقائق چھپ جاتے ہیں۔ آج میٹ پر جب بنگلہ دیش
کے اسکولوں میں بچے جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ بن کر
ٹیچ ڈرامے میں وہ مناظر دھراتے ہیں تو پوری تکلیف وہ
روایت ان کے ہاں پھر سے زندہ ہو جاتی ہے بھی تو ابھی
انھوں نے پھر پاکستانی وزیر خارجہ حنا ربانی کھر سے ملکی سطح
پر معافی مانگنے کا مطالبہ کیا ہے۔ خدا کرے یہ پچھڑنے والوں کا
آخری مطالبہ ہوکل کسی اور سے ایسا مطالبہ نہ سننا پڑے۔

دل میں ایک سوال بار بار سر اٹھاتا ہے۔
”ہمارے ہاں ہر بڑے حادثے اور سانحے کی بنیاد
فوج کے ہاتھوں کیوں رکھی اور رکھوائی جاتی ہے؟“.....؟

سادہ سا سوال بظاہر تنکھا اور شدید ہے مگر ایک جواب ۲۰۰۷ء کے چوتھے مہینے کے روزنامہ ”ڈان“ میں دو کالمی خبر میں تھا۔ فوجی حکمران کے نقطہ نظر سے وفاقی محکمہ تعلیم کے افسران نے خوشی خوشی بتایا تھا کہ حکومتی ہدایات پر آنے والے برسوں میں پہلی سے چہارم تک کے سلیبس سے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان نکالنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور صوبوں کو الگ سے ہدایات دی جا رہی ہیں، تاکہ عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے اور کمال مہارت اور عمدگی سے یہ کام کر دیا گیا۔

سچی بات یہ ہے کہ خبر پڑھ کر مجھے وہاں ایک بریگیڈیئر دوست کی شدید کمی محسوس ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا، ہے اور رہے گا کہ فوج کے پاس ایسے ایسے ماہرین ہیں کہ ان کے بعد کسی ماہر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ابھی چند روز قبل ہی وہ سقوط ڈھاکہ کے واقعات اور اسباب بیان کر رہے تھے تو بار بار ان کی تان اسی بات پر ٹوٹی تھی کہ میرا عمر بھر کا تجربہ اور تجزیہ بتاتا ہے کہ قومیں، تعلیم سے زیادہ اس نصاب کی پشت پر کار فرما مقاصد سے بنتی اور بگڑتی ہیں جو حکمرانوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔

وہ کس قدر یقین سے بتا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش ہندوستان نے نہیں، ہندوستان مذہ اور ان کے منتخب کردہ سلیبس نے بنانے کی ابتدا کی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ یونیورسٹیوں کے کتنے ہی واقعات ان کو یاد تھے کہ لڑکے بتایا تھا نہ کسی نے پڑھایا تھا۔ پڑھانے والوں نے اس قدر روشن خیال سلیبس بنایا تھا کہ وہ پورے ہوتے ہوئے بھی ادھورے ہو گئے تھے۔ پاکستان میں رہتے، پاکستانی اداروں میں پڑھتے مگر نہیں جانتے تھے کہ پاکستان ان کا ملک ہے اور محبت کے لائق ہے۔ پھر وہ خود ہی بولے تھے کہ محبت اور تعلق مذہب سے بنتا اور بڑھتا ہے۔ اسلام ان کی کتابوں سے نکال کر یوں پھینک دیا گیا تھا جیسے پرانی چیز ہو۔ کسی دشمن کی ملکیت ہو۔ اسلام کو کلاس روم میں آنے کی اجازت ہی نہیں تھی تو دل میں کیسے اترتا۔ جب یہی لڑکے

اور لڑکیاں بنگلہ دیش بنانے نکلے تو ہر اس مرد اور عورت کو بے دردی سے مار دیتے تھے جو اسلام اور پاکستان کا حوالہ یا واسطہ دیتا تھا۔ ان کی پہچان، شناخت صرف بنگلہ زبان، بنگال اور بنگالی تھے جو آزادی کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اسی حوالے نے انھیں جوڑ رکھا تھا۔ یہی ان کو بتایا اور پڑھایا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو مرحوم ہونے ۴۱ سال ہونے کو آئے ہیں مگر ہمیں نہ ڈھاکہ بھولا نہ ڈھاکہ والے۔ جدائی کا دکھ بھولا نہ دکھ دینے والے۔ سارے کردار اپنے انجام کو پہنچے مگر سارے سوال تو آج بھی زندہ ہیں۔

جنرل یحییٰ سے لے کر بھٹو، مجیب اور جنرل نیازی تک، جس جس نے پاکستان اور اس کے رہنے والوں کو اس شرمناک دن تک پہنچایا، کبھی ان سے پوچھا نہ جاسکا۔ جنرل ایوب کے مارشل لاء اور مشرقی پاکستان کی محرومیوں کی ابتدا کرنے والے کسی کردار سے سوال نہ کیا جاسکا۔ بنگلہ بھائیوں کے لیڈروں کو بے عزت کرنے، ان کے رنگ اور قد کا مذاق اڑانے اور ثقافت کو کمتر جاننے والے ہر بیوروکریٹ نے، اپنے ہی بنگلہ فوجیوں کو مارنے اور اپنے لوگوں پر چڑھ دوڑنے والے جرنیلوں سے ملک توڑنے میں حصہ ڈالا۔ الطاف گوہر کی گواہی ہو یا قدرت اللہ شہاب کی، ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ دوسروں کو کمتر جاننے اور خود کو برتر ماننے والے ان حکمرانوں نے ہمیشہ ایک سا سوچا اور ایک سے نتائج پیدا کیے۔ جب ملک کی بنیادوں کو برباد کرنے والی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں تو بنانے والے ہاتھ اور ذہن بے شک سول بیوروکریسی کے اور چہرے سرکاری درباری اہل کاروں کے ہوتے ہیں جو حکمرانوں کے اشاروں پر جڑیں کاٹنے والے ہر کام کو خدمت سمجھ کر ہنستے مسکراتے کرتے اور بتاتے ہیں اور پھر برسوں بعد دوسروں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان کی ڈکشنری میں وقانام کے لفظ کچھ اور ہی مفہوم و معانی کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں۔

میرا بہت دل چاہتا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے بعد ہی سہی، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کے زوال اور شکست کے اسباب اور اسباق ہمارے فوجی

سلیبس میں ضرور رکھوائے جائیں۔ اندرا گاندھی نے تو اپنے ایک دانشور اور محقق ڈی پی دھر کو وہاں بھجوا کر یہ تحقیق کرائی تھی کہ مسلمانوں کو ۸۰۰ سال کی حکمرانی کے بعد عیسائیوں نے کس طرح مارا اور کس طرح وہاں سے ان کے وجود، نسل اور عقیدے کو ہی ختم کر ڈالا پھر اسی رپورٹ کی روشنی میں اپنے دشمن کو اسی کے گھر میں، اسی کے لوگوں کے ہاتھوں بہتر حکمت عملی کے ساتھ دولت ختم کر دیا۔

ہمارے سلیبس میں ۱۹۷۱ء کی شکست، اس کے اسباب ہی نہیں، ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمران کے وہ آنسو اور اس کی ماں کے وہ الفاظ تو درج ہونے چاہیں جو اس نے غرناطہ سے شکست کھا کر نکلتے ہوئے کہے تھے۔ جبل الطارق پر کھڑے ہو کر ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمران عبداللہ کو روتے دیکھ کر اس کی ماں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا ”جس ملک کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکے اب عورتوں کی طرح اس کے کھوجانے پر آنسو کیوں بہاتے ہو؟“ انسانی تاریخ میں گروہوں، قوموں اور ملکوں کو ہار کا کبھی نہ کبھی سامنا کرنا پڑ جاتا ہے، مگر اکثر یہی واقعہ ان کی زندگی اور عروج کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے، سوئی ہوئی صلاحیتوں اور خوبیوں کو بیدار کرتا ہے، کمیوں، کوتاہیوں کا ادراک کراتا ہے۔ نئی ہمت دلواتا ہے، زخموں پر مرہم لگاتا ہے، نئے اور مضبوط فیصلے کراتا ہے اور پھر ایک دن آتا ہے، تاریخ ہی نہیں بدلتی، جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے۔

ہم پر ہر سال ۱۶ دسمبر آتا اور ایک نئی شرمساری دے جاتا ہے..... ہم نے اس سے بچنے کا کیا راستہ ڈھونڈا کہ تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا، حوالہ دینا ہی بند کر دیا، ہاری ہوئی جنگ کے بہادروں کو نشان حیدر تو دے دیے، مگر ہروانے والے جرنیلوں، واقعات اور اسباب کا تذکرہ ممنوع قرار دے دیا، بہت ہوا تو کبھی امریکا کے بحری بیڑے کو الزام دے دیا، کبھی بھارتی حکمرانوں کو، پھر بھی دل نہ بھرا تو بنگالی رہنماؤں کو برا بھلا کہہ لیا۔ برسوں پر پھیلے شکست کے کرداروں اور چہروں کو جانتے ہوئے بھی انھیں چھپایا۔ تجزیے سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ کیا صرف یحییٰ اور نیازی

ہی اس بد قسمتی کے ذمے دار تھے؟ وہ سارے لوگ جو اسلام آباد میں اس وقت اختیار و اقتدار کے مزے لے رہے تھے اور جو فوراً بعد بھٹو صاحب سے بیعت ہو گئے تھے، یہی لوگ تھے جو آنے والے ہر عہد اور حکمران کے ساتھ چلتے اور بدلتے رہے اور انہی کی باقیات جنرل مشرف کے ہمراہ اور ہم رکاب رہیں اور پھر ہمیں بلوچستان اور وزیرستان میں ایک طویل بے فیض جنگ میں دھکیل کر چلتے بنے۔

ہم اس بات کا کب ادراک کر پائیں گے کہ جب جب فوجی حکمرانی ہوتی ہے، فوجی جرنیل کیا کچھ نہیں ہار جاتے ہیں؟ ہر فوجی حکمران کو ہر بار نئے حواری مل جاتے ہیں جو نئے نئے ناموں سے پرانی پالیسیوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ اگر فوجی دانشوروں اور تعلیم کے ماہرین کا یہ تجربہ مان لیا جائے کہ سیاسی نا انصافیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلیبس کی خرابی بنگال کی دوری اور آزادی کا باعث بنی اور ہمیں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صورت میں اس کی قیمت چکانا پڑی تو یہ کہتے ہوئے دل لرزتا اور پوچھتے ہوئے قلم ڈرتا ہے کہ اب سلیبس کی تبدیلی کسی نئے سانحہ کا باعث تو نہیں بنے گی؟

افسوس اب کے ہندو استاد مہینہ اور کلکتہ سے نہیں آئے، یہیں کہیں سے ایسے روشن خیال دانشور مل گئے ہیں، جنھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے ہی ہلے میں انٹرمیڈیٹ اور گریجوایشن کے کورسز سے اسلام اور پاکستان کو دیس نکالا دے ڈالا ہے اور پھر دوسرے مرحلے میں پہلی سے چوتھی جماعت کے بچوں کو اس تعلیم، روایت اور تعلق سے محروم کرنے کے فیصلے پر عمل کر ڈالا جو اصل بنیاد ہے ہمارے دین اور وطن کی اب کے جو روشن خیال نسل تیار ہو رہی ہے، اس کا حوالہ اور تعارف کیا ہوگا۔ وہ کب اور کیسے کس کے خلاف ہتھیار اٹھائے گی؟ اسے تو ہتھیار ڈالنے کو بھی کسی مضبوط اور بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیا کروں جیسے جیسے سوچتا ہوں دکھ سے بھرتا جاتا ہوں۔

میری جان.....! آج پھر ۱۶ دسمبر ہے بہت سے سرخ آنسو آج پھر آنکھوں میں اترے ہیں

۲۰۰
روپے کی کتب
کے انعامات

بوجھیں توجائیں

مرتب: یقینیت کرمل (ر) مبشر احمد (دوالیال، چکوال)

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ نومبر میں چھپنے والے اسلامی کونز کے درست جوابات

کونز نمبر ۱ (الف) مدائن صالح (ب) ناقۃ اللہ، سورۃ الشمس کونز نمبر ۲ (الف) مسجد ضرار (ب) سورۃ التوبہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

اسامہ بن رمضان (چشمہ کنڈیاں)، حافظ عبداللہ مسعود (بہاولپور)، حافظ عبدالودود (بہاولپور)، پابوس احمد (کوٹلی لوہاراں)
احمد بلال (صوابی)، توصیف احمد (حیدر آباد)، ایاز خلیل (حیدر آباد)، طہ یسین (حیدر آباد)، محمد احمد (کراچی)، احسان اللہ (فورٹ منرو)
سمیہ نوید (راولپنڈی)، مدرہ خلیل (دینہ)، ارشد فاروق (ڈھکی)، محمد بلال (لاہور)، وصیف الرحمن (ہری پور)، ہنیہ صابر (ہری پور)
حافظ محمد فیصل ندیم (اسلام آباد)، محمد شعیب (حیدر آباد)، محمد فاروق عثمان خان (بھکر)، محمد خان (بھکر)، وقاص احمد (لاہور)
سدرہ شکور (جہلم)، کنول سعید (سکرند)، سمیہ صابر (ہری پور)، ڈاکٹر عطیہ سلمان (کراچی)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ مدرہ خلیل بنت محمد خلیل (دینہ) ۲۔ حافظ محمد فیصل ندیم (اسلام آباد) ۳۔ احسان اللہ بلوچ (ڈیرہ غازی خان) ۴۔ حافظ عبداللہ مسعود (بہاولپور)

اسلامی کونز ۱

حضرت امام حسینؑ کے فرزند ارجمند سانچہ کربلا کے وقت سخت بیمار ہونے کے باعث کربلا میں ہوتے ہوئے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ باقی تمام عمر مدینہ منورہ میں گزاری۔ بیشتر وقت عبادت میں گزارا۔ بیشتر وقت عبادت میں گزارتے چنانچہ دو القاب سے نوازے گئے۔

سوال ۱۔ اس شخصیت کا کیا نام تھا؟ سوال ۲۔ کون سے دو القاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

اسلامی کونز ۲

قریش کا نامور سردار احد اور خندق کے غزوات میں قریش کا قائد، فتح مکہ (۱۵ رمضان ۸ ہجری) کے دن مسلمان ہوا۔ رسول کریمؐ نے اس کی اور اس کے خاندان کی بڑی عزت اور دل جوئی فرمائی۔ انھوں نے ایک بادشاہ کے دربار میں اسلام کی گواہی دی جو تاریخی دستاویز بن گئی۔

سوال ۱۔ اس ہستی کا کیا نام تھا؟ سوال ۲۔ کون سے بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے؟

(اشارہ: ان کے فرزند ثانی نے اموی حکومت کی بنیاد رکھی)

انعامات کے لیے تعاون

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ اتر تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اردو ڈائجسٹ

325۔ جی ۱۱۱، جوہر ٹاؤن لاہور

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

ہیڈ آفس: بیرون منصور و ملتان روڈ لاہور